
اگست 2022
www.pklibrary.com
ماہنامہ
حنا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلامیات

انشاء نامہ

افسانے

ناولٹ

سلسلے وار ناول

مکمل ناول



مستقل سلسلے

☆☆☆

سردار طاہر محمود نے نواز پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر دفتر ماہنامہ حنا 205 سرکلر روڈ لاہور سے شائع کیا۔
خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ، ماہنامہ حنا پہلی منزل محمد علی امین میڈیسن مارکیٹ 207 سرکلر روڈ
اردو بازار لاہور فون: 042-37321690, 042-37310797 ای میل ایڈریس،
monthlyhina@hotmail.com, monthlyhina@yahoo.com

کچھ باتیں ہماریاں

قارئین کرام! اگست 2022ء کا شمارہ پیش خدمت ہے۔

ایک شاعر نے خواب دیکھا۔۔۔ آزادی کا خواب۔ برصغیر کے مسلمان کے لیے علیحدہ وطن کا خواب۔ اور اس خواب کو تعبیر چودہ اگست 1947ء کو ملی۔

پاکستان ایک نظریہ کی بنیاد پر وجود میں آیا۔ نظریہ تھا کہ مسلمان اور ہندو دو علیحدہ قومیں ہیں، جن کا مذہب، عقائد، رہن سہن اور ثقافت ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہے۔

مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ خطہ زمین ہونا چاہیے جہاں وہ اپنے عقائد کے مطابق آزادی کے ساتھ زندگی بسر کر سکیں۔ جہاں نفرت اور تعصب کا راج نہ ہو۔ ایک طرف انگریزوں کی غلامی تھی۔ دوسری طرف ہندوؤں کا مسلمانوں سے نفرت اور تعصب۔ مسلمانوں پر نوکری کے دروازے تو بند تھے انہیں کاروبار کرنے کی بھی آزادی نہ تھی۔ یہی حالات تھے جو پاکستان کے قیام کا سبب بنے۔

اس نظریہ کی صداقت کے گواہ آج بھارت کے حالات ہیں۔ بھارت میں مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ ہے۔ ایک مسلمان کو صرف اس شبہ کی بنا پر شہید کر دیا جاتا ہے کہ اس نے گائے کی قربانی کی ہے۔ گجرات میں مسلمانوں کا قتل عام کیا جاتا ہے اور قتل عام کروانے والے کو بھارت کا وزیراعظم منتخب کر لیا جاتا ہے۔

پاکستان پر اللہ کا خصوصی کرم تھا، یہاں ہر طرح کے وسائل کی فراوانی تھی۔ یہاں رہنے والے اور ہجرت کر کے یہاں آنے والے سب ہی ان نعمتوں سے فیض یاب ہوئے، لیکن افسوس کہ جس اتحاد کی بنا پر ہمیں آزادی کا تحفہ ملا تھا ہم اسی اتحاد کو قائم نہ رکھ سکے اور پاکستان دولخت ہو گیا۔

ہمیں آج اسی جذبہ، یقین اور اتحاد کی ضرورت ہے جس کی بنا پر پاکستان وجود میں آیا تھا۔

قارئین کو جشن آزادی مبارک۔ اللہ ہمارے پیارے وطن کو قائم و دائم رکھے۔ آمین

اس شمارے میں: قرۃ العین رائے، نورین معشوق چوہان کے مکمل ناول، نفیسہ سعید، ندا حسنین، عنبرین ابدال اور بشریٰ سیال کے ناولٹ عقیلہ ہاشمی، معصومہ منصور اور تحسین اختر کے افسانے اُم مریم اور سندس جبیں کے افسانوں کے علاوہ ''حنا'' کے بھی مستقل سلسلے شامل ہیں۔

آپ کی آرا کا منتظر

سردار طاہر محمود



حمد باری تعالیٰ

اسی کا حکم جاری ہے زمینوں آسمانوں میں
اور ان کے درمیان جو ہیں مکینوں اور مکانوں میں

ہوا چلتی ہے باغوں میں تو اس کی یاد آتی ہے
ستارے چاند سورج ہیں سبھی اس کے نشانوں میں

اسی کے دم سے طے ہوتی ہے منزل خواب ہستی کی
وہ نام اک حرف نورانی ہے ظلمت کے جہانوں میں

اسی کے پاس اسرار جہاں کا علم ہے سارا
وہی برپا کرے گا حشر آخر کے زمانوں میں

وہ کر سکتا ہے جو چاہے وہ ہر اک شے پہ قادر ہے
وہ سن سکتا ہے رازوں کو جو ہیں دل کے خزانوں میں

بچا لیتا ہے اپنے دوستوں کو خوف باطل سے
بدل دیتا ہے شعلوں کو مہکتے گلستانوں میں

منیر اس حمد سے رتبہ عجب حاصل ہوا تجھ کو
نظیر اس کی ملے شاید پرانی داستانوں میں



نعت رسول مقبول ﷺ

وجود شاہؐ بطحا سے ہی توقیر مدینہ ہے
پگھل جاتا ہے واں ہر دل یہ تاثیر مدینہ ہے

نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا
ہے نازک عرش اعظم سے یہ تقدیر مدینہ ہے

پرانا نام یثرب تھا نجات آزار سے پائی
درود رحمت عالمؐ سے تطہیر مدینہ ہے

بہاریں خلد کی یاں ہیں سمائی ذرے ذرے میں
جناں کا گوشہ گوشہ کیا ہے تفسیر مدینہ ہے

گیا تھا کچھ برس پہلے دیار نور و نکہت میں
ابھی تک قلب کے گوشے میں تنویر مدینہ ہے

خدا تعالیٰ نے عطا کوثر وہؐ مالک باغ جنت کے
یقیناً کوثر و فردوس جاگیر مدینہ ہے

بکھر جا پھول طیبہ میں ہو قرباں اپنے آقا پر
وہیں کی خاک میں مل جا جہاں میر مدینہ ہے

پیارے نبی کی پیاری باتیں

ادارہ

مشروب کا بیان

مشروب پینے سے پہلے بسم اللہ اور پینے کے بعد الحمدللہ پڑھنا چاہیے۔

جن جانوروں کا گوشت نہیں کھایا جاتا، ان کا دودھ پینا بھی حرام ہے۔

ایسا جوس یا نبیذ جس میں نشے کے اثرات پیدا ہو چکے ہوں، پینا حرام ہے۔

مشروب کھڑے ہو کر پینا مکروہ ہے، البتہ بوقت ضرورت کھڑے ہو کر پینا جائز ہے، مثلاً بیٹھنے کی مناسب جگہ نہ ہو یا بارش وغیرہ کی وجہ سے لیکن بیٹھ کر مشروب پینا افضل ہے۔

مشروب کو تین سانسوں میں پینا سنت ہے، سانس لینے کے لئے برتن کو منہ سے ہٹا لینا چاہیے۔

اگر مشروب میں کوئی تنکا وغیرہ نظر آئے تو پھونک مارنا منع ہے، البتہ مشروب بہا کر اسے نکالا جا سکتا ہے، اگر پینے والے کچھ افراد ہوں تو دائیں جانب سے شروع کرنا چاہیے۔

مشروب پلانے والا خود سب سے آخر میں پیئے۔

ہمیشہ دائیں ہاتھ سے مشروب پینا چاہیے کیونکہ بائیں ہاتھ سے شیطان پیتا ہے۔

شراب ہر برائی کی کنجی ہے

حضرت ابو درداءؓ سے روایت ہے، انہوں نے کہا، مجھے میرے خلیل صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نصیحت کرتے ہوئے فرمایا۔

''شراب نہ پینا کیونکہ وہ ہر برائی کی کنجی ہے۔''

خمر (شراب) سے مراد ہر نشہ آور چیز ہے۔

(سنن ابن ماجہ، حدیث 339)

شراب کی حرمت قرآن مجید سے ثابت ہے، قرآن مجید میں اسے حرام اور شیطانی کام فرمایا گیا ہے۔

(المائدہ:90) عقل، اللہ کی ایسی عظیم نعمت ہے جس سے انسان دنیا اور آخرت کی ہر بھلائی کے حصول کے لئے کوشش کر سکتا ہے، جان بوجھ کر اس نعمت سے محروم ہونے کی کوشش کرنا بہت بڑی ناشکری ہے، انسان عقل کے ذریعے سے ہر گناہ اور نقصان دہ چیز اور عمل سے بچتا ہے، نشہ استعمال کرنے کے بعد اسے اپنے بھلے برے کی تمیز نہیں رہتی، اس صورت میں وہ ہر گناہ کا ارتکاب کر سکتا ہے۔

ہر گناہ سے بڑا

حضرت خباب بن ارتؓ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

''شراب سے پرہیز کرو، اس کا گناہ (دوسرے تمام) گناہوں سے اسی طرح بڑھ کر ہے جس طرح اس کا پودا درختوں سے بلند ہے۔''

(انگور کی بیل جس درخت پر چڑھتی ہے، اس سے بلند نظر آتی ہے۔)

جو شخص دنیا میں شراب پیئے وہ آخرت میں

مرتکب جہنم میں جائیں گے اور سخت سزا کے مستحق ہوں گے۔

کس چیز سے بنی ہوئی (نشہ آور) چیز شراب ہوتی ہے؟

حضرت نعمان بن بشیرؓ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

''گندم کی شراب ہوتی ہے، جو کی شراب ہوتی ہے، منقی سے (بنی ہوئی نشہ آور چیز) شراب ہوتی ہے، خشک کھجور سے (بنی ہوئی نشہ آور چیز) شراب ہوتی ہے اور شہد سے (بنی ہوئی نشہ آور چیز) شراب ہوتی ہے۔''

شراب کسی بھی چیز سے بنائی جائے، وہ حرام ہے، شراب کے حرام ہونے کی وجہ اس کا نشہ آور ہونا ہے، اس لئے اگر کھانے کی کسی چیز سے یا کسی چیز کے انجکشن سے یا سونگھنے سے نشہ آتا ہو ان سب چیزوں کا یہ استعمال بھی حرام اور قابل سزا ہوگا، آپریشن وغیرہ کے لئے بے ہوش کرنے کے لئے کلوروفارم سنگھانا نشہ کرانے کے حکم میں نہیں کیونکہ بے ہوشی اور مدہوشی (مست ہونے) میں فرق ہے، تاہم یہ بھی صرف علاج کی غرض سے ضرورت کے موقع پر جائز ہے، بلا ضرورت ہوش وحواس ختم کرنا جائز نہیں۔

شراب میں دس طرح پر لعنت ہے

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

''شراب میں دس طرح پر لعنت کی گئی ہے، خود اس (شراب) کی ذات پر، اس کو نچوڑنے والے (رس نچوڑ کر شراب بنانے والے) پر، اس کے بیچنے والے پر، اس کے خریدنے والے پر، اس کے اٹھانے والے پر، جس کے پاس لے جائی جائے اس پر، اس کی قیمت کھانے والے پر، اس پینے والے پر اور اس کے پلانے والے پر۔''

شراب نوشی، اللہ کی نافرمانی اور کبیرہ گناہ ہے، نیز شراب سی خرابیوں کا باعث ہے، شراب سے کسی بھی انداز سے تعلق قائم ہونا اللہ کی رحمت سے دوری اور اللہ کی لعنت کا باعث ہے، بنانے والے سے مراد وہ شخص ہے جو کسی ملازم کو حکم دیتا ہے کہ شراب بنانے کے لئے انگوروں کو نچوڑ کر رس نکالو، اور نچوڑنے والا وہ ملازم ہے جو اس حکم کی تعمیل کرتا ہے اور ''جس کے لئے نچوڑی گئی'' سے مراد وہ گاہک ہے جس نے شراب بنانے والے سے معاہدہ کیا ہے کہ وہ تیار شدہ شراب خرید لے گا، یا اس سے مراد وہ شخص ہے جسے پیش کرنے کے لئے شراب تیار کی گئی، مثلاً کوئی خاص مہمان، دوست یا عزیز وغیرہ، ''جس کے لئے اٹھائی گئی ہے۔'' سے مراد وہ شخص بھی ہوسکتا ہے جس نے کسی مزدور یا نوکر وغیرہ سے کہا کہ اسے فلاں جگہ لے چلو اور وہ شخص بھی مراد ہوسکتا ہے جسے شراب پیش کی جاتی مقصود ہے، خواہ وہ اسے پینا چاہتا ہو، یا خریدنا چاہتا ہو، یا اسے تحفہ کے طور پر دی جارہی ہو، پہلی حدیث میں ''جس کے پاس اٹھا کر لے جائی گئی۔'' کے بھی یہ سب مفہوم ہو سکتے ہیں، جو دوسری شق میں شامل ہیں، قیمت کھانے والے سے مراد وہ شخص ہے جس کو اس کی تجارت سے مالی فائدہ حاصل ہوتا ہے، گناہ کے کالم میں کسی بھی قسم کا تعاون گناہ میں شریک ہونے کے برابر ہے، خواہ وہ تعاون بظاہر معمولی ہو، جب یہ بات معلوم ہو یا یہ خیال ہو کہ فلاں کام سے فلاں گناہ تکمیل کو پہنچے گا تو اس کو بلا معاوضہ یا معاوضہ لے کر انجام دینے سے پرہیز کرنا چاہیے۔

شراب کی تجارت کا بیان

حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا۔

"جب سود کے بارے میں سورہ بقرہ کے آخر والی آیات نازل ہوئیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (گھر سے) باہر تشریف لے گئے اور شراب کی تجارت کے حرام ہونے کا اعلان فرما دیا۔"

سود کی تمام صورتیں حرام ہیں، تجارت کی بعض صورتیں بھی اس لئے حرام کر دی گئی ہیں، کہ ان کا نتیجہ سود کی صورت میں نکل سکتا ہے، (مثلاً بیعہ عینہ) اسی طرح جب شراب حرام کی گئی تو اس کی تجارت بھی حرام ہو گئی، کیونکہ اس سے شراب نوشی کے راستے کھلتے ہیں، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسی مناسبت سے سود کے لین دین کی حرمت کے ساتھ شراب کی تجارت حرام ہونے کا بھی اعلان فرمایا۔ (تفسیر ابن کثیر، سورہ بقرہ آیت 275) ایک مسئلہ بیان کرنے کی ضرورت ہو تو اس کے ساتھ اس سے ملتے جلتے مسائل بھی بیان کیے جا سکتے ہیں تا کہ سامعین کو دوبارہ یاد دہانی ہو جائے، حرام چیز کی خرید و فروخت بھی حرام ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے، حضرت عمرؓ کو اطلاع ملی کہ حضرت سمرہؓ نے شراب فروخت کی ہے تو انہوں نے فرمایا۔

"اللہ تعالیٰ سمرہ کو تباہ کرے، کیا اسے معلوم نہیں تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔"

"اللہ تعالیٰ یہودیوں پر لعنت نازل فرمائے۔" ان پر چربی حرام کی گئی تو انہوں نے اسے پگھلا کر بیچ دیا۔"

صحاح ستہ میں سمرہ نامی دو صحابہ کی احادیث موجود ہیں، اس حدیث میں مذکورہ صحابی سمرہ بن جندبؓ ہیں، سمرہ بن جنادہؓ نہیں، (فتح الباری: 523/4 بحوالہ بیہقی) حضرت سمرہؓ نے شراب کیوں فروخت کی؟ اس کی مختلف توجیہات ذکر کی گئی ہیں، مثلاً ممکن ہے انہوں نے اسے سر کے کی صورت میں تبدیل کر کے فروخت کیا ہو اور ان کا یہ خیال ہو کہ شراب سے سرکہ بنانا جائز ہے، جبکہ حضرت عمرؓ اس کو جائز نہیں سمجھتے تھے، یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت سمرہؓ کو یہ معلوم ہو کہ شراب حرام ہے، لیکن یہ معلوم نہ ہو کہ اسے بیچنا بھی حرام ہے، یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ انہوں نے شراب حاصل ہی کیوں کی؟ حافظ ابن حجرؒ نے اس کے جواب میں علماء کے اقوال ذکر کیے ہیں کہ ممکن ہے انہیں جزیہ میں ملی ہو، یا غنیمت میں ملی ہو، (فتح الباری حوالہ مذکورہ بالا) عربی زبان میں گوشت سے حاصل ہونے والی چربی کو شحم کہتے ہیں اور پگھلی ہوئی چربی کو ودک کہتے ہیں، لیکن نام بدلنے سے شرعی حکم تبدیل نہیں ہوتا، یہودیوں نے یہ حیلہ کیا تھا کہ ہم پر شحم حرام ہے اور ہم ودک بیچ رہے ہیں جو دوسری چیز ہے، جس چیز کا کوئی جائز استعمال نہ ہو، اسے بیچنا خریدنا حرام ہے، حیلے سے حرام چیز حلال نہیں ہوتی بلکہ جرم زیادہ شدید ہو جاتا ہے۔

ایک پنجابی نظم

ابن انشاء

تینوں دسیا تے توں ہسنا اے
اسیں تینوں کجھ نئیں دسنا اے

بس اگ اپنی وچ جلنا اے
اور آپے پکھا جھلنا اے
اسیں پکے آں تو خام کڑے
کجھ ہویا نئیں کی ہونا سی

اک دن دا ہسنا رونا سی
اوہ ساگر چھلاں ایویں سی

اوہ ساریاں گلاں ایویں سی
پر چرچا کرنا تمام کڑے
اسیں کہندے کہندے مر جانا
توں ہسدے ہسدے مر جانا

اسیں اجڑے اجڑے رہ جانا
توں وسدے وسدے مر جانا

ہاں سوچ لیا انجام کڑے
اک گھر وچ دیوا بلدا ای

کی دیکھ سندیسے گھلدا ای
کیوں پورب پچھم جانی ایں

کیوں من اپنا بھٹکانی ایں
گھر آ جا پے گئی شام کڑے

☆☆☆

اُمید صبح و جمال

اُمِ مریم

بتیسویں قسط کا خلاصہ

آیت معیز کی دوسری شادی کا صدمہ سہار نہیں پائی اور اس کا نروس بریک ڈاؤن ہو جاتا ہے۔ آزر اور ایشال کی کوشش کے باعث معیز سمیت تاؤ کی پوری فیملی ہاسپٹل میں موجود ہے۔ مگر مام کا دل اس کے لئے نرم نہیں پڑتا۔ یہاں تک کہ وہ کومے میں چلی جاتی ہے۔

زیمل کی زندگی میں نئی پریشانی داخل ہو چکی ہے۔ ایک نوجوان اس سے شادی کا متمنی ہے۔ گھر تک چلا آیا ہے۔ زیمل سخت وحشت کا شکار ہو کے معیز کو فون کرتی ہے مگر اس کی بے رغبتی محسوس کر کے اپنی بے یارومددگاری کا احساس گہرا ہو جاتا ہے۔

اب آپ آگے پڑھیے

تیتیسویں قسط





یونہی اجنبی نہ بنا کرو
کبھی مسکرا کے ملا کرو
کبھی سن لو میرا بھی حال دل
کبھی مجھ سے کوئی گلہ کرو

اجنبی نوجوان کی مسکراہٹ میں مہذبانہ اپنائیت تھی۔ نظروں میں اس کے لئے عزت اس کا باوجود زیمل کو یہ سب ناگوار خاطر ہوا اس پہ اس کی یہ سخن طرازی۔

"پلیز......"

وہ ناگواری سے ٹوک گئی مگر ادھر جیسے کوئی اثر ہی نہیں تھا۔

تیری اک نظر تیری اک ادا
میرے دل کو کر دیا لاپتا
میرے دوستو میرے ہمنوا
میرے دل کا کوئی پتا کرو
یہ تارکِ عشق ہے کچھ تو ہو
وفا کرو یا جفا کرو

وہ اندر آتی صائمہ کو دیکھ کر شرارت سے مسکرایا پھر زیمل کے چہرے کی سختی دیکھ کر لہجے میں لجاجت بھر لی تھی۔

کوئی فیصلہ میرے مہرباں
کوئی رسم تم بھی ادا کرو
نہ ہی زیست کا کوئی راستہ
نہ ہی خودکشی کا ہے حوصلہ
مجھے پیار دو یا مجھے مار دو
کوئی کام تم بھی کیا کرو

وہ سینے پہ ہاتھ رکھ کے جھکا۔ جبکہ زیمل کا ضبط جواب دے گیا تھا۔

"یہ کیسی جرات ہے کیا بدتمیزی ہے...... اور...... صائمہ جی...... مجھے...... آپ سے ہرگز یہ توقع نہیں تھی۔"

وہ بولی تو اس کی آواز بھرا گئی تھی۔ جہاں صائمہ خفت زدہ تو نوجوان پریشان نظر آنے لگا۔

"بخدا...... میرا مقصد آپ کی دل آزاری نہیں تھا۔ میں تو صائمہ جی کے تعاون کے باعث آپ کو اپنی سچائی کا یقین دلانا چاہ رہا تھا۔ اگر آپ کو برا لگا تو دل و جان سے معذرت خواہ ہوں۔"

نوجوان ازحد پشیمانی میں مبتلا ہو کر بولا۔ زیمل کے ماتھے پہ بل پڑ گئے تھے۔

"آپ کو شرم آنی چاہئے میرے اس طرح گھر میں میری مرضی کے بغیر گھسنے پہ...... میں بتا چکی تھی کہ میں شادی شدہ ہوں مگر......"

"اس کے علاوہ ہر بات پہ اعتبار کرنے کو تیار ہوں آپ کی......"

وہ مسکرایا۔ پھر اس مسکراہٹ کو گہرا کرتا ہوا اسی اعتماد سے بولا تھا جو اس کی ذات کا خاصہ لگتا تھا۔
''صائمہ جی اگر نہ بھی بتائیں تب بھی آپ کو دیکھ کر کوئی اندھا بھی یقین نہ کرے اس بات کا......''
زیمل نے شاکی نگاہ صائمہ پہ ڈالی جس نے بے نیازی سے کاندھے جھٹک ڈالے تھے۔
''کیا چاہتے ہیں......؟''
وہ غصے میں بولی تو جواباً وہ فدا ہو گیا تھا۔
''آپ سے قبولیت کی سند...... بہت دیر سے آئیں آپ ویسے میرے اصل مقصد کی طرف...... بہر حال شکریہ......''
''شٹ اپ......''
وہ برہم ہو گئی۔ وہ جواباً ذرا جو شرمندہ ہوا ہوا۔ ماتھے پہ ہاتھ رکھ کر شرارت سے جھکا۔
''نوازش......''
زیمل اس ڈھٹائی کے مظاہرے پر جھنجلاہٹ بھری بے بسی کا شکار نظر آتی۔ پھر کچھ مزید کئے بغیر پیر پٹختی پلٹ کر دروازے سے نکل گئی۔ نوجوان نے صائمہ سے کتنی دیر کیا بات کی اسے نہیں خبر۔ البتہ وہ ناراضگی کے مظاہرے کو صائمہ سے بعد میں بھی کئی دن منہ پھلائے رہی تھی۔ جس کی صائمہ نے بھی پرواہ نہ کی۔ تو اسے عجیب سے دکھ نے آن گھیرا تھا۔

✧✧✧

ایک دوری ہے جو برزخ میں لئے پھرتی ہے
ایک مہا دکھ ہے جو سینے میں گڑا بیٹھا ہے
ایک پشیمانی ہے جو آنکھوں میں لہو روتی ہے
اک تڑپ ہے جو روح کو کانٹوں میں پروتی ہے
اک زیاں ہے جو میری جان لئے جاتا ہے

ابھی آدھا گھنٹہ پہلے بارش ہوئی تھی۔ وہ اسپتال کے برآمدے میں آ کر ستون سے ٹیک لگا کر سیاہ آسمان کو تکنے لگا۔ تاریکی کے پردے کی اوٹ سے کمان سا باریک چاند جھانک رہا تھا۔ ابھی کچھ گھنٹے قبل جب اس کے سامنے آسمان پر سرخ و سرمئی بادلوں کے درمیان خالی جگہ سے ڈھلتے سورج کی آخری نارنجی شعاعیں جھانک رہی تھیں۔ درختوں کو بادلوں نے ڈھانپ لیا تھا۔ تب ابا اس کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔
''بچی کی اس حالت کے ذمہ دار تم تو نہیں ہو معیز......؟''
انہوں نے بلاتردد بلا جھجک سوال کر ڈالا تھا۔ معیز کنفیوز اگر نہیں ہوا تو پر اعتماد بھی نہیں رہ سکا تھا۔
''ظاہری بات ہے جو کچھ ہمارے بیچ ہوا اس کا اثر ہے یہ......''
اس نے بہت سنبھل کر بہت نپا تلا جواب دیا تھا۔
''اللہ کرے وہ جلد ٹھیک ہو جائے...... پھر میں تجھے اس کی کسی بھی مرضی کے خلاف جانے کی اجازت نہیں دوں گا۔''
ابا کے فیصلے نے اسے ششدر کر کے رکھ دیا۔ اور وہ لمحہ قبولیت کا تھا۔ شاید کہ کچھ دیر بعد ہی آیت

کے کمرے میں ڈاکٹرز کی ہلچل مچ گئی۔ وہ کومے سے باہر آرہی تھی۔ آزر ایشال کے ساتھ ساتھ اماں اور ابا کے بھی چہروں پر زندگی دوڑ گئی۔

''مبارک ہو بھائی...... معجزہ ہو گیا۔''

ایشال جوش جذبات میں اس کے کاندھے سے آلگی۔ وہ عجیب سے احساسات لئے کھڑا تھا۔ شاید اگر ابا نے یہ بات نہ کہی ہوتی تو یہ خبر اسے بھی پرجوش کر جاتی مگر اب وہ بہت معتدل تھا۔ ایشال کا محض سر تھپکا۔ سب باری باری اس سے پہلے ملے وہ ایک طرف سکون سے کھڑا رہا۔

''جاؤ...... اس سے مل لو...... مگر اب ایسا کچھ نہیں ہونا چاہئے جو میری بیٹی کو تکلیف دے...... میں پھر کہہ رہا ہوں میں ایسا کچھ نہیں چاہتا۔''

ابا خود اس کے پاس آئے تھے اور سرزنش کے انداز میں بولے۔ معیز نے جواباً کچھ نہیں کہا۔ ساری خوشی کافور ہو چکی تھی۔ وہ اندر آیا تو اس کے قدموں میں اضمحلال تھا۔ آیت کے ہونٹ خشک تھے اور آنکھیں بالکل ویران اسے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں نمی چمکنے لگی تھی۔ اس کو تکتی آیت کی پیاسی نظروں میں کیسی حسرت تھی۔

''میں نے خود...... آپ کو کھو دیا...... معیز...... اور یہ دکھ اتنا گہرا ہے کہ...... میں...... جینے کی کوئی خواہش اپنے اندر موجود نہیں پائی......''

کتنی دیر کی خاموشی کے بعد جب معیز نے اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں کی گرفت میں لے کر نرمی سے دبایا تھا تب وہ دلگیر انداز میں بولتی چلی گئی تھی۔

''ایسا مت کہو آیت...... تم نے مجھے کھویا نہیں ہے۔ پورا حاصل کر لیا ہے۔ تمہیں جینا ہے۔ ہمارے بچے کے لئے میرے لئے سب سے بڑھ کر خود اپنے لئے......''

وہ رسان سے کہہ رہا تھا۔ اسے زندگی کی طرف مائل کر رہا تھا۔ آیت نے غمناک نظروں سے اسے دیکھا اور یاس زدہ انداز میں مسکرا دی۔

''کاش...... آپ نے دوسری شادی نہ کی ہوتی......''

وہ ایسے بولی گویا روئی ہو۔ معیز نے ہاتھ بڑھایا اور اس کی آنکھوں سے نمی چن لی۔

''میں نے دوسری شادی نہیں کی۔''

جواب ایسا تھا کہ آیت بھونچکی ہو کر اسے تکنے لگی۔ پھر زخمی انداز میں مسکرا کر سر جھٹکا۔

''کاش یہ سچ ہوتا۔''

''یہ سچ ہے آیت...... میں نے محض تمہیں غصہ دلانے کو تمہیں دکھ دینے کو غلط بیانی کی تھی۔ اب مگر میں شرمندہ ہوں۔ تم ٹھیک ہو جاؤ ہم پھر سے زندگی شروع کریں گے...... ایسی زندگی جس میں کوئی تلخی ہو گی نہ چپقلش......''

اس کے بال سہلاتے ہوئے وہ وعدہ کر رہا تھا۔ ایک زندگی کو بچانے کی سعی میں اگر اتنا سا جھوٹ بول لیا تھا تو اس کے خیال میں بالکل غلط نہیں تھا۔ آیت بغور اس کا چہرہ پڑھ رہی تھی۔

''سچ کہہ رہے ہیں معیز......؟''

وہ غیر یقین تھی۔ بے اعتبار تھی۔

"سو فیصد سچ ہے......"

معیز کی مسکراہٹ سے اس جھوٹ میں جان ڈالی۔ آیت کی نظروں کی غیر یقینی تمام ہوئی تو ان میں زندگی بتدریج لوٹ کر قدم رکھنے لگی تھی گویا۔

"آپ نے میری جان نکالنے میں کسر نہیں چھوڑی۔ آئندہ ایسی بات کبھی مذاق میں بھی نہیں کہیے گا۔ ورنہ سچ مچ مر جاؤں گی۔"

وہ اس کے بازو سے لگ کر سسک پڑی۔ معیز نے اس کے وجود کو اسی بازو کے حصار میں سمٹ گیا جس سے وہ لگی ہوئی تھی۔

"اب تم بھی یہ مرنے کی باتیں ختم کرو اور رونا بند کرو۔ ٹھیک ہے......؟" وہ اسے مسکرا کر دیکھ رہا تھا۔

"ٹھیک ہے۔"

وہ ایک دم کھلکھلانے لگی۔ پھر اس کا ہاتھ تھام کر لبوں سے لگا لیا۔

"معیز......"

وہ اسے ڈوبتی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"آپ سے بہت محبت کرتی ہوں...... بے حد...... مگر اس سے کہیں بڑھ کر آپ کی محبت کی طلبگار ہوں...... اتنی کہ آپ کو میرے سوا کچھ نظر نہ آئے۔" اس کے مطالبات شروع ہونے لگے۔ معیز نے گہرا سانس بھرا۔

"پھر آپ کے بچوں کو کیا ہوگا۔ وہ تو رل جائیں گے اگر والدین ایک دوسرے میں ہی مگن رہے۔"

اندر آتے محسن نے گرہ لگائی تھی۔ معیز ایک دم سنبھلا جبکہ آیت تھوڑی سی پزل ہو گئی تھی۔ پھر اسے گھورنے لگی۔

"تمہیں بھی ابھی لازم آنا تھا۔"

اس نے مصنوعی خفگی سے کہتے منہ بنایا۔ محسن ہنستا چلا گیا۔

"دراصل مجھے بھی اپنے ہونے والے بچوں کی بہت فکر تھی جبھی یہ مداخلت ضروری سمجھی۔"

وہ کان کھجا کر بولا۔ معیز کے چہرے پر مسکراہٹ پھیلی تھی تو آیت خوشگوار حیرت میں گھر کر اسے دیکھنے لگی۔

"یہ تو انہونی نہیں ہو رہی...... اس جھینپو کے منہ سے پہلی بار ایسی بات سن کر بہت اچھا لگ رہا ہے مجھے۔"

وہ معیز کو دیکھ کر کہتی محسن کو چھیڑنے لگی۔ محسن نے کاندھے اچکائے۔ پھر وضاحتی انداز میں بولا تھا۔

"دراصل مجھے ہمیشہ یہی لگا کہ میں اس قسم کا بندہ ہی نہیں ہوں جسے یہ فیلنگز آتی ہیں۔ مگر پھر ایک معجزہ ہو گیا۔ یا شاید...... وہ ہے ہی اتنی حسین...... اس قدر خوب صورت کہ...... اس کے سامنے دل ہار تسلیم نہ کرے ممکن نہیں۔ میں نے آج تک اتنا حسن کبھی دیکھا ہی نہیں...... مبہوت رہ جاتا ہوں محض

اسے سوچ کر...... کوئی اتنا دل نشین کیسے ہو سکتا ہے؟"
وہ پھر کھو سا گیا۔ معیز متحیر رہ گیا تھا اس مدح سرائی پہ جبکہ آیت شرارتی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ ہنس روک رہی تھی۔
"تم تو بالکل ہی گئے کام سے...... لگتا ہے جلدی کچھ کرنا پڑے گا۔"
"بالکل...... بالکل جیتی رہیئے...... کہ بقول شاعر......"

جاں بلب دیکھ کے مجھ کو میرے عیسیٰ نے کہا
لا دوا درد ہے یہ کیا کروں مر جانے دو
گر محبت ہے مجھ سے تو وہ پھرے گا نہ کبھی
غم نہیں ہے مجھے اغیار کو بھڑکانے دو

اس نے گہرا سانس بھرا آیت اب کے چونک گئی۔
"کیا مطلب...... کوئی ظالم سماج والی سچوئشن ہے......؟"
وہ فکر مندی سے پوچھنے لگی محسن نے پھر سرد آہ بھری تھی۔
"ظالم سماج وہ خود ہے۔ جتنی حسین ہے اس سے بڑھ کر غصیلی ہے وہ کیا کہا ہے کسی شاعر نے کہ......

خدا جب حسن دیتا ہے
نزاکت نہیں بلکہ......
غصہ آ ہی جاتا ہے

وہ مسلسل اسی کو ڈسکس کرے جا رہا تھا۔ پھر مزید گویا ہوا مگر میں بھی ہمت ہارنے والوں میں سے نہیں ہوں۔ صاف کہتا ہوں۔

ٹھہرو تیوری کو چڑھاتے ہوئے جاتے ہو کدھر
دل کا صدمہ تو ابھی سر سے اتر جانے دو
اک عالم نظر آئے گا گرفتار تمہیں
اپنے گیسوئے رسا تا بہ کمر جانے دو

وہ اس ہی شوخ و شریر انداز میں اپنی داستانِ غم سنا رہا تھا۔
"انٹرسٹنگ...... کیا نام ہے محترمہ کا......؟"
آیت کی دلچسپی از حد بڑھ گئی تھی۔ محسن نے کاندھے جھٹکے۔
"اللہ جانے...... میرے لئے تو وہ بیلا ہے...... بیلے کی کلیوں جیسی...... نازک چاندی کے ورق کی طرح گوری اور ان چھوٹی گلاب کی پنکھڑیوں سے زیادہ ملائم اور چاندنی کی طرح پر سکون اور مبہوت کر ڈالنے والی......"
وہ پھر شروع ہو چکا تھا اور جب ایسے بات کرتا تو جیسے اس کی ذات میں ایسے گم ہوتا تھا اطراف بھول جاتا تھا۔ آیت متاثر نظر آنے لگی۔ اس نے اک نظر معیز کی جانب دیکھا۔ عجیب حیرت زدہ تھی یہ نگاہ وہ ایسی دیوانگی ایسی شدت کی طلبگار تھی مگر کسی اور میں دیکھ رہی تھی کسی اور کے لئے...... وہ اسی کا

بھائی تھا مگر اس سے یکسر مختلف یہ سوچ اسے مزید اضطراب بخش گئی کہ محسن کی محبت اس درجہ ان کے سامنے اظہار میں ایسی شدید ہے تو اس لڑکی کے لئے کیسی بے اختیار ہو گئی۔

''تم...... مجھے ملوانا اس سے سب سے پہلے...... میں راضی کر لوں گی سب کو محسن...... ڈونٹ وری......''

وہ بے ساختہ بولی تو محسن نے جوش جذب میں بے اختیار نم آنکھوں سے اسے دیکھا۔

''تھینک اے لاٹ بھابی...... مجھے آپ سے ایسی نیوز کی توقع تھی۔ خوش رہیں۔''

وہ مسکراتا ہوا پلٹ کر چلا گیا۔ آیت نے گردن موڑ کر معیز کو دیکھا جو خاموش تھا اور شاید کسی گہری سوچ میں مبتلا تھا۔

''دیکھ رہے تھے اسے...... کتنا خوش ہے......''

''ہوں......''

معیز کا انداز بے خیال تھا۔

''کتنی محبت کرتا ہے...... کیسی خوش بخت ہے وہ لڑکی جسے اتنا چاہنے والا شوہر مل رہا ہے۔''

آیت کے انداز میں حسرت تھی۔ محرومی تھی۔ معیز نے اب بھی دھیان نہیں دیا۔

''اتنا ٹچی تو نہیں ہونا چاہئے محسن کو...... لازم نہیں لڑکی کے گھر والے مان بھی جائیں۔ اپنا ذہن بنا کے رکھے۔ خدانخواستہ انکار ہو گیا تو کیا پاگل ہو جائیگا اس کے لئے...... احمق......''

وہ ناگواری سے کہہ رہا تھا۔ آیت نے بہت ناراضگی سے اسے دیکھا تھا۔

''ایسی بات کیوں کی آپ نے......؟ محسن میں کمی کیا ہے جو انکار ہوگا۔ خوبرو ہے۔ اتنی اچھی جاب ہے اور......''

''یہ سب کچھ تو میرے پاس بھی تھا مگر آپ کو یاد ہو تو آپ پھر بھی خوش نہیں رہ سکیں میرے ساتھ......''

معیز کا انداز ہلکا پھلکا تھا۔ چھیڑتا ہوا مگر آیت کے چہرے پہ تکلیف دہ آثار نمودار ہوتے چلے گئے۔

''کبھی کبھار مجھے لگتا ہے معیز میں کسی پتھر سے سر پھوڑ رہی ہوں......''

وہ ازحد چڑ گئی۔

''پلیز......''

معیز نے اسے ہائپر ہوتے پا کر نرمی سے ٹوکا۔

''تمہیں خود کو ریلیکس رکھنا ہے۔''

معیز نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ آیت نے یکا یک خود کو تھکا ہوا محسوس کیا تھا۔ جبھی نم آنکھیں موند کر گہرے سانس بھرنے لگی۔ معیز ایک بار پھر کسی سوچ میں گم ہو رہا تھا۔

✦✦✦

محبت اس طرح جیسے گلابی تتلیوں کے پر
محبت زندگی کی جبین ناز کا جھومر

محبت آرزو کے سیپ کا انمول سا گوہر
محبت آرزو کی دھوپ میں امید کی چادر
محبت ہے تیرے گیسو
تیری آنکھیں
تیری پلکیں
محبت خامشی تیری
محبت ہے تیری باہیں
محبت ہے تیری دھڑکن
محبت ہے تیری یادیں
محبت خامشی تیری بہ تیری بات جیسی ہے
محبت کانچ کا سودا محبت آگ کا دریا
محبت جون جیسی بھی
محبت برف جیسی بھی
محبت رات کالی بھی
محبت نیلا موسم بھی
محبت کچا آنگن ہے
محبت تتلیوں کا گھر
محبت گھات گہری ہے محبت مات جیسی ہے
مگر پھر بھی محبت ہو ہی جاتی ہے
کسی انجان ہستی سے
کسی کاغذ کی کشتی سے
کسی کھڑکی کے منظر سے
کسی دھندلی سی حسرت سے
کسی جھوٹی تسلی سے
محبت ہو ہی جاتی ہے

اس کے ہاتھ میں سلگتی سگریٹ تھی اور یہ سگریٹ ہرگز عام سگریٹ نہیں تھی۔ ہیروئن بھری سگریٹ تھی۔ دوسرے ہاتھ میں گلاس تھا۔ جس میں بھری شراب اس کی بے خیالی کے باعث بار بار چھلک کر اس کے لباس کو داغدار کر رہی تھی مگر وہ حواسوں سے باہر تھا۔ کہیں اور گم تھا۔

"تم...... سمجھ کیوں نہیں رہے ہو سلمان...... میں ایکسپٹ کر رہی ہوں...... آفاق کے بچے کی ماں بننے والی ہوں......"

گلاس ایک بار پھر چھلکا۔ لباس بھیگ گیا۔ ام الخبائث کی ناگوار مہک نے ماحول کو اور بھی آلودہ کر ڈالا۔ آنکھیں نم جو پہلے تھیں۔ ان میں آنسو چمکنے لگے۔

"میں ہار گیا...... سلمان ہار گیا اور ایسا...... تم نے کیا عمامہ......" وہ بچوں کی طرح سسکنے لگا۔
"سر...... وہ لڑکا شیر خان لڑکی کو لے کر بھاگ گیا......"
ذہن میں پھر سے کوئی کانٹا چبھا۔
وہ کمزور ہو گی تھا۔ اس کی بنیادیں کمزور کرنے والی اس کی قسمت تھی اور قسمت عمامہ تھی۔
"اگر تم نہیں...... تو محبت نہیں...... اور مجھے...... یہ ہاری ہوئی زندگی نہیں چاہئے......"
اس نے ایک سانس میں سارا گلاس خالی کر دیا۔ اب سگریٹ کی باری تھی۔

✦✦✦

کہا اس نے دنیا درد ہ اور تم دعا جیسے
لگا تم سے محبت ہے مجھے اس نے کہا جیسے
طلب کی اس نے جب مجھ سے محبت کی وضاحت تو
بتایا دشت کے ہونٹوں پہ بارش کی دعا جیسے
سنو کیوں دل کی ہستی کی طرف سے شور اٹھتا ہے
بتایا حادثہ احساس کے گھر میں ہوا جیسے
کہا اے گل کبھی خوشبو کا تم نے عکس دیکھا ہے
کہا قوس قزح کے سارے رنگوں کی صدا جیسے
سنو خواہش کی لہروں پر سنبھلنا کیوں ہوا مشکل
بتایا پانیوں پر خواب کی رکھی نیا جیسے
بھلا تم روح کی کرچیوں میں ڈھونڈتے کیا ہو
کیا یہ اتنی روشن ہیں کہ سورج ہو دیا جیسے
سنو آنکھوں ہی آنکھوں کا بیاں کیسا لگا تم کو
کیا پھولوں سے سرگوشی کرتی ہے صبا جیسے

اس نے اپنے لئے چائے کا مگ بنایا اور کمرے میں آ کر اپنے پیچھے دروازہ بند کر دیا۔ صائمہ کا رویہ ہنوز تھا۔ بغیر وجہ کے اس سے ناراض رہتی۔ زیمل کو لگنے لگا تھا اب وہ زیادہ عرصہ اسے برداشت نہیں کر سکے گی۔ یہی فکر کھائے جا رہی تھی۔ ادھر معیز نے بھی کال کرنے سے منع کر دیا۔ اس میں اتنی ہمت تھی نہ جرات کہ دوبارہ اسے ڈسٹرب کرتی۔ سمجھتی تھی اگر آیت کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے تو پھر وہ اس کے لئے ٹائم نہیں نکال سکتا۔ مگر کم از کم اس سے رابطے میں رہ تو سکتا تھا۔

دن میں جانے کتنی بار اس کی آنکھیں بھیگتی اور رات کو تو اکثر نیند آنکھوں سے روٹھ جایا کرتی۔

کال بیل کی آواز پہ وہ کچھ اس طرح بدحواس ہوئی کہ ہاتھ میں موجود مگ سے گرم چائے اس کے اوپر چھلک گئی۔

"آہ......"

وہ بے ساختہ کراہی اور دھک دھک کرتے دل پہ ہاتھ رکھ لیا۔ اس وقت صائمہ نہیں ہو سکتی تھی۔ پھر کون...... اسے لگا کلیجہ منہ کو آ جائے گا۔ سہمی ہوئی وہیں بیٹھی رہی۔ مگر آنے والا مستقل مزاج تھا۔

اسے حوصلہ کر کے باہر آنا پڑا۔ ممکن ہے صائمہ ہی ہو۔ اس نے خود کو ڈھارس دی تھی۔

"کک......کون......؟"

"دروازہ کھولا بھئی......کیا مسئلہ ہے......"

باہر سے معیز کی جھلائی ہوئی آواز سن کر اس کا ڈر خوف جانے کہاں جا چھپا۔ عجلت میں دروازہ کھولا تھا ابھی معیز نے ڈھنگ سے اندر آ کر دروازہ بند بھی نہیں کیا تھا کہ وہ بے ساختہ اس کے بازو سے لگ کر سسکتی چلی گئی۔ معیز ساکن رہ گیا۔ اپنی جگہ سے ہل نہیں سکا۔

"تھینک گارڈ آپ آ گئے......مجھے......بہت ڈر لگ رہا تھا۔"

اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ معیز نے پہلے دروازہ بند کیا پھر چٹخنی چڑھا دی۔ اس کے بعد اسے بازو کے حصار میں مقید کیا تھا۔ وہ خزاں رسیدہ پتے کی مانند کانپ رہی تھی۔

"اینی پرابلم......؟"

وہ بغور اسے تک رہا تھا۔ نظروں میں الجھن بھی تھی تشویش بھی۔ زیمل ایک دم سنبھلی۔ ہاتھ کی پشت سے آنکھیں رگڑیں اور آہستگی سے الگ ہو گئی تھی۔ چہرے پہ اپنی بے اختیاری کے باعث تمتماہٹ سی پھیل چکی تھی۔ ریشمی پلکیں اضطراب کی کیفیت میں لرزتی تھیں۔ یہ منظر اس قدر دلفریب تھا کہ وہ نظریں چاہنے کے باوجود نہیں ہٹا سکا۔

"آپ......اندر چلیں......میں......چائے بناتی ہوں......"

معیز کی نظروں کے ارتکاز نے اس کا رہا سہا اعتماد بھی زائل کر دیا۔ معیز کچھ نہیں بولا۔ وہ پریشان سی کچن میں آئی۔ چائے بنا کر سلیقے سے ٹرے میں سجا کر اندر آئی تو معیز بستر پہ نیم دراز کسی سوچ میں گم لگتا تھا۔ اسے دیکھ کر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"ہاں......اب بتاؤ......کیوں پریشان ہو......؟"

اس کے ہاتھ سے چائے کا کپ لیتے ہوئے وہ بات وہیں سے شروع کر چکا تھا زیمل کی جان پر بن آئی۔

"مم......میں پریشان نہیں ہوں۔"

اس نے کنی کترائی۔ معیز نے اسے فہمائشی نظروں سے نوازا۔

"زیمل......آپ مجھ سے بھاگ نہیں سکتیں۔"

زیمل نے سر جھکا لیا۔ آنکھیں نم ہو رہی تھیں۔ معیز نے اسے ہونٹ کچلتے دیکھا تو اٹھ کر اس کے برابر صوفے پر آ بیٹھا۔

"زیمل......"

"آ آپ......بس مجھے......یہاں سے کہیں اور لے چلیں......میرا دل بہت گھبراتا ہے۔"

وہ نا چاہتے ہوئے بھی کہہ گئی۔ معیز اسے بغور تک رہا تھا۔

"کہاں......؟"

"کہیں بھی......مگر یہاں سے لے جائیں......"

وہ نم آنکھیں مسل رہی تھی۔ گلابی رنگت دیکھ اٹھی تھی

''میں...... تمہیں اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتا زیمل...... آپ جانتی ہیں...... میرے مسائل مزید گھمبیر ہو چکے ہیں۔''

وہ جیسے بے بس ہو کر بولا تھا۔ زیمل اسے دکھ بھری نظروں سے دیکھنے لگی۔

''پھر...... مجھے...... کہیں اور شفٹ کر دیں......''

اس نے ہونٹ کچلے۔

''یہاں کیا مسئلہ ہے......؟ میں صائمہ سے بات کرتا ہوں......''

معیز نے اپنا سیل فون نکالا تو زیمل حواس باختہ ہو کر رہ گئی۔ صائمہ سے کچھ بعید نہ تھا وہ معیز کو اس لڑکے کے متعلق بتا دیتی۔

''نہیں...... پلیز...... صائمہ سے مجھے مسئلہ نہیں کوئی......''

وہ اتنا گھبرائی کہ اس کے ہاتھ سے فون لے لیا۔ معیز بہت دھیان سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''پھر کس سے مسئلہ ہے۔ بتاؤ......؟''

معیز کے انداز میں ہلکی سی سختی نظر اتر آئی۔ زیمل کی انتہا یہیں تک تھی۔ وہ لمحوں میں سرد پڑنے لگی۔

''آیت...... کی طبیعت بہتر ہوئی......؟''

اس نے خود پر بہت جبر کیا موضوع تبدیل کر دیا۔

''ہاں...... ڈسچارج ہو جائیگی آج...... گھر واپس جانے سے قبل میں تمہیں ملنے چلا آیا...... ایسا کرو...... کس چیز کی ضرورت ہے تو آؤ میرے ساتھ چل کے شاپنگ کر لو......''

وہ گھڑی دیکھ رہا تھا۔ یعنی جانے کا پیمانہ طے کر رہا تھا۔ زیمل اسے پیاسی نظروں سے دیکھے گئی۔ اس کے متوجہ ہونے پر نظریں جھکا لیں۔

''کسی چیز کی ضرورت نہیں...... میں نہیں چاہتی آپ کے مسائل بڑھیں۔ پچھلی بار آیت نے آپ کے ساتھ دیکھ لیا تھا تو......''

وہ آہستگی سے کہہ رہی تھی۔ معیز مسکرا دیا۔

''اتنا خیال ہے میرا......؟''

اس کا موڈ بدل گیا۔ زیمل خفیف سی ہو گئی۔ البتہ بولی کچھ نہیں۔ وہ اسے پلکیں جھپکتے دیکھتا رہا۔ یہ منظر بہت حسین تھا۔ نظریں ہٹانے کو دل مانتا ہی نہ تھا۔

''سوری زیمل...... میں آیت کی وجہ سے اتنا اپ سیٹ رہا کہ تمہیں......''

''اٹس اوکے...... مجھے پلیز ایسے کہہ کر شرمندہ نہ کریں۔''

وہ فی الفور ٹوک گئی۔ وہ واقعی اسے شرمسار نہیں دیکھ سکتی ہے۔ وہ بھی اپنے آگے معیز عجیب سے احساسات کے ہمراہ اسے دیکھتا رہ گیا۔ دل نے چاہا تمام مصالحت بھلائے اور اسے سینے سے لگا لے۔ تمام فاصلے مٹا دے۔ مگر اب...... تو بالکل ایسا نہیں کیا جا سکتا تھا۔

''تم...... بہت اچھی ہو زیمل...... کاش...... تم مجھے...... آیت سے پہلے مل گئی ہوتیں تو......''

وہ ایک دم چپ ہو گیا۔ گویا اپنے جذبات کو کنٹرول کیا۔ زیمل کے چہرے پر موجود حرارت بڑھ

گئی۔ اس کی آنکھیں بہت سی نمی سمیٹ لائیں۔ اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ کچھ نہیں بول سکی۔

''اگر...... آپ کو...... برا نہ لگے تو...... میں کہیں جاب کرلوں......؟'' اس کی نرمی محسوس کرتے ہی وہ کہنے کا حوصلہ کر پائی تھی۔ معیز ایک دم سے ٹھٹھک گیا۔

''مگر کیوں......؟''

معاً اپنے ماتھے پر ہاتھ مارا تھا۔

''سوری...... مجھے خیال نہیں رہا۔ تمہیں پیسوں کی ضرورت ہوگی۔ میں بہت دنوں بعد چکر لگا رہا ہوں تمہاری طرف......''

وہ شرمندگی وخفت کا شکار جیب سے والٹ نکال چکا تھا۔ زیمل کا وہ حال کہ اس سے کہیں بڑھ کر خفت وخجالت کا شکار تھی۔

''بخدا ایسی بات نہیں...... مجھے رقم کی نہیں مصروفیت کی ضرورت ہے۔ ایسے وقت نہیں کٹتا...... بس اتنی بات ہے۔''

وہ بے بسی سے اپنا مدعا بیان کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ معیز تھم گیا۔ اسے دھیان سے دیکھنے لگا۔

''مگر...... آپ کو باہر...... کوئی بھی مسئلہ ہوسکتا ہے۔ آپ نے اپنے دشمنوں کو فراموش کیوں کر ڈالا...... جبکہ میں بھی آپ کے ساتھ نہیں ہوتا...... نہیں...... اس کی اجازت نہیں دے سکتا آپ کو...... یہ کچھ پیسے رکھیں...... اس کے لئے جن چیزوں کی ضرورت ہے آپ کو مجھے فہرست بنادیں۔ میں ابھی لاتا ہوں......''

اس کا انداز قطعی تھا دوٹوک تھا۔ زیمل بے بس بیٹھی تھی۔ رقم لینے کو ہاتھ نہیں بڑھایا۔

''مجھے...... ان کی ضرورت نہیں۔''

اس نے ناراضگی سے نہیں کہا تھا اس کے باوجود معیز کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

''پھر کیا چاہئے...... معیز......؟''

وہ اسے شرارت سے دیکھ رہا تھا۔ زیمل کو کہاں توقع تھی اس سے ایسی بات کی پہلے تو حیران ہوئی پھر اس حیرانی پہ سنجیدگی کا غلبہ چھا گیا تھا۔

''نہیں...... مجھے اپنی حد اور اوقات پتا ہے۔ اور میں کبھی بھی اس سے تجاوز نہیں کروں گی۔''

اپنی بات مکمل کر کے وہ رکی نہیں تھی۔ اٹھ کر تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔ معیز ساکن وساکت بیٹھا تھا۔ جو بات اس نے مذاق میں کہی تھی وہ اس کے دل آزاری کا باعث ٹھہری تھی۔ وہ خفت محسوس کر رہا تھا اس وقت اور بے حد کر رہا تھا۔

✦✦✦

یادوں میں تیری یاد تھی
کیا یاد تھی کچھ یاد نہیں
تیری یاد میں سب بھول گئے
کیا بھول گئے کچھ یاد نہیں

بس یاد ہو تم بس یاد ہو تم
کیوں یاد ہو تم کچھ یاد نہیں

کمرا بند تھا اور وہ اوندھا بیڈ پہ گرا نظر آ رہا تھا۔ پچھلے تین دنوں سے یہی صورتحال تھی۔ ملازم دروازہ بجا بجا کر تھک چکے تھے۔ لاک کھول کر اندر جانے کی جرات نہیں تھی۔ ایسے میں والدہ کے فون نے ہلچل مچا دی۔

"سلو فون نہیں اٹھاتا۔ ایسا تو کبھی نہیں ہوا۔ میرا دل گھبرا رہا ہے بہت۔"

ملازم سب واقف تھے ان سے یہ رابطہ اور سوال تو اکثر ہوتے تھے ہاں البتہ اس بار صورت حال واقعی گھمبیر تھی۔ ملازم نے سارا احوال کہہ سنایا۔

"کیا...... تین دن سے اندر بند ہے۔ تم مر گئے تھے کیا...... مجھے بھی نہیں بتایا...... دروازہ توڑا کیوں نہیں......"

وہ اتنی گھبرائیں کہ ملازم سے سختی سے پیش آ گئیں۔ حالانکہ یہ ان کا وطیرہ نہیں تھا۔

"سر ڈانٹتے ہیں بیگم صاحبہ......"

ملازم کے جواب کے آگے بھی جھاڑیں تھیں۔ انہوں نے افراتفری میں دروازہ توڑنے کا حکم دے کر خود بھی آنے کا بتایا اور فون بند کر دیا۔ اگلے آدھے گھنٹے میں وہ خود وہاں موجود تھیں۔ لاک توڑ دیا گیا تھا۔ سلمان حواسوں میں نہیں لگا۔ رنگت ماند اور آنکھوں تلے گہرے حلقے ماں کا کلیجہ منہ کو آ گیا یہ حالت دیکھ کر۔ ملازموں کی مزید شامت آ گئی۔ خود فون کر کے ڈاکٹر کو بلوایا۔

"کیا ہو گیا میرے بچے کو...... بیٹے دیکھو ذرا......"

وہ سلمان کا سر گود میں رکھے سسک رہی تھیں۔ ڈاکٹر نے حوصلہ دیا اور سلمان کے چیک اپ میں مصروف ہو گیا۔ سیدھا ہوا تو چہرے پر تشویش تھی۔ والدہ خوفزدہ نظروں سے اسے دیکھتی تھیں۔

"ذہنی اسٹریس ہے۔ بہت ہیوی مقدار لے چکے ہیں نشے کی...... انہیں ہاسپٹل میں ایڈمٹ کروانا ہو گا۔"

وہ اپنا بیگ بند کر رہا تھا۔ والدہ کے مزید ہاتھ پیر پھول گئے۔

"کون سے اسپتال لے کر جائیں...... تم بتا دو بیٹے......"

وہ رو دینے کو تیار تھیں۔

"جی...... میں ملازم کو سمجھا دیتا ہوں۔"

ڈاکٹر نے ان کی کیفیت سمجھتے ہوئے تسلی دی۔ والدہ سلمان کو دیکھ کر ہول رہی تھیں۔ کیسے بے دم پڑا تھا۔

"یہ ٹھیک ہو جائے گا ڈاکٹر صاحب......؟"

انہوں نے گھبرا کر پوچھا۔

"جی...... کیوں نہیں...... آپ دعا کریں۔"

ڈاکٹر نرمی سے کہہ گیا۔ والدہ اپنی معیت میں اسے ہاسپٹل لے کر آتی۔ ملازم کے ذریعے ساری بات اگلوا چکی تھیں۔

"کاش یہ لڑکی عمامہ تیری زندگی میں نہ آئی ہوتی میرے بچے...... اب پتا نہیں ان بوڑھی آنکھوں کو کیا دیکھنا باقی ہے۔ میرے اللہ...... مجھے میرے بچے کے ہر قسم کے دکھ سے محفوظ فرما لینا۔ اس سے پہلے اٹھا لینا مجھے......"

وہ سسک رہی تھیں۔ دُعائیں مانگ رہی تھیں۔

✧✧✧

رات کٹتی رہی چاند جلتا رہا
آتش ہجر میں کوئی جلتا رہا
گھر کی تنہائیاں دل کو ڈستی رہیں
کوئی بےچین کروٹ بدلتا رہا
آس امید کی شمع روشن رہی
گھر کی دہلیز کو کوئی تکتا رہا
رات بھر چاندنی گنگناتی رہی
رات بھر کوئی تنہا سسکتا رہا
اشک پلکوں پہ آ کر بکھرتے رہے
نام لب پہ تمہارا لرزتا رہا
آج پھر ہو گئی رات یونہی بسر
آج پھر کوئی خود سے الجھتا رہا

شام دھیرے دھیرے اترنے لگی۔ ہاسپٹل کے اطراف دیوہیکل درخت دھند کے پردے میں چھپے خاموش کھڑے تھے۔ محسن اس دلربا کی یاد میں مگن و محو بیٹھا تھا جب اسے معیز اسی سمت آتا دکھائی دیا۔

"شکر آپ تشریف لائے۔ پتا نہیں کہاں رہ جاتے ہیں۔ اتنا مصروف تو دو بیویوں والا شوہر ہی ہو سکتا ہے۔ ایک سے ملنے جائے تو دوسری کو محو انتظار چھوڑ رہے۔"

اسے چٹکلے سوجھ رہے تھے مگر لاشعور طور پر بات اتنی سچی تھی کہ معیز جیسا کونفیڈنٹ بندہ بھی کچھ لمحوں کو بھی کنفیوژ ہو کر رہ گیا۔

"بکو نہیں......"

محسن اس کی کیفیت پہ مزا لے کر ہنسنے لگا۔

"ارے آپ تو ایسے بی ہیو کر رہے ہیں گویا واقعی ایسی بات ہو۔ اپنی ویز بھابھی تیار ہیں۔ ہمارے ساتھ گاؤں جانے کو...... کہہ رہی ہیں ادھر نہیں جائیں گے اپنی امی کے گھر......"

معیز پہلی بات پہ اگر سنجیدہ ہوا تو دوسری نے اسے حیران کر کے رکھ دیا۔

"واقعی......؟"

"جی بالکل...... جبکہ ایشال اور آذر باقاعدہ اصرار بھی کرتے رہے۔"

محسن تفصیل بتا رہا تھا۔

"میں دیکھتا ہوں......"

معیز نے قدم بڑھائے تو محسن نے ایک بار پھر ٹوکا۔

"آپ گئے کہاں تھے......؟ جبکہ آپ کو معلوم بھی تھا بھابی کو ڈسچارج کیا جا رہا ہے۔ کب سے انتظار کر رہے ہیں آپ کا۔"

معیز نے اس بات کا جواب نہیں دیا۔ روم میں آیا تو اماں ساری تیاری کیے بیٹھی تھیں۔

"پت کہاں نکل گیا تھا۔ اتنی کویل (دیر)......؟"

"معذرت اماں......ایک ضروری کام تھا۔ سوچا نپٹاتا چلوں......"

انہیں جواب سے نوازتے اس کی نگاہ آیت کی سمت اٹھی تو اسے بہت گہرائی سے اپنا جائزہ لیتے پا کر گہرا سانس بھر کے رہ گیا۔

"کیا......واقعی......تم......گاؤں میں رہو گی۔ ہمارے ساتھ......؟"

بیڈ کے کنارے ٹکتا ہوا وہ مسکرا کر گویا ہوا تھا۔ آیت نے سرد آہ بھری۔

"اگر آپ کو اپنی شکست کی خبر ہو جائے تو اسے تسلیم کرنے میں ہی بھلائی ہے۔ تاکہ آپ خود کو اگلی جنگ کے لئے نئے سرے سے تیار کر سکیں۔ میں بھی اپنی خامیاں اس لئے قبول کر رہی ہوں معیز......کہ مجھے آنے والے وقتوں میں کسی محاذ پہ ہارنا نہ پڑے۔ تیاری پوری ہو۔"

معیز کو وہ بدلی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ یہ تبدیلی واقعی خوش آئند تھی۔

"میں تمہارے ساتھ ہوں......"

"مجھے آپ کا ہی ساتھ درکار ہے معیز......"

اس کے کاندھے سے سر ٹکا کر آنکھیں موندتے اس نے سکون کی کیفیت کو محسوس کیا۔ اماں محسن سے سامان اٹھوا رہی تھیں۔ معیز نے نرمی سے اس سے فاصلہ بڑھا دیا۔

"اماں ہیں۔"

وہ سرگوشی میں کہتا گویا اسے احساس دلا رہا تھا۔ آیت پھیکے انداز میں مسکراتی پیچھے ہٹ گئی۔

"بچی......اپنی والدہ سے مل کر جاؤ۔ والدین کی ناراضی عارضی ہوتی ہے۔ تم چل کر جاؤ گی تو انہیں اچھا لگے گا۔"

اماں نے اپنی عمر کے مطابق اچھی نصیحت کی تھی۔ آیت کے چہرے پر عجیب سا اضمحلال چھا گیا۔ اس نے بے بسی کے عالم میں معیز کو دیکھا۔

"مام......یہ سب ایکسپٹ نہیں کریں گی کہ میں پھر آپ کے ساتھ جا رہی ہوں ان کی ناراضگی کی اصل وجہ ہی ہمیشہ یہ رہی ہے کہ میرا انتخاب معیز تھا۔" اس نے اپنے طور پر اماں کو سمجھانے کی کوشش کی۔

"تم ٹھیک کہتی ہو بیٹی......مگر وہ ماں ہے تمہاری......"

اماں نرمی سے اسے قائل کر رہی تھیں۔ آیت نے سر اثبات میں ہلا دیا۔

"ٹھیک ہے۔ میں مل لیتی ہوں ان سے......"

وہ کچھ لاچاری سے بولی۔ معیز کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔

”آپ میرے ساتھ نہیں چلیں گے......؟“

وہ معیز سے سوال کر رہی تھی۔ معیز نے ہونٹ بھینچ لئے۔

”میں آپ کو لے چلوں گا بھابی......“

محسن نے بہت سبھاؤ سے صورتحال سنبھالی۔ آیت نے گہرا سانس بھرا۔

”شکریہ محسن......“

اس کی آواز بھراہٹ کا شکار ہو چکی تھی۔

”اٹس او کے......آپ کوئی بوجھ دل پہ نہ لیں پلیز......“

وہ ہلکے پھلکے انداز میں بولا۔ آیت مگر رنجیدہ نظر آنے لگی تھی۔ اس کی یہی رنجیدگی محسوس کرتا اسے دور کرنے کی سعی میں مصروف ہوا تھا۔

”بلکہ اگر آپ سمجھیں تو میں آپ کے نہیں اپنے کام سے لے رہا ہوں آپ کو......“ وہ موڈ بدل کر کھلکھلایا۔

”واپسی پہ میں آپ کو بیلا سے ملواؤں گا۔ ہو سکتا ہے میری فیملی کی خاتون کو سامنے پا کر وہ محترمہ میری بھی تھوڑی سی عزت کرنے کو تیار ہو جائیں۔“

وہ اب بھی ہنس رہا تھا۔ آیت بوجھل دل سے مسکرائی۔

”تم تو اتنے اچھے ہو محسن......پھر کیسے ممکن ہے وہ تم سے بے رغبتی برت رہی ہے۔“

اس کے انداز میں تھوڑی سی حیرت تھی۔ محسن واقعی شرمندہ ہو گیا۔

”مشرقی لڑکی ہے نا......دیکھئے گا شادی کے بعد کیسے آپ کے بھائی کے آگے پیچھے پھرا کرے گی۔“

وہ کالر کھڑے کر کے ہنسا۔ آیت بھی مسکرا دی تھی۔

”اللہ کرے وہ تمہیں مل جائے۔ اور ہمیشہ تمہارے سنگ خوش رہے۔“

”آمین، ثم آمین۔“

محسن تو فدا ہی ہو گیا تھا گویا۔ معیز اس کی حرکتوں پہ بس مسکرائے گیا تھا۔

✧✧✧

ہم ناراض ہیں تم سے
بہت ناراض ہیں تم سے
بہت معروف ہو نا تم
ہمیں تو یاد کرنے کا تمہیں ٹائم نہیں ملتا
نہ تم کو یاد آتے ہیں
پر اب تو معاف کرنا تم
ہمیں نہ یاد کرنا تم
تمہیں نہ یاد آئیں گے
نہ تم کو اب ستائیں گے

جب جب تم بلاؤ گے
یا ہم سے ملنے آؤ گے
تو ہم تم کو بتائیں گے
بہت معروف ہیں ہم بھی
ہمیں بھی کام ہیں کتنے
ہمیں نہ ہی بلاؤ تم
نہ ہم کو یاد آؤ تم
کہ ہم ناراض ہیں تم سے
بہت ناراض ہیں تم سے

مسلسل گریہ کے باعث اس کی آنکھیں ورم آلود تھیں۔ سرخ ہو رہی تھیں۔ صائمہ نے مزید اس کے ساتھ تعاون کرنے سے معذرت کر لی تھی۔ صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا اپنا دوسرا ٹھکانہ ڈھونڈ لے۔ معیز کے ساتھ بات کرنے کا فائدہ کوئی نہیں تھا۔ وہ معاملے کو سلجھانے کی کوشش کرتا اور ظاہر ہے معاملہ سلجھایا صائمہ کے ساتھ ہی جاتا اور وہ اتنی بے لحاظ ہو رہی تھی کہ کوئی پردہ نہ رکھتی۔ اس نے صاف کہا تھا کہ اگر اس پر کوئی بات آئی تو وہ اس نوجوان کی آمد کا الزام اس پر رکھ دے گی۔ معیز کو اس سے بدگمان کرنا اس کے دائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ اگر اس نے معیز سے کہا تھا کہ اس کا ٹھکانہ بدل دے تو معیز نے اس بات کو سنجیدگی سے لیا ہی نہیں تھا یا شاید وہ اپنے مسائل میں ہی اسے گھرا ہوا تھا کہ اس کے مسائل کی گھمبیرتا کا احساس ہی نہیں ہو رہا تھا۔ کچھ سوچ کہ اس نے اخبار سے ضرورت کے حساب سے جاب تلاش کی اور ایک دو جگہ کے ایڈریس نوٹ کر لئے۔ معیز کو بعد میں کیسے قائل کرنا تھا۔ یہ بعد کا معاملہ تھا۔ جاب مل جاتی وہ کسی بھی ہاسٹل میں اپنی رہائش کا بندوبست کر سکتی تھی۔ اگر مسائل اس کے اکیلے تھے تو پھر ان کے لئے جدوجہد بھی اسے اکیلے ہی کرنی تھی۔ معیز جب بھی چاہا تم کو اسے کچھ رقم دے کر اپنے فرائض نبھا جاتا تھا۔ کیا اس کے فرائض صرف یہی تھے......؟''

ایسا نہیں تھا۔ وہ اگر خوددار تھی۔ اپنے منہ سے نہیں کہہ سکتی تھی تو کیا معیز کو خود بھی خیال نہیں کرنا چاہتے تھے۔ جبکہ وہ جانتا بھی تھا کہ اس کا سب سے بڑا مسئلہ تحفظ ہے۔ نکاح کے بعد وہ اسے کسی بوجھ کی طرح یہاں وہاں ڈال کر اپنے معاملات سلجھانے میں ہی لگا ہوا تھا۔ تو پھر اگر وہ بوجھ تھی تو اس بوجھ کو مزید اس پہ نہیں لادے رکھ سکتی تھی۔

صائمہ کے جانے کے بعد اس نے خود اپنی تیاری کی۔ عبایا میں خود کو اچھی طرح کور کر کے وہ گھر کو تالا لگاتی باہر نکل آئی اور اس کے پرس میں وہی تھوڑی سی رقم بچی تھی جو معیز اسے دے کر گیا تھا۔ جتنے دن بعد وہ آیا تھا۔ صائمہ کی طرف سے اس کے بہت واجبات جمع ہو گئے تھے۔ جنہیں ادا کرنے کے بعد اب اسے یہ فکر کھائے جا رہی تھی باقی کا گزارا کیسے کرنا ہے۔ اس کا ایک ہی حل تھا اور وہ کوئی بھی ملازمت تھی اس نے سوچ لیا تھا۔ چاہے کتنی معمولی نوعیت کی ہی کیوں نہ ہو مگر اسے نوکری کرنی ہے۔

زندگی نظر سے گھر سے باہر کیا ہے۔ خاص کرم کے بغیر کیا ہے اسے چند گھنٹوں میں بہت اچھی

طرح اندازہ ہو گیا۔ اس پہ منہ پھاڑے نگلنے کو تیار کھڑی مہنگائی۔ صرف رکشے کے کرایوں میں ہی وہ ساری رقم صرف ہو گئی تھی جو اس کے پاس تھی۔ اب وہ احمقوں کی طرح خالی پرس لئے کھڑی تھی کیا کرے۔ گھر تک واپس بھی کیسے جائے۔

اسے اندازہ ہی نہیں تھا گھر سے باہر قدم رکھنا اس کے مسائل کو مزید بڑھا دے گا اور جو ہاتھ میں وہ ہے بھی جاتا رہے گا شاید ایسی حماقت نہیں کرتی۔ معیز سے لاکھ ناراضی سہی مگر وہ اس طرح اسے بے آسرا بھی نہیں چھوڑتا۔ جاب کیا خاک ملنی تھی۔ وہ تو پہلے سے بھی زیادہ بے یار و مددگار ہو گئی تھی۔ سورج ہر پل ڈوبتا جا رہا تھا۔ سڑک کے کنارے درختوں کے پار اوپر تیرتے آسمان پہ بادلوں کے پیچھے نارنجی شعاعیں جھانک رہی تھیں۔ جو کسی بھی پل اپنا وجود کھو دیتیں۔ اس پہ ستم تیروں کی طرح وجود میں اترتی نظریں۔

اسے لگا یہ لوگوں کا اژدھام اسے کچا نگل جائے گا۔ دل اتنا گھبرایا کہ ساری انا پس پشت ڈال کر معیز کا نمبر ملا لیا۔ بارہا مرتبہ کی لڑائی کے بعد بھی وہ فون اٹھا نہیں رہا تھا مگر وہ بھی ڈھیٹ بن گئی۔ اس وقت مجبوری تھی۔

"کیا بات ہے......؟ کتنی بار کہا ہے بے وقت پریشان نہ کیا کرو......"

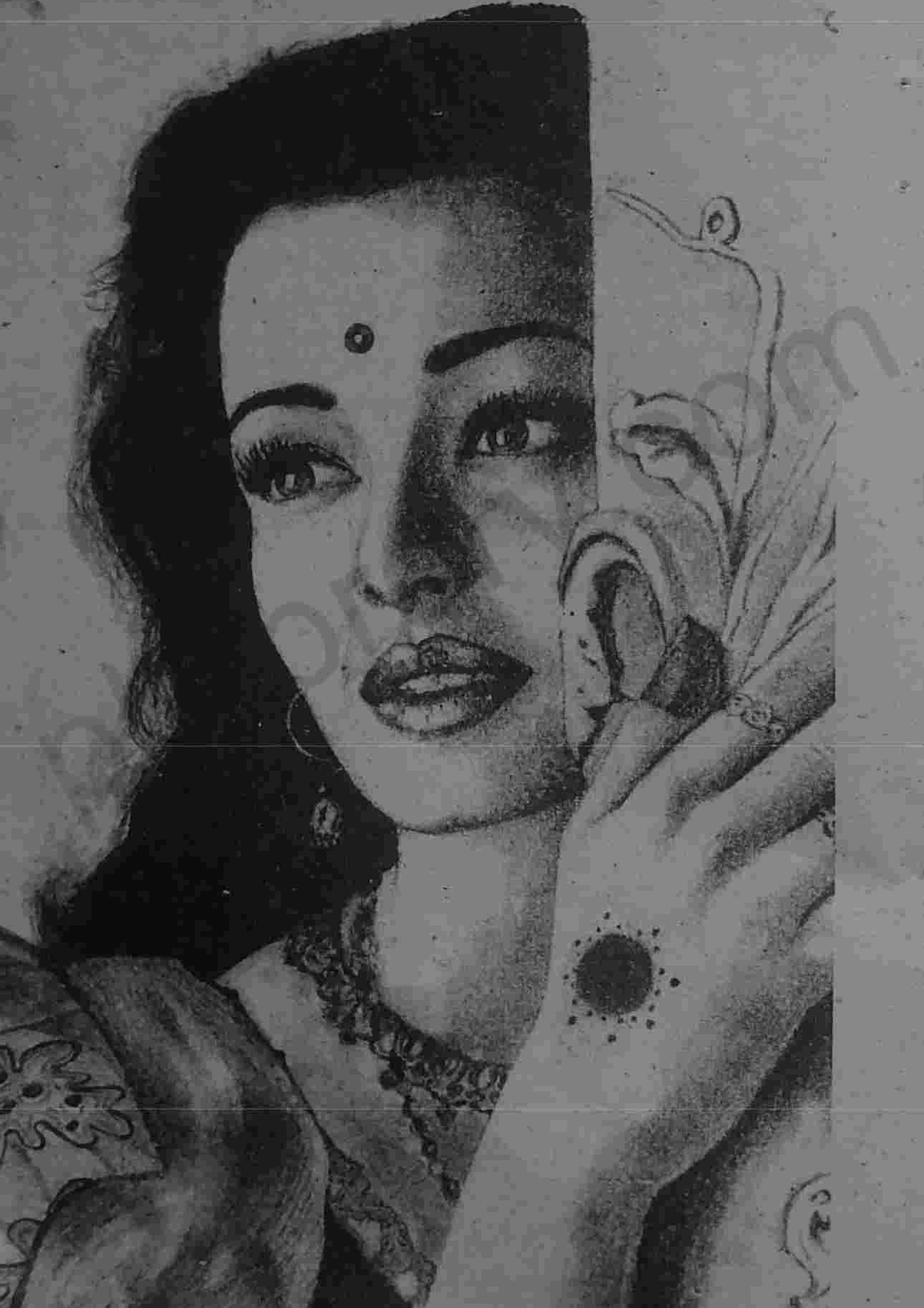
کال ریسیو ہو گئی مگر اب کے چودہ طبق بھی روشن ہو گئے۔ معیز بغیر کس لحاظ کے اسے بے دریغ جھاڑ کے رکھ گیا تھا۔ صرف یہی نہیں کال بھی اگلے لمحے ڈسکنگ کر دی۔ زیمل کو لگا اس کی آنکھوں میں اندھیرے اتر آئے ہیں۔ لڑکھڑا کر وہ دو قدم پیچھے ہٹی تو احساس نہیں ہو سکا اس کا پاؤں فٹ پاتھ سے نیچے اتر گیا ہے۔ توازن بگڑا تو جس ذہنی کیفیت سے وہ دوچار تھی ممکن ہی نہ تھا خود کو سنبھال پاتی، اگلے لمحے اس سے قبل کہ زمین بوس ہوتی پوری اسپیڈ سے آنے والی گاڑی کے بونٹ سے ٹکرا گئی تھی۔ ایک لمحہ نہیں لگا تھا اسے حواس کھونے میں۔ اس کا سیل فون اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گاڑی کے ٹائر کے نیچے آیا پرزوں میں تبدیل ہو گیا تھا۔ توجہ کی طالب کے گرد لوگوں کا جمگھٹا لگ گیا مگر وہ ایسی توجہ نہیں چاہتی تھی۔ شاید جبھی ہوش سے بیگانہ ہو گئی تھی۔

جاری ہے

✧✧✧

دشمنی

عقیلہ ہاشمی



پہلی بار ابا سے کسی نے پوچھا تھا۔ ''اس کا نام دھنی کیوں رکھا؟'' نام تو ایسا ہونا چاہئے جو انسان کے آس پاس کے ماحول سے ملتا جلتا ہو غریب کی جھونپڑی میں پیدا ہونے والے بچے کا نام بادشاہ رکھ دیا جائے تو نام رکھنے سے وہ بادشاہ نہیں ہو جاتا ہاں دوسروں کیلئے اس کا نام مذاق ضرور بن جاتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ تو ایسا کچھ نہ تھا۔ اس کے اردگرد اس کی طرح کے لوگ بستے تھے۔ سیدھے سادھے دھوکے اور ریا سے عاری چہرے جنہیں بس نام رکھنے سے غرض تھی ان کے مطلب میں کیا رکھا ہے اس سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔ اُس کے آگے پیچھے کئی شہزادیاں کئی شہزادے پھرتے تھے۔ اُس نے کبھی اپنے نام کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔

وہ سوچ بھی کیسے سکتی تھی تو دس سال کی بچی کو کیا غرض اُسے کس نام سے پکارا جاتا ہے۔ وہ سہیلیوں کے ساتھ گھر کی کچی منڈیروں پر بیٹھی گڑیوں سے کھیل کھیلتی۔ پوہ ماگ کی نشیلی دھوپ دنیا کی فکروں سے آزاد محلے کی بچیوں کو گڈے گڑیوں کے کھیل کھیلتے پا کر چپکے سے ان کے ساتھ کھیلنے چلی آتی۔ کیسی بے فکری کی عمر ہوتی ہے جب کسی چیز کی پرواہ نہیں ہوتی بس خواب نگر ہوتے ہیں اور جوانی کی اڑانیں ہوتی ہیں۔ وہ بھی عمر کے اس حصے میں تھی۔ گھر کے آنگن میں کھیلتی غربت کہاں نظر آئی تھی۔ چھوٹا سا کچا صحن پیچھے چھوٹا سا کچا کمرہ جس کی چھت کو جابجا لکڑیوں کا سہارا دے کر کھڑا کیا گیا تھا۔

یہ متحدہ ہندوستان کے زمانے کا نور پور گاؤں کے مسلمان کے گھر کا منظر تھا۔ نور پور اچھا خاصا بڑا قصبہ تھا۔ زیادہ تر لوگوں کا پیشہ زراعت تھا۔ زیادہ آبادی ہندوؤں کی تھی مسلمانوں کے صرف چند گھر تھے۔ ہندوؤں کے بڑے بڑے چوبارے چھوٹی لال اینٹ سے بنے پکے مکان دیکھنے کے لائق تھے۔ پکی گلیاں پکے مکان گھروں میں اُس دور میں بھی ہر سہولت موجود تھی۔ نور پور ہندوؤں بنیوں کا قصبہ تھا۔ اردگرد کے کئی دیہات ضرورت کی چیزیں خریدنے یہاں آتے تھے۔ ہندوؤں کے اتنے بڑے قصبے میں مسلمانوں کے صرف تین گھر تھے۔ وہ بھی قصبے سے باہر ایک گلی میں تینوں کچے مکان ان کی غربت کی منہ بولتی تصویر تھے۔ سارا قصبہ ہندو بنیوں کا تھا۔ قرض پر پیسے دینا ان کا کاروبار تھا۔ اس کی وصولی پر سود لیتے قرض لینے والا سود در سود کے جال میں پھنس کر غربت کی چکی میں پستا چلا جاتا اور لالہ رقم دے کر امیر سے امیر تر ہوتا چلا جاتا۔

کے کا کوئی مستقل ذریعہ آمدن نہ تھا کسی بھی فصل کی بہار میں کسی کے بھی کھیت پر کام کر کے وقتی طور پر کچھ کھانے پینے کا سامان بنا لیتا۔ گھر بچوں سے بھرا پڑا تھا۔ نو بچے دو میاں بیوی ڈال کر ماشاء اللہ گیارہ لوگ کھانے والے تھے۔ دھنی سب سے بڑی تھی پیچھے لائن لگی تھی۔

''جس وقت کانگریسی اور مسلم لیگی رہنما سر جوڑے مشکلوں میں گرے ہندوستان کے حق میں اپنی آواز بلند کر رہے تھے یہ دونوں میاں بیوی سر جوڑ بھوک سے بلکتے بچوں کا پیٹ پالنے کی فکر میں لگے ہوتے انہیں کچھ خبر نہ تھی دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ کوئی خبر کا ذریعہ نہ تھا نہ اخبار نہ ٹی وی نہ ریڈیو غربت اور جہالت نے صرف روٹی کے چکر میں پھنسا رکھا تھا۔ چھیدو (کے کی بیوی) اس روز بھی اس سے یہی رونا رو رہی تھی گھر میں کھانے کو نہیں اٹھو اور جا کر کہیں سے کوئی اناج کا بندوبست کرو۔ کما سردیوں کی دھوپ میں لیٹا ست اور کاہل ہو رہا تھا۔ دھوپ نے ٹھنڈے

جسم کو سکون پہنچایا تو سستی اب تیا تیا کر نیند کی گود میں لے جانے کی مکمل تیاری کر چکی تھی۔ تبھی گلی میں بابا لال شاہ سفید براق لباس پہنے اپنے نورانی چہرے کے ساتھ نمودار ہوئے۔ گھر کی دیواریں چھوٹی تھیں آتے جاتے لوگوں کی نظر پڑتی تھی سامنے کی دیوار نہ تھی۔ دروازے نام کی چیز نہ تھی۔ گھر والے دور سے آنے والوں کو پہچان لیتے۔ چھیدو نے کمے کو جگادیا بابا لال شاہ آرہے ہیں وہ فوراً چارپائی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ بابا جی کے استقبال کیلئے گلی میں دوڑا۔

بابا لال جب جموں جاتے واپسی پر نور پور سے گزرتے ہوئے کمے کے گھر ضرور ٹھہرتے۔ کما بابا جی کا مرید تھا۔ غریب ضرور تھا لیکن بابا جی کی عزت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتا۔ گاؤں کے ہندو بھی بابا جی کی عزت کرتے تھے۔ وہ چاہتے بابا جی ان کے گھر کو بھی شرف قبولیت بخشیں لیکن بابا جی سہولت سے منع کر دیتے۔ وہ کسی غیر مسلم کے گھر نہ ٹھہرتے تھے۔ کما جیسا بھی تھا ان کا ہم مذہب تھا۔ بابا جی جتنے دن ٹھہرتے سارے گاؤں سے لوگ بھر بھر کر اناج، چاول، دودھ، دالیں سبزیاں کمے کے گھر دے کر جاتے۔ بابا جی کے دم سے کمے کے گھر پر بہار اُتر آتی سال میں بابا جی ایک بار چکر لگاتے تو سارے سال کا اناج اکٹھا ہو جاتا۔ بچے سارا سال بابا جی کے آنے کے انتظار کرتے۔ بابا جی کے آنے سے جہاں کما اور چھیدو کھانے پینے کی فکر سے آزاد ہو جاتے وہیں دل میں ایک فکر ستاتی رہتی کہیں بابا جی کی عزت میں کوئی کسر نہ رہ جائے۔ بابا جی ویسے تو سارے گاؤں کے مہمان تھے۔ سارا دن بازار میں کرسی لگا کر سب لوگ بابا جی کی نیکی اور سچائی کی باتیں سنتے۔ بابا جی کھاتے صرف کمے کے گھر کا کھانا تھے اور سوتے بھی وہیں تھے۔ اس بار دھنی کے معصوم چہرے کو دیکھ کر انہوں نے پہلی بار کمے سے سوال کیا تھا۔

"اس بچی کا نام دھنی کس نے رکھا تھا۔ دھنی کا مطلب ہوتا ہے دھن دولت والی۔" کمے کو تو شاید یاد بھی نہ تھا اُسے کب دھنی کو بولنا شروع کر دیا گیا تھا۔ جب مختلف مذہبوں کے لوگ اکٹھے رہتے ہیں تو مشترکہ روایات جنم لیتی ہیں۔ مسلمان دھنی، لکشمی اور مایا نام رکھ لیتے ہیں اور ہندو گھرانوں میں رحمت اور کبیر نام رکھنے پر کوئی حیرت نہیں ہوتی۔ ایسے مشترکہ دور میں دھنی نام رکھنا حیرت کا باعث نہ تھا۔ ایک دوسرے کے تہوار مناتے محرم، عید، شب رات، دیوالی، ہولی بنا کسی مذہب کی تقسیم کے گھر گھر منائے جاتے۔

ایسے ہی مشترکہ دور میں چھیدو کو لالہ رام گوپال جی کی بیٹی دھنی کا نام من کو بہت بھاتا تھا۔ وہ جب بھی کسی کام سے ان کی حویلی جاتی وہاں نوکروں کی فوج کے درمیان نازک اندام سی دھنی دھن دولت میں کھیلتی ادائے بے نیازی سے چھیدو خالہ کو بلاتی دھنی اسے بہت اچھی لگتی۔ اس نے دل میں سوچا اللہ اُسے بیٹی دے تو وہ بھی اس کے نام پر اس کا نام دھنی رکھے گی۔ جب بیٹی پیدا ہوئی اس نے اسے دھنی دھنی کہنا شروع کر دیا یوں اس کا نام دھنی پڑ گیا۔

بابا جی کی نظریں اس کے چہرے پر گڑیں تھیں۔

"اس کی زندگی میں دھن دولت آئے گا لیکن ہوا کے جھونکے کی طرح گزر جائے گا۔ اس کے ماتھے پر مصیبتوں اور پریشانیوں کا ایک جال بُنا ہے۔ اس کا صدقہ دیتے رہا کرو۔"

بابا جی کی باتیں سن کر دونوں میاں بیوی سوچ میں پڑ گئے۔ گھر میں کھانے کو نہ تھا۔ صدقہ بھلا کہاں سے دیتے غریب۔

بابا جی کچھ دن رہ کر چلے گئے آہستہ آہستہ سب کے ذہنوں سے سب کچھ مٹ گیا۔ وقت تھوڑا آگے سرکا دھنی اب پندرہ سولہ سال کی جوان لڑکی ہوگئی تھی۔ جس کے خوابوں میں اب اس کے خوابوں کا شہزادہ سرِ شام آنے لگا تھا۔ دن چڑھے وہ لمبی تان کر سوئی رہتی۔ خوابوں کی خوشگوار تھپکیاں اُسے اُٹھنے نہ دیتیں۔ اس بار نئی فصل پر اماں کی دور کی بہن خالہ بشیراں کی بیٹی کی شادی پر سوار گھر ہوشیار پور جانے کے لئے تیار ہوگیا۔ خالہ بشیراں کا گھر دیکھنے کا سب کو بڑا شوق تھا۔ اماں بتاتی خالہ کا گھر بہت بڑا اور سوہنا ہے۔ یہ بڑے بڑے کمرے بڑے بڑے برآمدے بڑی بڑی کھڑکیاں ان کے آگے مخمل کے پردے ہیں گھر میں۔ نلکا بھی لگا ہے گھر میں اُسے چلاؤ تو ٹھنڈا پانی آجاتا ہے جس کمرے میں کھانا پکاتے ہیں وہ بھی ہمارے اس کمرے سے بڑا ہے۔ نوکروں کی فوج بھرتی ہے اس کے گھر میں۔“

ململا کی بیٹی کی شادی کی باتیں اماں سناتی تو دھنی سمیت سب بچے منہ میں انگلیاں لے کر رہ جاتے۔ پورے آٹھ دن تک سارے گاؤں کو حلوہ پوری کا ناشتہ ملتا رہا تھا۔ جلیبیاں، مٹھیاں، پوڑے، چاول، گوشت، پیڑے اور پتہ نہیں کیا کیا اماں بے چاری کو تو ان چیزوں کے نام بھی یاد نہ تھے جو جو پکوان وہاں کھاتے تھے۔ وہ باتیں سناتی اور سارے بچے ان چیزوں کا ذائقہ اپنی زبانوں پر محسوس کرتے۔ پچھلی بار تو سب چھوٹے تھے کسی کو ٹھیک سے شادی کے پکوان یاد نہ تھے اس بار چھوٹے نذیر تک سب تیار تھے جانے کو۔ اللہ اللہ کر کے وہ دن بھی آگیا۔ خالہ بشیراں کا گھر دیکھ کر کے سمیت سب کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں تھیں۔ حویلی تھی کہ پورا محل تھا۔ جس چیز کا حکم دو نوکرانیاں جھٹ سے حاضر کر دیتی۔ ٹھنڈے پانی کے حمام پڑے تھے۔ وہ سب تو ٹھنڈا پانی پی پی کر سیر ہوتے رہتے۔ پورے پندرہ دن وہ لوگ نرم مخملیں بستروں پر سوئے اچھا کھایا پایا گھر کے باڑے سے تازہ بھینسوں کے دودھ پی پی، حلوہ، زردہ پلاؤ، اپنے باغوں کے آم کھا کھا کے بچوں کو پھنسیاں نکل آئیں۔ سب کی صحتیں پھول کر کپے ہوگئے۔ رنگ گورے اور توندیں نکل آئیں۔ پندرہ دن رہ کر بھی کسی کا دل واپس آنے کو نہیں کر رہا تھا۔ خالہ بشیراں کا بیٹا فیروز دین جب اپنی گاڑی پر انہیں نور پور چھوڑنے آیا تو سارا گاؤں اس کی گاڑی دیکھنے آیا تھا۔

فیروز دین بشیراں کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس ساری جائیداد کا اکلوتا وارث خالص خوراک کھا کھا کر گھبرو جوان نکلا تھا۔ جب مسکرا کر نیچی نظروں سے دھنی کی طرف دیکھتا اُسے لگتا اس کے خوابوں کا شہزادہ فیروز دین کے روپ میں خوابوں سے نکل کر سامنے آن کھڑا ہوگیا ہو۔ بشیراں کو بھی دھنی پسند آئی تھی۔ شادی ختم ہوتے اُس نے شگون کی ٹھوٹھی دھنی کی جھولی میں ڈال دی۔ چھیدو اور کے کو یقین نہیں آرہا تھا ان کی دھنی کی قسمت کیسے کھل گئی۔ خود دھنی سر پر گلابی آنچل اوڑھے حیرت کا بت بنی تھی۔ جو کوئی سنتا دھنی کی قسمت پر رشک کئے بغیر نہ رہتا۔ کون جانتا تھا غربت کے اندھیروں میں پل کر جوان ہونے والی پر قسمت یوں مہربان ہوجائے گی۔ ساری برادری کی جوان لڑکیاں فیروز دین کی آرزومند تھیں۔ قسمت کھلی تو دھنی کی کھل گئی۔ اب لوگ کے اور چھیدو سے کہتے تھے اب تمہاری بیٹی پر دھنی نام سجتا ہے اتنے بڑے زمیندار گھرانے کی بہو بن کر دھنی دھن دولت میں راج کرے گی۔

فیروز دین سے منسوب ہو کر پورے دس سال تک دھنی کا ستارہ عروج پر رہا۔ یہ سب اُسے کوئی خواب لگتا تھا۔ آنکھ کھلے گی تو سب ختم ہو جائے گا۔ راجے مہاراجوں کی طرح شادی ہوئی تھی۔ شہزادیوں کی طرح سج کر ہوشیار پور گئی تھی۔ محبت سے جان نچھاور کرنے والا فیروز دین۔ چھوٹے سے چھوٹا کام کرنے کے لئے نوکرانیاں کھانے کے لئے دنیا کی ہر نعمت کم کمخواب کے سوٹوں میں لپٹی جانے سے پہلے جب اپنی گاڑی میں ماں باپ کو ملنے نور پور آتی تو سارا گاؤں رشک کی نگاہوں سے دیکھتا۔ اللہ نے اولاد کی نعمت سے بھی نواز دیا تھا۔ سلطان، سرداراں اور اقبال کی صورت میں گھر میں رونق لگ گئی تھی۔ فیروز دین نے بچوں کے نام بڑے چن کر رکھے تھے۔ پہلا بیٹا پیدا ہوا تو اس کا نام سلطان رکھا۔ سلطان سے دو سال چھوٹی سرداراں اور اُس سے چھوٹا اقبال تھا۔

سلطان شروع سے سیدھا سادا اللہ لوک سا تھا۔ کم بولتا اپنی دنیا میں مگن رہتا۔ کھانے کو دے دو تو کھا لیتا کسی چیز کی ضد نہ کرتا نہ کسی کھلونے کی طلب نہ کھانے پینے کا لالچ۔ گھر چیزوں سے بھرا پڑا تھا لیکن اُسے دنیا کی کسی چیز کی طلب نہ تھی۔ مہنگی سے مہنگی چیز کی قدر نہ کرتا۔ کوئی آ کر دروازے پر صدا دیتا تو قیمتی سے قیمتی چیز پکڑ کر اس کی جھولی میں ڈال دیتا۔ دنیا سے دور فقیری میں ڈوبا رہتا۔ سکول داخل کروایا تو پتہ چلا کتنی دیر بستہ جماعت میں رکھ کر خود بڑی درگاہ پر بیٹھے ملنگوں کے پاس چلا جاتا۔ سارا دن وہاں بیٹھا رہتا۔ عرس کے موقع پر سب سے آگے بھنگڑا ڈالتا۔ درگاہ کے سب ملنگ اُس سے محبت سے پیش آتے۔ بڑے بابا جی تو فیروز دین سے کہنے لگے تھے۔

"یہ بچہ ہمیں دے دو فیروز دین یہ دنیا دار نہیں اِسے سکول میں مت بھیجو یہ اللہ لوگ ہے۔"

فیروز دین یہ سب دیکھ کر سلطان کے بارے میں پریشان رہنے لگا۔ اتنی بڑی زمینداری کے سلسلے میں اکثر وہ ہوشیار پور سے لاہور آتا جاتا رہتا تھا۔ وہ تو سوچتا تھا سلطان اچھا پڑھے تو وہ اسے لاہور کے کس سکول میں داخل کروا دے گا۔ اُس کے دور طریقے دیکھ کر وہ اندر سے بجھ سا گیا تھا۔

دوسری طرف انگریز ہندوستان کے مقدر کا فیصلہ کر رہا تھا۔ قائداعظم اور گاندھی بھی آزادی کی جنگ لڑ رہے تھے۔ فیروز دین سیاسی حالات سے باخبر ہوتے ہوئے بھی کوئی فیصلہ نہ کر پا رہا تھا۔ اتنی بڑی زمینداری چھوڑ کر پاکستان کیسے چلا جاتا پھر پتہ نہیں ہوشیار پور ہندوستان میں شامل ہونا تھا یا پھر پاکستان میں کچھ بھی واضح نہ تھا۔ دھنی اُسے سمجھاتی ہم اپنا گھر اپنی زمینیں چھوڑ کر کہیں نہیں جائیں گے۔ یہ جو کچھ دن کا شور ہے وقت کے ساتھ ٹھنڈا ہو جائے گا۔ پھر ہر طرف امن ہو جائے گا سب پہلے کی طرح ہنسی خوشی اکٹھے رہنے لگیں گے۔ لیکن اس بار قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ وہ تدبیریں کر رہے تھے اور تقدیر لکھنے والا ان کی تدبیروں پر ہنس رہا تھا۔ فسادات شروع ہوئے تو پورا پنجاب کیا پورا ملک اس کی لپیٹ میں آ گیا۔ دھنی کی قسمت کا پہیہ دس سال کی مدت پوری کر کے واپس (تنزلی) کے سفر پر نکل کھڑا ہوا۔ ملک تقسیم ہو گیا۔۔ نہ چاہتے ہوئے بھی جان بچانے کے لئے روتے پیٹتے اپنے گھروں کو چھوڑ کر نکلنا پڑا۔ زمین جائیداد حویلیاں، باڑے جانور سونا چاندی سب کچھ وہیں رہ گئے۔ نوابوں، راجاؤں کی جاگیریں لٹ گئیں۔ راتوں رات لال مٹیوں میں رُل گئے۔ کل تک جو مخملیں بستروں

میں سوتے تھے۔ گرم ریتوں کے مسافر بن گئے۔ فیروز دین اور دھنی بچوں کو لے کر رات کے اندھیرے میں اسی عالم میں گھر سے نکلے۔ آنکھوں سے آنسو کی جھڑی جاری تھی دل چاہتا تھا چیخ چیخ کر روئیں کہ ان کی فریاد سے آسمان پھٹ جائے لیکن موت کے خوف سے ساری فریادیں اندر ہی اندر دب گئیں۔ صرف ایک جائے پناہ تھی اور وہ تھی پاکستان۔ سارے دکھوں کا مداوا صرف پاکستان تھا۔ فیروز دین اور دھنی آنکھوں میں آنسوؤں کی جھڑی لئے زندگی کا کل سرمایہ ہار کر پاکستان کی طرف چل پڑے۔ روتی پڑتی دھنی کو کیا خبر تھی امتحان تو اب شروع ہو رہا تھا۔ جس کے سہارے پر زندگی کا اثاثہ پیچھے ہار آئی تھی۔ جس کے سہارے پر جنگلوں میں راتیں گزار سکتی تھی وہ سہارا ابھی چند گھڑیوں کا مہمان ہے یہ بھی چھن جائے گا۔ اجل کا فرشتہ پر پھیلائے کھڑا تھا۔ معلوم نہ تھا بہت جلد فیروز دین کو مسلمان ہونے کا صلہ موت کی صورت ملے گا۔

راستے میں چمکتی ہوئی تلواروں کی جھنکاروں کے بیچ ناتواں دھنی سے شیر جوان فیروز دین بچانا بہت مشکل تھا۔ وہ ترلے منتیں کرتی رہی ہاتھ جوڑے اللہ رسول کے واسطے دیتی رہی۔ ان سنگدلوں نے فیروز دین کے سر پر کاری ضرب لگائی دونوں بازو تن سے جدا کر ڈالے۔ فیروز دین خون میں لت پت تڑپ رہا تھا۔ سلطان جو اُس جتھے کے آتے ساتھ ہی کماد کے کھیت میں جا چھپا تھا۔ ان کے جانے کے بعد باہر نکل آیا۔ باپ کو اس حال میں تڑپتا دیکھ کر رہتے سہتے حواس بھی کھو بیٹھا۔ سرداراں باپ کو بچاتے بچاتے زخمی ہو چکی تھی۔ تلواروں کے کئی وار اپنی نازک کلائیوں پر سہے تھے۔ اقبال نیچے زمین پر بیٹھا تڑپتا رہا۔

فیروز دین اسی حالت میں بھی دھنی سے کہتا رہا وہ اس کی فکر نہ کرے۔ شام ہونے سے پہلے بچوں کو لے کر یہاں سے دُور چلی جائے۔ دھنی کی زندگی کی تو شام ہو چکی تھی اس کی آنکھیں پتھرا چکی تھیں جسم بے جان ہو گیا تھا۔ کتنا مشکل تھا اُس کے لئے فیروز دین کو یوں بے سہارا چھوڑ کر اپنی اور بچوں کی جان بچاتا۔ وہ اُسے اُسی اللہ اور رسول کے واسطے دے کر یہاں سے جانے کو کہہ رہا تھا جن کے واسطے وہ تھوڑی دیر پہلے ان ظالموں کو دے رہی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا اُسے اپنے اور سرداراں کی عزت بچا کر پاکستان کی طرف جانا ہوگا۔ وہ اب زیادہ دیر زندہ نہیں رہے گا۔ یہ زخم اُسے آہستہ آہستہ موت کی طرف دھکیل دیں گے۔

دھنی بے بسی سے تڑپتے شوہر کو دیکھ رہی تھی۔ وہ جاتی بھی تو کہاں آنکھوں کے آگے اندھیرے چھا گئے تھے۔ آن ہی آن میں دوسرے جتھے نے اس لٹے ہوئے خاندان کو اپنی کرپانوں کے سائے سے گھیر لیا۔ اس جتھے کے آنے سے فیروز دین کی تو مشکل آسان ہو گئی۔ انہوں نے دیکھا ان کا سب کچھ تو پہلے ہی کوئی لوٹ کر لے جا چکا تھا اور یہ غریب بلک بلک کر موت کی طرف جا رہا ہے۔ ان میں سے ایک بولا۔

"یار اس کی تو مشکل آسان کرو تڑپ تڑپ کر مرنے سے بہتر ہے جلدی جان نکل جائے۔"

ایک ظالم نے آگے بڑھ کر تلوار کے وار سے فیروز دین کا سر تن سے جدا کر دیا۔ بہت سارا خون پہلے ہی نکل چکا تھا۔ سر کٹے ساری مشکلیں ختم ہو گئیں۔

دھنی، سلطان، سرداراں اقبال سب اپنی اپنی جگہ چپ کے چپ بیٹھے رہ گئے۔ اک خوف

اور بے بس طاری تھی ان کے چہروں سے نہ کوئی فریاد کر رہے تھے نہ کوئی واسطہ نہ آنسو، نہ سسکیاں نہ چیخ و پکار سب یک ٹک فیروز دین کے مردہ جسم کو دیکھ رہے تھے۔ جو ٹکڑوں میں سامنے پڑا تھا۔

ایسا کیا تھا دھنی کی مجبور بے بس آنکھوں میں اس چھوٹے سے جتھے میں شامل مردوں کی نظریں اس کے سامنے جھک گئیں تھیں وہ دیکھ رہے تھے اُس دکھیاری کے پاس عزت کے علاوہ اب اور کوئی چیز لٹانے کے لئے نہیں بچی۔ اس کے سر کا سائیں مردہ حالت میں سامنے پڑا تھا اور تینوں بچے ایک اکیلی تنہا پناہ گاہ کی صورت اس ناتواں کمزور سی عورت سے لپٹے بیٹھے تھے۔ جس کی آنکھیں پتھر کی ہو چکی تھیں۔ اس کی بے بسی پر مارنے والوں کو بھی رحم آ گیا تھا۔ آگے بڑھ کر ان میں سے ایک آدمی نے زمین سے اٹھا کر اس کے دوپٹے سے اس کا ننگا سر ڈھانپ دیا اور چپ چاپ خاموشی سے واپس چلے گئے۔

✧✧✧

سورج غروب ہو رہا تھا۔ اُس نے فیروز دین کے جسم کے حصے جمع کر کے ان پر چادر ڈال دی۔ وہ رونا چاہتی تھی پیٹنا چاہتی تھی لیکن پتہ نہیں دل پتھر کا کیوں ہو گیا تھا۔ وہ ہوا کے ٹھنڈے لمس کو محسوس کر رہی تھی۔ اُس کے اندر موجود نمی بارش کی آمد کا پتہ دے رہی تھی۔ بارش سے پہلے کسی سائبان کی تلاش ضروری تھی پھر بھی وہ وہیں اسی حالت میں بیٹھی تھی سب کچھ تو لٹ چکا تھا۔

پیچھے سے آنے والے قافلے نے فیروز دین کو دفنایا۔ سسکتے بچوں کو پانی پلایا۔ دھنی کو سہارا دے کر اٹھایا۔ وہ ان کے ساتھ کچے راستے پر چل پڑی۔ نجانے یہ راستہ کہاں جاتا۔ شاید پاکستان وہ پاکستان جس کے لئے اس کا سب کچھ لٹ گیا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی آگے کیا ہونے والا ہے۔ فیروز دین کی آواز اُس کے کانوں میں گونج رہی تھی بچوں کو لے کر یہاں سے چلی جاؤ۔ وہ زخمی حالت میں بھی اُسے رات ہونے سے پہلے اس ویرانے سے جانے کا کہتا رہا۔ اپنی اور سرداراں کی عزت بچانے کیلئے پاکستان کی طرف جانے پر بضد تھا۔ فیروز دین کی خاطر بچوں کی خاطر وہ چل پڑی تھی۔ ناتواں وجود پر تین بچوں کا بوجھ اُٹھائے وہ پاکستان کی سرحد پر کھڑی تھی۔ جس گاؤں میں وہ لوگ ٹھہرے وہ زمینداروں کا گاؤں تھا۔

دھنی کو پاکستان کے اس گاؤں نے ایک ماں کی طرح اپنے ٹھنڈے آنچل میں سمیٹ لیا تھا۔ ایک عدد کچا مکان چھت کے طور پر مل گیا۔ اب مسئلہ پیٹ پالنے کا تھا کمانے والا کوئی نہ تھا۔ بچوں کا پیٹ اُسے خود پالنا تھا۔ شادی کے دس سالوں میں فیروز دین نے اُسے بڑا نازک بنا دیا تھا۔ باہر نکل کر دھوپ کی شدتوں کو جھیلنے کی عادی نہ رہی تھی۔ اب مصیبت سر پر پڑی تھی۔ گرم دوپہروں میں حبس زدہ گرم پانی میں کھڑے ہو کر منجی لگانے سے نازک پیروں میں چھالے پڑ جاتے۔ زمینداروں کا گاؤں تھا۔ سال میں دو تین فصلیں نکلتی گندم، چاول، گنا، چنے اس کے علاوہ کئی موسمی پھل اگتے کام کرنے والا بندہ بھوکا نہیں مر سکتا تھا۔ چند سالوں میں وہ عورت ہو کر بندوں سے زیادہ کام کرنے لگی تھی۔ ہر فصل پر وہ بچوں کے لئے کچھ اناج جمع کرنے کے قابل ہو جاتی۔ دھنی ایک بار پھر سے بے دھن ہو چکی تھی۔ اپنے بچوں کی خاطر اس نے اپنے آپ کو سمیٹ کر قسمت کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔

کڑا امتحان تھا تین بچوں کے ساتھ اکیلی عورت بھری جوانی، غربت کتنے محاذوں پر اکیلی دھنی لڑ

رہی تھی لیکن بڑی باہمت تھی مانا کہ اُس زمانے میں لوگوں کی نظروں میں شرافت تھی خدا ترسی تھی چور ڈاکو کا خطرہ نہ تھا کسی ایک کی عزت پورے گاؤں کی عزت ہوتی تھی پھر بھی اُس دور میں بھی مردوں کی طرح جینا بہت مشکل تھا۔ اگلے چند سالوں میں دھنی کے بالوں میں چاندنی اُتر آئی۔ سرداراں جواں ہوئی تو اس کے ہاتھ پیلے کرنے کی فکر میں وہ ساری ساری رات جاگ کر گزار دیتی۔ نیندیں تو فیروز دین اپنے ساتھ لے گیا تھا یہاں آ کر وہ آرام سے پرسکون نیند نہ سو پائی تھی۔ کچھ کھونے کا ڈر ہر رات سر پر سوار رہتا۔ غریب کے پاس عزت کے علاوہ اور کیا بچا تھا۔ عزت ہی اس کا سب سے بڑا سرمایہ تھی۔

بھری گرمیوں میں بچوں کو چھت پر سلا کر وہ ساری رات ان کے سرہانے جاگتی رہتی۔ ذرا سی کوئی بلی یا کوئی اور چیز بھی بنیرے سے گزر جاتی تو وہ اونچی آواز میں اٹھ کر گالیاں دینے لگ جاتی۔ کوئی ہمسایہ اپنی چھت سے پکار کر کہتا دھنی سو جا کوئی نہیں۔ دوسروں کی طرف سے حوصلہ مل جانے کے باوجود یا تو وہ رات آنکھوں میں گزر جاتی یا پھر بچے اکٹھے کر کے وہ چھت سے نیچے اُتر کر کچے کمرے کے کمزور سہارے میں پناہ لے لیتی۔ لکڑی کا کمزور سا دروازہ بند کر کے اس کے آگے چارپائی ڈال لیتی۔ بچوں کو چارپائی پر لِٹا کر ساری رات پنکھا جھولتے نجانے کب آنکھ لگ جاتی۔

سلطان شروع سے من موجی تھا باپ کا سایہ اُٹھتے گھر سے ماں سے بالکل بیگانہ ہو گیا تھا۔ کئی کئی دن گھر سے غائب رہتا۔ میلوں ٹھیلوں پر نکلے ہوئے سردائی پی کر وہیں پڑا رہتا۔ سردی شروع ہوتی تو دھنی سر پر رضائی اُٹھا کر اسے ڈھونڈتے نکل کھڑی ہوتی۔ ممتا کی دھوپ چھاؤں اُسے سردی کی ٹھٹھرتی راتوں میں گرم رضائی میں چین نہ لینے دیتی اسے لگتا وہ سردی میں کہیں ٹھٹھر رہا ہوگا۔ برسات شروع ہوئی تو اس کی کمزور چھت ٹپکنے لگ جاتی۔ سرداراں اور اقبال کو بھیگنے سے بچاتے ہوئے وہ ساری رات سلطان کی زندگی اس کی سلامتی کے لئے دعائیں مانگتی۔ وہ سوچتی اس بھری برسات میں وہ پتہ نہیں کہاں بھیگ رہا ہوگا۔ میرے مولا اُسے گھر کا راستہ دکھا دے۔ وہ بھول کر گھر آ جاتا تو اس کی اندھیری دنیا روشن ہو جاتی۔ ایک طرف دنیا روشن ہو جاتی تو دوسری طرف دونوں ماں بیٹا لڑ لڑ کر پورے محلے کا جینا حرام کر دیتے۔

لوگوں کے خیال میں سارا قصور دھنی کا تھا۔ وہ ہر وقت سب سے لڑنے مرنے پر تیار رہتی تھی۔ لیکن وہ یہ نہیں جانتے تھے اُس نے یہ خود ساختہ خول اپنے اوپر کیوں چڑھا رکھا ہے۔ وہ ایک کمزور عورت تھی جسے آج بھی کسی مضبوط سہارے کی ضرورت تھی۔ سلطان اس کا سہارا بننے کی بجائے اس کا بوجھ بن گیا تھا۔ وہ سوچتی اتنا جوان بیٹا تو ماں کا مضبوط سہارا ہوتا ہے یہ کیسا جوان تھا جو خود اس کے سہارے کا محتاج تھا۔ وہ غصے میں آ کر اُس سے لڑتی اُسے اس کی ذمہ داریوں کا احساس دلاتی لیکن سب بے سود تھا۔ وہ نشے میں دھت اس کی باتیں سُن کر کان لپیٹ کر بیٹھا رہتا۔ سرداراں کو بیاہ کر اس کا ذہن تھوڑا سا آزاد ہوا تھا۔ اس کے جاتے سر پر ہر وقت لٹکتی تلوار ٹل گئی تھی۔ اب وہ اور چھوٹا بالا گھر پر اکیلے تھے۔ اب بھی چھت پر اکیلے سوتے ہوئے اُسے خوف آتا تھا۔ پہلے سرداراں کی وجہ سے گرم راتیں کمرے کے اندر گزرتی تھیں۔ اب اقبال کے خوف سے اسے کھونے کا خوف آج کل اُسے گھیرے ہوئے تھا۔ حبس زدہ راتوں

میں اندر سو سو کر وہ پیلا پڑ گیا تھا۔ عام بچوں والی اُس میں کوئی بات نہ تھی۔ چپ چاپ رہنے لگا تھا۔ بخار چڑھا اور بستر کے ساتھ لگتا چلا گیا۔ گاؤں کے حکیم صاحب نے کہا تھا۔ اسے یرقان ہو گیا ہے۔ ٹھنڈی چیزیں کھلایا کرو۔ ایک روز اس کے لئے گنڈیریاں لینے گئی واپس آئی تو وہ چپ چاپ ختم ہو چکا تھا۔ اس کا ایک اور سہارا اُسے چھوڑ کر قبر میں جا سویا جینے کا واحد سہارا بھی چھن گیا۔

اقبال کے مرنے کے بعد لوگوں نے دیکھا اب دھنی گرمیوں کی راتوں میں چاندنی رات میں اپنی چارپائی پر بیٹھی خود سے باتیں کرتی۔ کبھی دیوار کی طرف روڑے اُٹھا کر مارتی اور بولتی چل دوڑ ادھر سے یا کبھی شور مچاتی۔ چور چور سارا محلہ جانتا تھا۔ اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے بھلا اب اس کے گھر میں کیا بچا تھا۔ جسے چور چرانے آسکتا تھا۔ نہ سرداراں کے روپ میں جوانی رہ گئی تھی نہ اقبال کے روپ میں لڑکپن کی شرارتیں تھیں۔ دھنی کے پاس نہ دھن تھا نہ دولت تھی۔ وہ کبھی بھولے بھٹکے سلطان کو ڈھونڈتی کسی مزار پر پہنچ جاتی تو وہ اُسے نشے کی حالت میں مدہوش پڑا ملتا۔ اُسے دیکھ کر وہ سوچتی فیروز دین تم نے بھی میرے ابا کی طرح بچوں کے نام ٹھیک نہیں رکھے۔ بابا لال شاہ بالکل ٹھیک کہتا تھا۔ بچوں کے نام ایسے رکھو جو ان کے چہروں پر ان کی شخصیت پر بجتے ہوں۔ ایسے نام رکھو جو ان کی شخصیت کے آئینے بن جائیں۔ تو اُس کا نام سلطان تو رکھ دیا لیکن اس کے نصیب میں فقیری لکھی تھی۔ سرداراں کا نام بھی غلط رکھا اُس نے بھلا کہاں کی سرداری کرنی تھی۔ جس طرح کی غربت میں پل کر جوان ہوئی ویسے ہی گھر میں بیاہ کر چلی گئی اور اقبال وہ تو دونوں سے زیادہ بدنصیب تھا۔ نام تم نے اقبال رکھ دیا۔ جس کا اقبال کبھی اونچا ہوا ہی نہیں۔

اس رات وہ سلطان کو دیکھ کر آئی تھی۔ دل کے ٹکڑے کٹ کٹ کر ماتا کے مجبور آنسوؤں میں مل کر چارپائی کے سوکھے بان میں جذب ہوتے جا رہے تھے۔ تاروں بھرا آسمان ہمیشہ کی طرح اُداس اور بے چین تھا۔ وہ اپنے بچوں کی کم نصیبی پر آنسو بہا رہی تھی۔ تبھی اُسے لگا اقبال آ گیا ہے۔ اقبال گھر کی کچی سیڑھیاں چڑھ کر اس کی چارپائی پر آ کر بیٹھ گیا تھا۔ اپنے بچے کو دیکھ کر اس کی سوکھی بنجر آنکھوں میں اچانک سے روشنی عود آئی تھی۔ وہ مسکراتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی آنکھوں سے لگاتا اُسے اپنے ساتھ چلنے کا کہہ رہا تھا۔ وہ اس کا ہاتھ زور سے پکڑے آنکھیں موندتی چلی جا رہی تھی۔

✦✦✦

صبح دھوپ اچھی خاصی چڑھ چکی تھی۔ محلے والوں نے دیکھا ہر صبح تڑکے اُٹھ جانے والی آج سورج سر پر آ جانے کے بعد بھی چارپائی پر پڑی سو رہی تھی۔ جگانے پر پتہ چلا وہ تو نجانے کب رات کے کسی ظالم پہر میں موت کی بانہوں میں سکون پا چکی تھی۔ دھنی نام پانے والی کا گھر آج بھی خالی تھا کفن دفن کے لئے گھر میں کچھ نہ تھا۔ سارے گاؤں نے مل کر پیسے ڈالے اتنے پیسے جمع ہو گئے اچھا کفن اور کھانے پینے کا سامان آرام سے ہو گیا

وہ ساری زندگی میں جن نعمتوں کو کھانے کے لئے ترستی رہی اس کے مرنے کے بعد وہ ساری نعمتیں دوسرے لوگ کھا رہے تھے۔ اپنی اپنی قسمت کی بات ہے کوئی مر کر دھنی ہوتا ہے۔ اور کوئی جیتے جی بھی دھنی نہیں ہوتا۔ دھنی مر کر دھنی ہو گئی تھی۔ زندگی میں دھن دولت خواب کی طرح پاس سے گزر گئے تھے۔

جل تھل

قرۃ العین رائے



"بس!!"

وہ غرایا تھا اور اس کی غراہٹ میں چھپی تنبیہہ نے جیسے ان کی زبان یکلخت بند کر دی تھی۔

"اس سے آگے ایک لفظ اور نہیں، چچا مجھے آپ کو جو بتانا تھا میں بتا چکا ہوں اب آپ اپنی بیوی کو بتا اور سمجھا بھی دیں یہ میری بیوی ہے، میری عزت ہے اور مجھے کوئی ایسی بات سننی ہے اور ناں دیکھنی ہے جس کے بعد میں رشتے کا ادب بھول جاؤں رات کافی ہو چکی ہے اور میں تھک گیا ہوں میں اپنے کمرے میں جا رہا ہوں آپ سب لوگوں کو بلا کر اس سے تعارف کروانا تھا سو کروا دیا۔"

وہ یکدم اُٹھا تھا اور بڑے سے لاؤنج کی دائیں طرف بنے زینے سے چڑھتا ہوا، اپنے کمرے کی جانب بڑھتا چلا گیا تھا اور جسے ابھی وہ اپنی بیوی کہہ کر متعارف کروا چکا تھا سب سے وہ وہی کی وہی بیٹھی رہ گئی تھی اپنی سفید گلابی ہاتھوں کی انگلیوں کو مروڑنے کے سوا اب اور وہ کیا کر سکتی تھی۔ دل رونے کو پھر سے بے تاب ہوا تھا لیکن اتنے سارے اجنبی لوگوں کے درمیان وہ یوں کمزور نہیں پڑنا چاہتی تھی۔ سو اپنا نچلا گلابی ہونٹ کا ایک کونہ دانتوں سے بے دردی کے ساتھ دبائے آنسوؤں کے گولے کو نیچے اتارنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"ہونہہ جسے آگے تو بہت لحاظ رکھتا ہے۔ بدتمیز، جنگل، ناہنجار، چلو اٹھو تم سب لوگ ایک تماشہ تھا جو اب ختم ہو چکا۔" بند ہوئی زبان پھر سے زہر اگلنے لگی تھی۔

"قسم کھائی ہے بھائی ہمیں حیران اور پریشان کرنے کی"۔ سمیر بڑبڑاتا ہوا اٹھا اور اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ اس کا سوشل

مکمل ناول



میڈیا ڈسٹرب ہو گیا تھا۔
"مجھے بھی نیند آ رہی ہے نائلہ چلو!" زبیر نے اپنی بیوی کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا تھا۔
"ہوں! ہاں آپ چلیے میں آتی ہوں۔" نائلہ چونکی تھی اور ایک نظر سامنے معصوم اور غم زدہ صورت پر ڈال کر اپنے شوہر سے بولی تھی جو اس کی نظروں کا مفہوم جان کر اثبات میں سر ہلاتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا تھا اور یہ کہہ کر آگے بڑھ گیا تھا۔
"ہوں ٹھیک ہے تم ان کے پاس رکو۔"
"اے تیرا کون مر گیا ہے جو منہ پر بارہ بجے ہیں چل اُٹھ جا اپنے کمرے میں اور آپ بھی چلیں کس آس پر بیٹھے ہیں"۔ وہ آواز پھر سے کانوں کو تکلیف دیتی ہوئی محسوس ہوئی تھی اُسے۔
کوئی اُس کے پاس سے بے حد تیزی سے گزرا تھا جلدی سے سمٹ کر اُس نے اپنے پاؤں بچائے تھے جیسے گزرنے والی انہیں روند کر جانا چاہتی تھی۔
"تم چلو میں آتا ہوں!"
"جلدی آئیں" لہجے میں تنبیہ سموئے وہ بھی اُٹھ کھڑی ہوئی تھیں جنہوں نے اتنی دیر سے کافی ہنگامہ مچایا ہوا تھا ان کے تیور اور لہجے سے لگ رہا تھا جیسے وہ اس لڑکی کا گلہ دبا دینا چاہتی ہوں اور وہ تو مفلوج دماغ اور سُن جسم کے ساتھ جہاں کی تہاں ایک ہی پوزیشن پر بیٹھی ہوئی تھی۔
"تمہارا نام کیا ہے؟" نائلہ نے قریب صوفے پر بیٹھتے ہوئے نرمی سے پوچھا۔ اسے اس بھولی بھالی، ڈری سہمی سی لڑکی پر اس وقت بے حد ترس آ رہا تھا۔
"جی افراح!" گلے کو صاف کرتے ہوئے دھیمے لہجے میں جواب دیا تھا۔
"بہت پیارا نام ہے، افراح تم نے کچھ کھایا ہے؟ بھوک لگی ہے تمہارے لئے کھانے کو کچھ لاؤں؟" نائلہ نے پیار اور نرمی سے اکٹھے تین سوال کر ڈالے تھے۔
"نہیں!" اُس نے سختی سے سر نفی میں ہلا دیا تھا۔
"میرے خیال میں بیٹی تم نے کافی دیر سے کچھ نہیں کھایا جس صورتِ حال کا سامنا تم کر کے آئی ہو بھوک پیاس تو ویسے ہی مٹ گئی ہو گی۔ چلو میری بیٹی تھوڑا سا کچھ کھا لو پھر نائلہ تم اسے ارشام کے کمرے میں چھوڑ آنا اور وہاں اسے بھی کھانے کا پوچھ لینا بھوکا ہو گا وہ بھی"۔ چچا جان جواب تک خاموش بیٹھے تھے اُٹھ کر اُس کے قریب آ کر سر پر نرمی سے ہاتھ رکھتے ہوئے بولے تھے۔
"چلو شاباش میری بیٹی تھوڑا بہت کھا لو اور آرام کرو باقی باتیں صبح ہو گی۔
"انشاء اللہ" انہوں نے شفقت سے اُس کے سر کو اپنے ہاتھ سے سہلایا تھا۔
"جی ابو میں لیجاتی ہوں اس کو بھائی کے کمرے میں ساتھ ہی دونوں کا کھانا بھی گرم کر کے لے جاتی ہوں۔" نائلہ نے جواب دیا تھا۔
"چلو ٹھیک ہے گھبرانا یا پریشان نہیں ہونا میری بچی آج سے یہ تمہارا بھی اتنا ہی گھر ہے جتنا ہمارا تم اس گھر کا فرد ہو۔" تسلی آمیز لہجے سے کہہ کر وہ بھی اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئے تھے جہاں پر انہیں ایک محاذ کا سامنا کرنا تھا۔ کم از کم ایک آدھ گھنٹے تک وہ سونے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کیونکہ انہیں پتہ تھا اُن کی شریکِ حیات اتنی بڑی بات کو اتنے آرام سے ہضم ہر گز نہیں کرے گی۔
"آؤ افراح چلیں، میں کھانا گرم کر لائی ہوں۔" نائلہ ایک ٹرے تھامے اُس کے قریب

آ کر بولی تھی اور وہ ایک روبوٹ کی مانند اُٹھ کر اُس کے پیچھے پیچھے سیڑھیاں چڑھتی ہوئی بائیں طرف بنے کمرے کی جانب چلتی ہوئی آ گئی تھی۔

دل چاہ رہا تھا یہیں سے بھاگ جائے یا کم از کم نیچے ہی کسی صوفے پر رات گزارے۔ غصہ اور غم یک بار اس پر حملہ آور ہوئے تھے۔

"کیسا بدتمیز اور بدلحاظ شخص ہے مجھے وہیں چھوڑ کر خود منہ اٹھائے اپنے کمرے میں چلا آیا کہہ رہا تھا بیوی ہے عزت ہے اپنی بیوی اور عزت کو یوں وہیں سب میں چھوڑ کر آیا جاتا ہے جاہل!" دل ہی دل میں غصے کی تپش بڑھی تھی جس سے اس کے سفید گال قدرے گلابی ہو اُٹھے تھے۔

"کون ہے!؟" لہجے میں سوال کم اور بیزاری نمایاں تھی۔

"بھائی میں نائلہ کھانا لیکر آئی ہوں"۔ دروازے پر دستک دینے پر اندر سے پوچھا گیا تھا۔

"بھوک نہیں ہے لے جائیں"۔ جواب اندر سے موصول ہوا تھا یعنی اس کا دروازہ کھولنے کا بالکل موڈ نہیں تھا سو اندر سے ہی جواب دے دیا گیا تھا۔

"بھائی دروازہ کھولیں"۔ اب کی بار نائلہ کے لہجے میں سنجیدگی نمایاں تھی۔

کچھ دیر میں ہی دروازہ کھول دیا تھا اس نے شاید وہ شرٹ اتار کر سونے کی تیاری میں تھا جبھی بیزاری سے شرٹ کے بٹن بند کرتا ہوا اُس نے دروازہ کھولا تھا۔

"کیا ہے؟ اس سے پہلے کہ وہ اپنے پھاڑ کھانے والے انداز میں نائلہ سے سوال کرتا اپنی پیچھے کھڑی افراح کو نائلہ نے ایک طرف ہوتے ہوئے آگے کیا تھا۔

"آپ نے اس کا تعارف تو اپنی بیوی کا کہہ کر ہم سب سے کروا دیا لیکن شاید اسے اپنے کمرے میں لانا بھول گئے"۔ نائلہ نے جتاتے ہوئے اُسے اس کی بدمزاجی کا احساس دلایا تھا۔

"اوہ، ہاں!!" وہ یکدم چونکا تھا اس کی بیوی تھی تو اُسے اس کے کمرے میں ہی ہونا چاہئے اور وہ اسے نیچے صوفے پر بیٹھا یوں چھوڑ آیا تھا جیسے بس یہی تک کا کام تھا سب سے تعارف اور بات ختم ہو گئی نہیں جانتا تھا کہ بات شروع ہوئی ہے۔

"اندر آ جائیں؟" نائلہ نے پوچھا تھا وہ ابھی تک دروازہ ایک ہاتھ سے پکڑے ان کے اندر آنے کی راہیں مسدود کئے کھڑا تھا۔

"جی آ جائیں۔" ماتھے پر ایک شکن نمودار ہوئی تھی اور راستے سے ہٹتے ہوئے سنجیدہ لہجے میں جواب دیا گیا تھا۔

ٹرے سامنے ایک طرف رکھے میز پر نائلہ نے رکھی تھی اور یہ کہتے ہوئے کمرے سے نکل گئی تھی

"کھانا کھا لینا آپ دونوں"۔ دل اُس معصوم لڑکی کے لئے دکھا ہوا تھا۔

وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی میز کے پیچھے رکھے صوفے پر بیٹھ گئی تھی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔

"یہ چادر اور تکیہ ہے تم یہاں سو جاؤ اور کھانا کھانا ہے تو کھا لو"

تکیہ چادر صوفے پر رکھتے ہوئے وہ سنجیدہ لہجے میں بولا تھا اور پھر اپنے بیڈ کی جانب بڑھ گیا تھا۔ لائٹ وہ آف کر چکا تھا۔ کمرے میں زیرو پاور کا بلب نیلگوں روشنی بکھیر رہا تھا۔ تھکاوٹ اس پر حاوی ہوئی تھی ہر سوچ کو بالائے طاق

رکھے وہ صوفے پر چادر تان کر سو گئی تھی۔ وہ نیند کی کچی تھی اور نیند تو سولی پر بھی آجاتی تو اسے بھی آگئی تھی وہ اُلٹا اپنے بیڈ پر آڑھا ترچھا سو چکا تھا بس بیڈ کے قریب موجود کھڑکی میں سے جھانکتا ہوا آدھا چاند جاگ رہا تھا جو حیران تھا ان دو نفوس کی قسمت اور ملاپ پر منتظر تھا۔ بے تابی سے یہ دیکھنے کو کل اس کمرے میں کیا ہوتا ہے لیکن اس سے پہلے بادِ صبا اس کھڑکی سے کود کر کمرے میں چلی آئی تھی وہ سب جاننے کے لئے جو چاند جاننا چاہتا تھا اور بادِ صبا جو کچھ دیکھ رہی تھی وہ خوشگوار تو ہرگز نہیں تھا۔

✦✦✦

کھڑکی کا پٹ اُس نے قدرے زور سے بند کرتے ہوئے اپنا یونیفارم باہر نکالا تھا مگر صوفے پر گہری نیند میں سوئے وجود میں کوئی حرکت نہیں ہوئی تھی۔

"گھوڑے گدھے بیچ کر سو رہی ہیں محترمہ کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ ایک رات کی دلہن ہے۔" جھلایا سا وہ بڑبڑایا تھا۔

"ہاں ایسی دلہن جسے تم باہر ہی بھول آئے تھے اور ایسی دلہن جو تمہارے کمرے میں تمہارے صوفے پر سو رہی ہے۔" دل کی سرزنش پر بس وہ سر ہی جھٹک سکا تھا۔ اب کی بار اُس نے میز پر گلاس اُٹھا کر زور سے رکھا تھا۔ کھانا جوں کا توں ہی ٹرے میں رکھا تھا۔ گلاس کی آواز پر اس کی بند لمبی پلکوں میں ہلکی سی جنبش در آئی تھی اور وہ کروٹ لینے ہی لگی تھی۔ بے خیالی میں کہ یکدم اس نے آگے بڑھ کر اپنا ہاتھ اس کے چہرے کے نیچے رکھ کر اُسے صوفے کے بالکل آخری کونے سے ڈھلکنے سے روکا تھا۔ یہ سب ایک لمحہ میں ہوا تھا اور یہ اس کی غیر ارادی حرکت تھی وہ کسمسائی تھی اور پھر اُسے یوں اپنے اوپر جھکا دیکھ کر وہ ایک سرائیت میں پیچھے ہوئی تھی آنکھوں میں خوف نہیں بلکہ سوال تھا جسے اس نے الفاظ دے ڈالے تھے۔

"کیا ہوا سب ٹھیک ہے؟" صوفے پر سے ایک طرف رکھا لال دوپٹہ اپنے اردگرد پھیلاتے تشویش بھرا انداز میں پوچھا تھا۔

"آں...... ہاں سب ٹھیک ہے۔ فریش ہو جاؤ تمہیں ہسپتال چھوڑ کر مجھے تھانے بھی جانا ہے اور یہاں سے ہسپتال تقریباً پونے گھنٹے کی مسافت پر ہے۔" اس کے انداز پر وہ قدرے حیران ہوتے ہوئے بولا تھا انداز لٹھ مار ہو گیا تھا آخر میں۔ وہ خاموشی سے اُٹھ کھڑی ہوئی تھی اور کمرے پر طائرانہ نظر ڈالی تھی جبکہ گیلے بالوں میں برش کرتا ہوا ڈریسنگ ٹیبل کے مرر سے کنکھیوں سے اُس کا جائزہ لے رہا تھا کالے قمیض شلوار پر سادہ لال دوپٹہ اوڑھے چہرے پر پریشان لٹیں اور بالوں کی موٹی لمبی چوٹیاں کندھے پر بے نیاز لئے وہ شاید متلاشی نظروں سے واش روم ڈھونڈ رہی تھی۔

"واش روم اِدھر ہے!" صوفے کے دائیں جانب عقب میں موجود دروازے کی جانب اُس نے اشارہ کیا تھا۔

"اور سنو ذرا جلدی کرو میں نیچے جا رہا ہوں ناشتہ کرنے۔" واش روم کی جانب بڑھتے اُس کے قدم دیکھ کر وہ بولا تھا اور وہ دھیرے سے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے آگے بڑھ گئی تھی۔

حواس بیدار ہونے لگے تھے بڑی جھیل سی آنکھوں میں پانی ہلکورے لینے لگا تھا کیا ایسے لکھا تھا اس کی قسمت میں شادی کا ہونا ناں ہاتھوں میں مہندی ناں کلائیوں میں چوڑیاں ناں ان کی کھنکھناتی آواز کو محسوس کرتا ہوا شوہر صاف ظاہر تھا کہ یہ اُس کا مجبوری کا بندھن ہے

اور وہ اس شخص کے لئے ہی نہیں بلکہ اس گھر اور گھر کے مکینوں کے لئے بھی ایک ان چاہی ہستی تھی ایک ایسی ہستی جسے اس کا شوہر رات باہر ہی بھول آیا تھا اور صبح بھی اس کے انداز میں کہیں سے بھی نہیں لگ رہا تھا کہ وہ اس کا شوہر ہے اور وہ اس کی بیوی بس آرڈر ہی دیئے جا رہا تھا۔ نرم لہجہ ناں پیار ناں تسلی کچھ بھی نہیں تھا اُس کے لہجے اور انداز میں۔

"بابا یہ آپ نے کیا کر دیا اتنی ارزاں تو نہیں تھی میں مجھے میری نظروں میں بے مول کر دیا کاش آپ نے اپنی حالت کا واسطہ دے کر ہم دونوں کو اس بندھن میں بندھنے پر مجبور ناں کیا ہوتا لیکن میں آپ کی بے بسی ڈر اور مجبوری کو بھی سمجھ سکتی ہوں"۔

آنسو تھے کہ رکنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے دو راتوں سے مسلسل جاگ رہی تھی وہ خوف اور پریشانی سے گھرے جذبات میں جی رہی تھی اسی لئے نہ جانے کیوں رات اس کمرے میں تحفظ اور سکون کا احساس اتنا حاوی ہوا کہ وہ جلدی ہی بے خبر سو گئی۔

"آؤ بیٹا ناشتہ کرو۔" رات جسے وہ اپنا چچا کہہ رہا تھا اسی نرم خو بزرگ ہستی نے اسے پیار سے پکارا تھا۔ وہ جو سوگوار حُسن سے گندھی دھیمے دھیمے سیڑھیاں اُتر رہی تھی ان کے انداز پر پھیکی سی بے نام مسکراہٹ چہرے پر لا پائی تھی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ چہرے پر لٹیں اب بھی پریشان بکھری تھیں۔ اور پر شکن کپڑے سر پر لال دوپٹہ جمائے وہ ایک اُداس اور کھوئی ہوئی مورت لگی تھی ناشتہ کرتے ہوئے ارشام کو جس نے محض ایک سرسری نگاہ ڈالی تھی اور پھر ناشتہ کرنے میں مصروف ہو گیا اس کے وجود کے ہونے نہ ہونے سے اُسے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا اس بات کا احساس وہ اُسے بار بار دلا جاتا تھا احساس کم مائیگی سے اُس کے سفید گالوں پر ہلکی سی سرخی دوڑ گئی تھی۔

"ارے افراح! تمہارا ناشتہ تو میں بھجوانے لگی تھی تمہارے کمرے میں بس پروین باجی تیار کر رہی تھیں پہلے دن کی دلہن ہو بھئی ابھی تمہارے ناز نخرے اٹھوانے کے دن ہیں۔" نائلہ کچن میں ملازمہ کو ہدایت دیتی ہوئی باہر نکلی تھی اور سامنے سیڑھیوں میں افراح کو دیکھ کر خوشگوار انداز میں اُس سے مخاطب ہوئی تھی۔

"وہ انہوں نے کہا تھا کہ فریش ہو کر نیچے آ جاؤ تو اس لئے۔" اپنے آنے کی وجہ اُس نے جھٹ بتائی تھی۔

"اچھا چلو ٹھیک ہے، آ جاؤ ناشتہ کرو۔" نائلہ نے نرم انداز میں کہا تھا۔

"بھئی ناشتہ تو آج دلہن کے میکے سے آنا بنتا تھا۔ اُلٹی گنگا ہی بہتی ہے اس گھر میں تو ہمیشہ"۔ کب سے خاموش وہ تائی پھر سے بولی تھیں جو رات کو بھی زہر اُگل رہی تھیں کہ نہ جانے کیسے اُٹھا لایا نہ خاندان کا اندیشہ نہ حسب نسب کا علم پتہ نہیں نکاح بھی ہوا تھا کہ نہیں وہ خود مرضی سے آئی تھی یا وہ بیاہ کر لایا تھا کون جانے وغیرہ جس پر وہ غرا ہی اٹھا تھا باقی کے لوگ جن سے وہ مکمل طور پر کیا بالکل بھی متعارف نہیں تھی۔ خاموشی سے ناشتہ کر رہے تھے۔

"جن حالات میں یہ نکاح ہوا ہے اُس کی تفصیل میں بتا چکا ہوں بار بار دہراؤں گا نہیں لہٰذا اس طرح کی فضول باتیں کرنے کی ضرورت نہیں باپ اُس کا ہسپتال ہے اور آپ نہ جانے کونسی رسموں کی دہائی دے رہی ہیں"۔

کانٹے سے فرائی ایگ کو منہ میں رکھتا ہوا وہ ٹھنڈے لہجے میں گویا ہوا تھا اور بلیک کافی کو

ایک ہی گھونٹ میں اپنے گلے سے اتار کر وہ کرسی کھسکاتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"ہونہہ!!" اُس کے جواب پر انہوں نے برہمی سے منہ موڑ لیا تھا۔

"مجھے آفس سے دیر ہو رہی ہے اسے ہسپتال پہلے چھوڑنا ہے وہیں پر کچھ کھالے گی"۔ بات کر کے وہ مڑ جانا چاہتا تھا جبھی اس کے چچا جان نے سوال کیا تھا۔

"ہسپتال! تو کیا بھائی سے نہیں ملواؤں گے ناشتہ کر رہے ہیں وہ اپنے کمرے میں رات انہیں اُن کے آرام کی وجہ سے نہیں جگایا نیند کی دوائی لیکر سوئے تھے۔" انہوں نے ارشام کے والد کا تذکرہ کرتے حیرت سے پوچھا تھا۔

"جان محمد! میرا مطلب اس کے والد کی طبیعت ابھی ٹھیک نہیں رات بھی ان کے بے حد اصرار پر میں اسے لے آیا تھا اس کا اپنے والد کے پاس ہونا زیادہ مناسب ہے۔ جب گھر آئے گی ان سے بھی مل لے گی ویسے بھی چچی جان کے پیٹ میں اتنی دیر یہ بات ٹھہرنے والی نہیں بتا دے گی یہ خود ہی اپنے بھائی جان کو۔" اُس غصیلے لمبے چوڑے جوان نے اپنی گھنی لمبی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے جواب دیا تھا اور اگلی بات سنے بغیر ہی وہ باہر مین انٹرنس کی جانب یہ کہتے ہوئے بڑھتا چلا گیا تھا کہ "جلدی آجاؤ۔" مخاطب کون تھا وہ جان گئی تھی سب کے سمیت۔

"وہ......! وہ آپی کوئی چادر مل سکتی ہے یہ کل وارڈ میں موجود نرس نے اپنا دوپٹہ زبردستی لا کر اوڑا دیا تھا کہ نکاح کے وقت مکمل سیاہ لباس ٹھیک نہیں"۔ وہ جھجکتے ہوئے۔ سیڑھیوں کے قریب ہی کھڑی نائلہ سے مخاطب ہوئی تھی اور آخری دو تین زینے اُتر کر اُس کے قریب چلے آئی تھی۔

"ہاں...... ہاں کیوں نہیں میں لیکر آتی ہوں"۔ نائلہ فوراً اپنے کمرے کی جانب مڑ گئی تھی۔

"بیٹا میں اور زبیر آئیں گے دوپہر کو تمہارے والد کی خبر لینے۔" چچا جان نے نرمی سے کہا تھا۔

"کون سے ہسپتال میں داخل ہیں آپ کے والد؟" زبیر نے جلدی سے استفسار کیا تھا اُسے بھی اپنے باپ کی طرح اس معصوم سی لڑکی سے ہمدردی محسوس ہو رہی تھی۔

"جی وکٹوریہ ہسپتال!" نائلہ کے ہاتھوں سے کالی چادر تھامے وہ جلدی سے بولی تھی۔

"چلیں ٹھیک ہے باقی کی تفصیلات میں ارشام سے لے لوں گا"۔ زبیر نے سر اثبات میں ہلاتے ہوئے جواب دیا تھا۔

"اللہ انہیں صحت و تندرستی دے، آمین!" چچا جان بولے تھے اور زبیر نائلہ کے ساتھ اس نے بھی آمین کہا تھا اور سلام کرتی ہوئی باہر کی جانب بڑھ گئی تھی۔

"کیا ضرورت پڑی ہے ہسپتال جانے کی؟" اپنی پشت پر سنائی دینے والی آواز کا اُسے اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ ارشام کی چچی جان ہی ہیں۔ اُن کا جواب سنے بغیر وہ تیزی سے باہر نکل گئی تھی۔

کالی چادر اوڑھے وہ پورچ میں کھڑی بلیک نسان فرنٹیئر (Blade Nissan Frontier) کی فرنٹ سیٹ پر بیٹھے وہ اسے دیکھ چکی تھی جبھی وہ تیز تیز قدم اٹھاتی اس کی جانب چلی آئی وہ کوئی ضروری فون سن رہا تھا چہرے پر قدرے پریشانی نمایاں تھی۔ افراح کا دل کسی انہونی کے خیال سے یک بارگی دھڑکا تھا۔ سر کے اشارے سے اُس نے اسے فرنٹ سیٹ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا اور قدرے فاصلے پر

کھڑے گنز لئے دو سپاہیوں کو ہاتھ کے اشارے سے قریب آنے کا کہا تھا جو مودب انداز میں اُس کے قریب آ کر سلیوٹ مار کر حکم کے منتظر تھے۔

"تم لوگ دوسری گاڑی میں آؤ پیچھے سوار ہونے کی ضرورت نہیں۔"

یہ کہہ کر گاڑی سٹارٹ کر کے اُس نے بیک کرتے ہوئے گاڑی نکالی اور تیزی سے گاڑی ڈرائیو کرنے لگا تھا شاید اُسے آفس سے بہت دیر ہو گئی تھی وہ بہت رش ڈرائیونگ کر رہا تھا لب بھینچے اور تیوری چڑھائے لیکن وہ ایک ماہر ڈرائیور تھا اس کا اندازہ ہو گیا تھا اسے۔ کچھ بھی پوچھنا بیکار لگا تھا۔ بابا کی بہت یاد آ رہی تھی کتنے کمزور ہو گئے تھے ان دو دنوں میں، خون بھی تو کتنا بہہ گیا تھا دو گولیاں لگی تھیں کتنا لمبا آپریشن چلا تھا ان کا رو رو کر برا حال ہو گیا تھا۔ اُس کا کوئی بھی تو نہیں تھا اُسے تسلی اور تشفی دینے والا بس قریبی ہمسائے آئے تھے کتنی کمی محسوس ہوئی تھی اسے اپنوں کی کوئی بھی تو ان کی قریبی رشتے دار نہیں تھا یہاں پر جو کوئی تھے وہ پسماندہ گاؤں میں تھے اور بابا بہت کم اُسے اپنے رشتے داروں سے ملاتے تھے وہ نہیں آتے جاتے تھے تو ان کی طرف بھی کم ہی آتے جاتے تھے۔ ایک نظر اس نے غصیلے نوجوان پر ڈالی تھی اور پھیر لی تھی۔

کل جو کچھ اُس کی زندگی میں ہو چکا تھا وہ اس کے لئے ذہنی طور پر ہرگز تیار نہ تھی اور نا ہی تمام عمر ہونے کا ارادہ رکھتا تھا اور عورت ذات سے نفرت تو کر سکتا تھا جو کہ وہ کرتا تھا لیکن شادی اور محبت اے۔ ایس۔ پی ارشام کی زندگی کی لغت میں عورت ذات کے لئے یہ دو الفاظ ہرگز ہرگز شامل نہیں تھے لیکن کون جانے قسمت کس کے لئے کیا کر جائے۔

کل شام اپنے چند ضروری معاملات نبٹا کر وہ جان محمد کی خبر لینے ہسپتال گیا تھا ساتھ ہی اس کا کولیگ اور اکلوتا دوست ناصر بھی تھا جو اُس سے جونیئر تھا لیکن وفادار دوست تھا وفادار تو جان محمد بھی تھا اس کے کہنے پر دو مہینے سے وہ اپنی جان ہتھیلی پر رکھے ایک خفیہ مشن کی نگرانی کر رہا تھا۔ وہ سرائیکی اور سندھی زبان پر عبور رکھتا تھا لہٰذا بھیس بدل کر اپنا کام سرانجام دینے کے لئے وہ نہایت موزوں تھا محب وطن تھا، بہادر تھا اور ایک ایمان دار سپاہی تھا کافی عرصے سے وہ ارشام کے ساتھ ہی تھا ان کی انہیں خصوصیات کی وجہ سے ارشام اُسے پسند کرتا تھا اور عمر میں بڑا ہونے کی وجہ سے عزت بھی دیتا تھا جو جان محمد کے لئے کسی انعام سے کم نہیں تھی اور جب جان محمد کی تصدیق پر ارشام اپنے سپاہیوں کے ساتھ آپریشن کلین اپ کر رہا تھا۔ ابھی مجرموں کی طرف سے اکا دکا مزاحمت کا سامنا تھا۔ آمنے سامنے گولیوں کا تبادلہ ہو رہا تھا ارشام ان کے بہت قریب پہنچ چکا تھا۔ تین مجرم مارے گئے تھے یہ لوگ چولستان کے قریب باڈر پار شراب کی اسمگلنگ کا کاروبار کرتے تھے کافی عرصے سے اطلاعات مل رہی تھیں۔ ارشام کو مگر اُس علاقے کی باعزت اور طاقت ور ہستی بھی اس معاملے میں شامل تھے لہٰذا ارشام جانتا تھا کہ اگر اس نے محض اطلاع پر چھاپہ مارا تو وہ لوگ بچ جائے گی یا پکڑے جانے پر انہیں ضمانت پر رہا کروایا جائے گا وہ پکا ہاتھ ڈالنا چاہتا تھا لہٰذا جان محمد منیاری والے کا بھیس بدل کر اُس پس ماندہ سے علاقے میں آنے جانے لگا اور گاؤں کی عورتوں سستے داموں چوڑیاں، مہندی اور اسی طرح کی اشیاء بیچتے بیچتے وہ ان کے ٹھکانے تک پہنچ چکا تھا ان لوگوں کی نقل و حرکت پر اُس کی

گہری نظر تھی۔ بظاہر مزدور نظر آنے والے ان لوگوں میں سے ایک مزدور سے اُس نے دوستی بھی گانٹھ لی تھی جس کی نخریلی محبوبہ کے لیے جان محمد کوئی نہ کوئی چیز اُسے لا کر دیتا رہتا تھا باتوں باتوں میں اُسے اندازہ ہو گیا کہ وہ مزدور جو اصل میں شراب خانے میں شراب تیار کرتا تھا آج رات ڈبل شفٹ لگانے والا تھا اور سامان بھی آج رات ہی لوڈ ہونے والا تھا لہٰذا کل جان محمد اُس کی محبوبہ کیلئے خاص تحفہ جو اُس نے بہاولپور سے منگوایا تھا لیکر نہ آئے بلکہ دو دن بعد اطلاع پکی تھی۔ ارشام نے جان محمد کے فون کرنے پر سپاہیوں کے ساتھ اس علاقے کو گھیرے میں لے لیا تھا اور اب وہ ان کے خفیہ شراب بنانے والے کارخانے میں گھس چکے تھے یہ اُس علاقے کے طاقتور ایم این اے کے بھائی کا بظاہر نمکو بنانے والا چھوٹا سا کارخانہ تھا پر اس کے در پردہ کیا۔ مجرمانہ فعل سرانجام دیا جاتا تھا کوئی نہیں جانتا تھا۔ دلاور شاہ اور اُس کے لوگوں کی طرف سے ہلکی پھلکی مزاحمت جاری تھی۔

''صاحب بچیں!'' اچانک ارشام کے سامنے آکر اُسے دھکہ دیتے ہوئے جان محمد چلایا تھا ایک بڑے سے کنٹینر کے پیچھے چھپے دلاور شاہ نے بے خبر ارشام کا نشانہ لیتے ہوئے یکے بعد دیگرے اپنے پستول سے گولیاں فائر کی تھیں جس میں سے دو جان محمد کو ایک پیٹ میں اور ایک بائیں کندھے اور دل سے قدرے اوپر لگی تھیں۔ ارشام نے مڑ کر کنٹینر کی طرف گولیاں برسانا شروع کر دی تھیں۔ انداز بے حد جارحانہ تھا جان محمد قریب ہی ڈھیر ہو چکا تھا چند منٹوں کی فائرنگ کے بعد مجرم پکڑے جا چکے تھے شراب کی ایک بھاری کھیپ اور دو ٹرک جس پر شراب کی بوتلیں چھپائی گئی تھیں جو باڈر پار جانے کے لئے تیار تھا۔ پولیس نے اپنے قبضے میں کر لئے تھے ارشام نے اوندھے پڑے جان محمد کو فوراً سیدھا کر کے لٹایا تھا۔ بے ہوش ہوتے جان محمد کے کانوں میں دلاور شاہ کی دھمکی آمیز جملے پڑے تھے جو دو سپاہیوں کی گرفت میں پولیس جیپ کی طرف لے جایا جا رہا تھا۔

''چھوڑوں گا نہیں میں تم لوگوں کو تم لوگوں کی نسلیں برباد کر دوں گا۔'' ہسپتال پہنچتے پہنچتے انہیں دو گھنٹے لگ گئے تھے۔ ڈرائیونگ ارشام نے خود کی تھی جیپ پچھلی سائیڈ پر نیم بے ہوش جان محمد اور اس کے ساتھ اس کے دو ساتھی موجود تھے وہ بہت تیز ڈرائیونگ کر رہا تھا چولستان جیپ ریلی میں ہمیشہ وہ اول یا دوئم پوزیشن حاصل کرتا تھا۔ کافی مشاق ڈرائیور تھا اور ریتلے راستوں پر جیپ چلانے میں ماہر تھا۔

✧✧✧

دو دن بعد ناصر اور وہ جان محمد کے ہوش میں آنے کی اطلاع سن کر اُس کی خبر گیری کے لئے ہسپتال کے اُس کمرے میں پہنچے تھے جہاں جان محمد ایڈمٹ تھا وہ کافی کمزور ہو چکا تھا آپریشن کر کے گولیاں نکال دی گئی تھیں۔ ارشام نے خون کی دو بوتلیں دی تھیں اب بھی اس کے ایک بازو میں خون کی بوتل کی ڈرپ لگی تھی اور دوسرے میں گلوکوز کی۔

''کیسے ہو جان محمد!'' بیڈ کے قریب آکر ارشام نے نرمی سے پوچھا اس وقت وہ ہوش میں تھا۔ سامنے دائیں طرف کالے کپڑوں میں ملبوس روئی ہوئی سوجی آنکھوں کے ساتھ اُس لڑکی پر اک سرسری سی نظر ڈالی تھی شاید یہ جان محمد کی بیٹی تھی اس کی بیوی کو فوت ہوئے دو سال ہو چکے تھے اور اس کی ایک ہی بیٹی تھی اتنی معلومات تھی ارشام کے پاس۔

"ٹھیک ہوں صاحب آپ کا احسان ہے صاحب"۔ نقاہت بھرے لہجے میں بمشکل مسکراتے ہوئے جان محمد نے جواب دیا تھا۔

"ارے! احسان کیسا، احسان تو تمہارا ہے جس نے میری جان بچائی میں تمام عمر تمہارے اس احسان کا بدلہ نہیں اتار پاؤں گا اتارنا بھی چاہوں تو"۔

ارشام نے جلدی سے مشکور لہجے میں کہا تھا ناصر اس کے پیچھے ہی موجود تھا۔

"اتار سکتے ہیں صاحب اگر آپ چاہے تو"۔ جان محمد گویا ہوا تھا۔

"ہاں...... ہاں بولو میں کسی بھی قیمت پر تمہارا یہ احسان چکانا چاہوں گا"۔

ارشام نے نا سمجھتے ہوئے جواب دیا تھا۔

"صاحب میرے پاس اس دنیا میں ایک قیمتی چیز اور مرنے سے پہلے میں اُسے آپ کو سونپ دینا چاہتا ہوں تا کہ جان پر رکھے اس بوجھ سے اس خوف سے نجات حاصل کر سکوں ورنہ مرنے کے بعد بھی شاید مجھے چین نہ آئے"۔

جان محمد کی بات پر وہ تینوں نفوس جو کمرے میں موجود تھے حیران ہوئے تھے۔

"کیا کہہ رہے ہو؟" ارشام کو بالکل سمجھ نہیں آئے تھی۔

"ان لوگوں کے ہاتھ بہت لمبے ہیں کسی نہ کسی دن دلاور شاہ آزاد ہو جائے گا۔ آپ اور میں اچھی طرح سے جانتے ہیں۔ یہ قانون صرف ان طاقت ور لوگوں کے ہاتھوں کٹھ پتلی ہے اور بس اس کا ایم این اے بھائی اُسے آزاد کروا دے گا۔ جاتے جاتے وہ چلاتے ہوئے کہہ رہا تھا کہ وہ ہمیں برباد کر دے گا ہماری نسلیں برباد کر دے گا، صاحب! میں بہت کمزور ہوں میری مدد کریں۔ صاحب میری درخواست ہے آپ میری بیٹی سے نکاح کر لیں ابھی اور اسی وقت۔" آخر میں روتے ہوئے جان محمد نے اپنے ہاتھ جوڑنے کی کوشش کرتے ہوئے بمشکل یہ جملے ادا کیے تھے۔ اتنا بول کر ہی وہ نڈھال ہو چکا تھا۔

وہ تینوں ایک پل کو اپنی جگہ پر تھم سے گئے تھے۔

"بابا! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں، پلیز ایسی باتیں نہ کریں"۔ وہ تڑپ کر اپنے باپ کے قریب آ کر بولی تھی تھمے آنسو پھر سے بہنے لگے تھے۔

"صاحب میرا احسان یونہی چکا سکتے ہیں"۔ جان محمد نے اپنی بچی کھچی قوت استعمال کرتے ہوئے ہاتھ جوڑنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا تھا آنسو اُس کی آنکھوں کے کونوں سے ایک دھار کی طرح بہہ رہے تھے دنیا کا سب سے مجبور، کمزور اور بے بس باپ محسوس کر رہا تھا وہ خود کو۔

"ٹھیک ہے...... ٹھیک ہے لیکن تم ہاتھ مت جوڑو پلیز تم ٹھیک ہو جاؤ گے......!" ارشام نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ تھامتے ہوئے اسے تسلی دینی چاہی۔

"صاحب...... صاحب!" جان محمد کے لہجے میں ہزاروں التجائیں کرلا رہی تھیں باپ کی بے بسی اور شکستگی اُس کے چہرے پر رقم تھی۔

جان محمد نے ارشام کی بات کاٹتے ہوئے پکارا تھا اُسے کیا کچھ نہ تھا اس پکار میں۔

"ٹھیک ہے ناصر تم ابھی نکاح خواں کا انتظام کرو میں نکاح کروں گا"۔ الفاظ تھے یا بم جو ناصر کے سر پر پھٹے تھے۔

"ناصر ہری اپ! جلدی کرو!" ارشام نے ساکت کھڑے ناصر کو مڑ کر کہا تھا۔

ناصر جو کہ ارشام کو اچھی طرح سے جانتا تھا، شراب اور شباب ارشام کا ایسی چیزوں سے دور دور تک کا واسطہ نہ تھا عورت ذات سے وہ بد کتا تھا اور شادی تو وہ کبھی نہیں کرے گا بس اس وردی سے اُسے محبت تھی اور یہی اُس کی بیوی تھی شادی کے متعلق سوال پر ہمیشہ اُس کا یہی جواب ہوتا تھا "اور اب نکاح.....؟"

"میری دھی، میری مٹھی تجھے اپنے باپ کا فیصلہ قبول ہے ناں" ۔ جان محمد نے پدرانہ شفقت سے اپنی روتی ہوئی بیٹی سے پوچھا تھا۔

"بابا آپ ٹھیک ہو جائیں بس۔" سسکیوں میں وہ بس یہی کہہ پائی تھی۔

"کل سارا دن آپ بے سدھ رہے ہیں۔ پرسوں ہی تو آپ کا آپریشن ہوا ہے۔ آپ کبھی ایسے کمزور نہیں پڑے ناں مجھے پڑنے دیا کیوں اتنے کمزور ہو رہے ہیں کہ.....؟" اگلا جملہ اُس کی سسکیوں کی نظر ہو گیا تھا اور وہ شاید کہنا چاہ رہی تھی کہ میری شادی کی بھیک مانگ رہے ہیں۔

"تجھے قبول ہے ناں میرا فیصلہ دل سے.....؟" جان محمد نے اس کی باتیں نظر انداز کرتے پھر اپنا سوال دہرایا تھا اور خشک ہوتے ہونٹوں پر زبان پھیری تھی۔

"قبول ہے بابا..... آپ کے پاس ہی تو یہ اختیار ہے آپ جانتے ہیں آپ جہاں کہیں گے مجھے قبول ہوگا لیکن....." اثبات میں سر ہلاتے وہ بولی تھی ارشام نے بس اک نظر اس پر ڈالی تھی وہ خود کو ایک ان چاہی طاقت میں جکڑا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ بے بسی عروج پر تھی اگر اُسے اپنی جان دے کر بھی اپنے وفادار سپاہی کا احسان چکانا پڑتا تو وہ دے دیتا یہ اُس کی انا کا سوال تھا وہ ساری عمر ضمیر کے بوجھ تلے جی ہی نہیں سکتا تھا کہ جان محمد نے اس کی خاطر اپنی جان گنوا دی اور پھر وہ اس کی آخری خواہش بھی پورا نہ کر پایا وہ اپنی نظروں میں گر جاتا اور یہ اُسے منظور نہ تھا۔

اگلے پونے گھنٹے کے اندر اندر ان کا نکاح ہو چکا تھا جان محمد کے چہرے پر آسودگی نمایاں تھی ارشام کے دل پر کوئی بوجھ ناں تھا لیکن اس کی روح اس بندھن میں بندھ جانے کے بعد جیسے پنجرے میں قید پھڑ پھڑا رہی تھی اور پھر جان محمد کے بے حد اصرار پر اُس نے افراح کو ارشام کے ساتھ اُس کے گھر روانہ کر دیا تھا۔ ناصر نے وہی کمرے میں رہ جانے کی تسلی دی تھی۔ دونوں کو افراح کسی صورت جان محمد کو چھوڑ کر جانے پر تیار نہ تھی اور ناں ہی ایسا ابھی ارشام چاہتا تھا وہ بے حد تھک چکا تھا اور گھر جا کر باقی افرادِ خانہ کا سامنا کرنے کا بالکل موڈ نہیں تھا مگر جان محمد کی ایک ہی ضد تھی کہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ جائے وہ اپنی بیٹی کو رخصت ہوتے دیکھنا چاہتا تھا ویسے بھی ڈاکٹر مکمل چیک اپ کر گیا تھا وہ آگے سے بہتر تھا خون کی ڈرپ اُتار دی گئی تھی اور پھر ناصر بھی وہیں موجود تھا ایک گارڈ کے ساتھ افراح بے چین دل کے ساتھ روتی ہوئی ارشام کے ساتھ رخصت ہوئی تھی۔ گاڑی میں بھی وہ بہت بری طرح سے رو رہی تھی کب سوچا تھا کہ اُس کی ایسے رخصتی ہوگی ارشام کے اپنے اعصاب شل ہو گئے تھے۔ فرنٹ سیٹ پر بیٹھے وجود سے اسے کوئی سروکار نہیں تھا لیکن یہ وجود اب اُس کے وجود کا حصہ تھا اس پر بھی انکار ممکن نہیں تھا۔

گھر آ کر اس نے سب کو اکٹھا کیا اور جلدی جلدی اپنے نکاح کے متعلق آگاہ کیا جو جہاں تھا وہی سن بیٹھا رہ گیا اور پھر جب اُس کی چچی اُلٹا سیدھا بکنے لگی تو انہیں چپ کراتا تن فن کرتا وہ اپنے کمرے میں چلا آیا تھا اور جس انجان لڑکی کو

وہ وہیں چھوڑ آیا تھا اسے اپنی حیثیت کا باخوبی اندازہ ہو چکا تھا۔

✧✧✧

''گاڑی ایک جھٹکے سے رکی تھی اور وہ جو اپنی سوچوں میں غلطاں کل کے انہونے واقعات کو یاد کر رہی تھی یکدم ہلکے سے جھٹکے پر اپنی سوچوں سے نکل آئی تھی۔ ٹراماسنٹر سامنا تھا۔ بلیک گلاسز ڈیش بورڈ پر رکھتا گاڑی سے نکل کر وہ اس کی طرف آیا تھا اور گاڑی کا دروازہ کھولا تھا گویا اُسے نیچے اترنے کا کہہ رہا ہو۔

وہ خاموشی سے اتری اور آگے جانے کے لئے قدم بڑھائے بابا سے ملنے کی اُسے بہت بے چینی تھی۔

''ایک منٹ رکو!'' اس کے بڑھتے قدموں کو پیچھے ارشام کی سنجیدہ آواز نے روک لیا تھا۔ وہ رکی مگر مڑی نہیں تھی وہ اس کے ہم قدم آ کر بولا تھا۔

''تم اچھی طرح جانتی ہوں کہ جان محمد آئی سی یو میں تمہارے بابا نے بضد ہو کر تمہاری رخصتی کل رات میرے ساتھ کی تھی حالانکہ میرا خیال یہ تھا کہ ایسی حالت میں تمہیں ان کے پاس ہی رہنا چاہئے۔ ہیلپ کے لئے میں اپنے دو گارڈ بھی چھوڑ دیتا اور یہی تمہاری خواہش بھی تھی مگر وہ نہیں مانے اور اس کی وجہ پتہ ہے کیا ہے؟'' اس کی خاموش سوالیہ نظروں کو اپنی طرف اٹھا دیکھ کر اس نے ایک لمحہ کا توقف کیا اور پھر بولا۔

''اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ چاہتے تھے کہ اگلے روز جب ان کی بیٹی اور داماد ان سے ملنے آئے تو وہ ان کے چہروں پر مسکراہٹ دیکھ سکے ایک باپ کے وہ تمام خدشات جو یہ فیصلہ کرنے کے بعد انہیں لاحق ہیں۔ دور ہو سکے۔ تمہارا یہ اُداس اور روتا چہرہ انہیں پریشان کر دے گا اور میں نے تم سے شادی کا فیصلہ اس لئے نہیں کیا تھا کہ میری جان بچانے والا میرا ماتحت مجھ سے مانگی جانے والی خوشی بھی نہ دیکھ پائے۔ پلیز خود کو تھوڑا (Relax) کرو اور چہرے پر مسکراہٹ لاؤ۔''

باتیں کرتا ہوئے وہ دونوں جان محمد کے کمرے کے قریب پہنچ گئے تھے وہ اسے کیا بتانا اور جتانا چاہ رہا تھا یہ سب سوچنے کا وقت نہیں تھا وہ بس اپنے بابا کو خوش دیکھنا چاہتی تھی اس لئے ہتھیلیوں سے اپنے رخساروں کو رگڑتے وہ مسکراتے ہوئے آگے بڑھی تھی جبھی ارشام نے جلدی سے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھامے کمرے میں داخل ہوا تھا۔ کمرے سے باہر موجود سپاہیوں نے مستعدی سے سلیوٹ مارا تھا اور کمرے میں موجود ناصر جو جان محمد کے قریب کرسی پر براجمان تھا انہیں دیکھ کر جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا تھا ارشام کی جسارت پر وہ حیران ضرور ہوئی لیکن بس چہرے پر پھیکی مسکراہٹ برقرار رکھے ہوئے تھی۔ جان محمد نے دونوں کو ایک ساتھ دیکھا تو اس کے لبوں پر مسکراہٹ اور چہرے پر اطمینان اُترا تھا۔

''کیسی طبیعت ہے اب ان کی؟'' ارشام نے قریب آ کر ناصر سے پوچھا تھا وہ افراح کا ہاتھ چھوڑ چکا تھا جو تیزی سے اپنے باپ کے بیڈ کے قریب جا کر ان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھے انہیں دیکھ رہی تھی چہرہ لاغر اور زرد ہو رہا تھا۔ پیشانی پر پسینے کے قطرے تھے انہیں تکلیف ہو رہی تھی وہ جان گئی تھی۔

''آہم!...... ٹھیک ہیں؟، ڈاکٹر چیک اپ کر کے گیا ہے کچھ میڈیسنز تبدیل کی ہیں۔ نرس ابھی لیکر آتی ہیں۔'' ناصر جو فون پر ارشام کو جان محمد کی حالت کے متعلق بتا چکا تھا اس کے سوال کا مقصد سمجھتے ہوئے افراح کی تسلی کے لئے بولا تھا۔

''بابا آپ ٹھیک ہیں؟'' باپ کی حالت پر

افراح کا گلہ رندھ چلا تھا۔

"آں!...... ہاں میری بچی صاحب بہت اچھے ہیں...... تم! تم ٹھیک ہو ناں؟" جان محمد کے منہ سے بے ربط جملے ادا ہوئے تھے وہ جو کچھ کہنا اور پوچھنا چاہ رہے تھے۔ اپنی طبیعت کے پیش نظر پوچھ نہیں پائے تھے شاید۔

"جی بابا، ارشام واقعی بہت اچھے ہیں، سارے راستے مجھے تسلی دیتے آئے ہیں آپ کے لئے بہت فکر مند تھے۔" افراح باپ کی نظروں سے ان کے سوالات کو جان لیا تھا تبھی انہیں تسلی دی تھی اور اپنا نام اتنی بے تکلفی سے افراح کی منہ سے سن کر ارشام نے یک بارگی اُسے دیکھا تھا اور پھر جان محمد کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

"تم خوش ہو ناں......؟" بسترِ مرگ پر پڑے باپ کو کیا تسلی چاہیے تھی۔ وہ شاید خود بھی سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

"جی بابا! میں بہت خوش ہوں، ارشام نے گھر جا کر سب گھر والوں سے میرا تعارف کروایا اور صورتِ حال کے بارے میں بتایا سبھی بہت خوش یہ سب لوگ بہت اچھے ہیں رات سے میرا بہت خیال رکھ رہے ہیں آپ جلدی ٹھیک ہو جائیں بس دوپہر کو آئیں گے ان کے چچا آپ کی خیریت معلوم کرنے۔" افراح نے باپ کی پھر سے تسلی کروائی تھی بس اسی لئے تو اس نے بھیج تھا اپنی بچی کو رات ہی تا کہ صبح آ کر وہ اُسے تسلی کروا سکے اور موت سے ساری رات اُس بھیک مانگ کر التجائیں کی تھیں کہ بس صبح تک مہلت دے دیں وہ اپنی بچی کا آسودہ چہرہ دیکھ پائے۔

"صاحب آپ بہت اچھے، افراح یہ بہت اچھے ہیں میں انہیں کافی عرصے سے جانتا ہوں بہت نیک اور ایمان دار ہیں اور یہ تمہارا بہت خیال رکھیں گیں۔"

"مجھے...... مجھے یقین ہے۔" جان محمد نے ارشام کو دیکھتے ہوئے آخر میں پھر افراح سے کہا تھا۔ سانسیں اکھڑ رہی تھیں۔ نبض دھیمی ہو رہی تھی مہلت کی گھڑیاں ختم ہو رہی تھیں۔

"صاحب!......" جان محمد نے ارشام کو پکارا تھا جس نے جلدی سے ان کی بات نرمی سے ٹوکتے کہا تھا۔

"آپ مجھے ارشام کہیں پلیز"۔ ارشام کی بات پر جان محمد اکھڑتی سانس کے ساتھ بمشکل مسکرا پایا تھا۔

"ارشام بیٹا! میری بچی تمہارے حوالے اس کا بہت خیال رکھنا اسے ایک گھڑی بھی خود سے جدا نہ کرنا وعدہ کرو بیٹا وعدہ کرو۔" باپ کی بات پر افراح کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے تھے وہ اپنی سسکیاں بمشکل دبا پا رہی تھی۔

"میں وعدہ کرتا ہوں انکل میں ان کا خیال رکھوں گا اور ہمارا یہ رشتہ ہمیشہ قائم رہے گا۔ میں انہیں کبھی تنہا نہیں چھوڑوں گا۔" ارشام نے جان محمد کی آنکھوں کی بجھتی جوت کو جلانے کی کوشش کی تھی اپنے جملوں سے، وہ ان کے بے حد قریب ان پر جھکا ہوا تھا۔

"خا...... خوش رہوں دونوں......!"

"بس ملاقات کا وقت ختم ہوا، موت نے صدا لگائی تھی، جدا ہونے کے سوا چارہ ناں تھا۔

آنکھوں کی جوت بجھ گئی تھی۔ اکھڑتی سانسیں تھم گئی تھیں، ہر سو سفید دھند تھی کوئی تھا جو جان محمد کا نام پکارے اپنے ساتھ اسے لیئے جا رہا تھا کس کی مجال جو قدم پلٹ جائیں اب تو اگلی منزل کی جانب سفر تھا اور حکم تھا تو طے کرنا تھا۔

"بابا...... بابا!؟" افراح باپ کی حالت پر متوحش ہوئی تھی بے اختیار کھلی آنکھوں کو دیکھتے

اس نے اپنے باپ کے کندھے کو ہلایا تھا یہ آنکھیں کھلی تو تھیں لیکن شناخت کہاں گئی تھی یہ تو جیسے افراح کو جانتی بھی نہیں تھیں اس کے بابا اس کو ایسے کیوں دیکھ رہے تھے جیسے ان کے بیچ ہر تعلق ختم ہو چکا وہ جو اس کی ہلکی سی آہ پر بے چین ہو کر اُسے اپنے سینے سے لگا لیتا تھا وہ باپ آج اس کی آہوں، سسکیوں پر متوجہ کیوں نہیں تھا۔

''بابا ایسا مت کریں پلیز کچھ بولیں۔''

سوکھے ہونٹوں اور بہتے آنسوؤں سے اس نے ایک بار پھر اپنے باپ کو ہلاتے ہوئے پکارا تھا۔

ارشام نے غم زدہ چہرے کے ساتھ جان محمد کی آنکھوں پر اپنا ہاتھ رکھ کر آنکھیں بند کی تھیں۔

''نہیں...... نہیں پلیز میرے بابا کی آنکھیں بند مت کریں یہ ایک دفعہ بند ہوگئیں تو میرے اتنا چیخنے پر بھی نہیں کھلیں گیں مت بند کریں انہیں۔''

افراح ارشام کے ہاتھ کو اپنے لرزتے ہاتھوں سے ہٹاتے ہوئے چلائی تھی۔

ارشام کو سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ اسے کیا کہے لیکن اس کی حالت قابلِ رحم تھی وہ بس بے یقینی سے اپنے باپ کو ہلائے جارہی تھی بار بار انہیں اٹھنے کے واسطے دے رہی تھی۔ چہرہ سفید لٹھے کی مانند ہوگیا تھا اس کا۔

''بابا مجھے یوں اکیلا چھوڑ کر مت جائیں میں...... میں کیسے رہوں گی، مجھے رات کے اندھیرے سے بہت ڈر لگتا ہے بابا آپ جانتے ہیں میں بلب جلا کر سوتی ہوں اور اگر لائٹ چلی گئی تو میں کیا کروں گی کون جلدی سے لائٹ جلائے گا بابا اُٹھ جائیں پلیز آپ کی فرو کو بہت ڈر لگ رہا ہے۔''

''سر آپ، آپی کو سنبھالیں!'' ناصر نے دھیرے سے ارشام سے کہا تھا وہ دونوں جان محمد کی وفات پر افسردہ اور افراح کی حالت پر پریشان ہوگئے تھے۔

''خود کو سنبھالو!'' وہ اس کے قریب آکر بس یہی کہہ پایا تھا۔

''وہ جا چکے ہیں، صبر کرو!''۔ اگلے جملے نے جیسے افراح کے حواس چھین لئے تھے۔ وہ زور زور سے چلانے لگی تھی اور بار بار جان محمد کو ہلا کر اٹھنے کا کہے جارہی تھی۔

صبح ڈاکٹر جب جان محمد کا معائنہ کرنے آئے تھے تو انہوں نے ناصر کو جان محمد کی حالت اچھی نہیں کا پتا تھا گاڑی میں بیٹھا ارشام ناصر کا فون سن رہا تھا جب افراح پیچھے چلی آئی تھی ناصر نے انہیں فوراً پہنچنے کو کہا تھا جان محمد آخری بار اپنی بیٹی سے ملنا چاہتا تھا۔

پورا کمرہ افراح کی چیخوں سے گونج رہا تھا ارشام نے اسے آگے بڑھ کر تھامنا چاہا لیکن وہ اپنے حواسوں میں نہیں تھی۔ اس کے ہاتھوں میں وہ مچلی جارہی تھیں اس کے سینے پر کبھی سر مارتی اور کبھی باپ کے بے جان سینے پر سر پٹختی ناصر فوراً ڈاکٹر کو بلا لایا تھا اور ڈاکٹر کے اشارے پر نرس نے انجکشن تیار کیا جو ڈاکٹر نے ارشام کو کہا کہ وہ افراح کو پکڑے تا کہ نرس اسے انجکشن لگا سکے ارشام نے مچلتی افراح کو اپنے دونوں بازوؤں میں جکڑا اور نرس سے فوراً انجکشن لگا دیا تھا جس کے فوری بعد ہی وہ بے جان ہونے لگی اور پھر بے ہوش ہو کر ارشام کی بانہوں میں جھول گئی تھی ارشام نے اس نازک سی گڑیا کو اپنی بانہوں میں اٹھالیا تھا اور نرس کے پیچھے تیزی سے دوسرے کمرے میں لا کر بیڈ پر آرام سے لٹا دیا تھا وہ ایسے لمس سے کبھی آشنا نہیں ہوا تھا۔ عورت ذات سے وہ میلوں دور بھاگتا تھا۔ کجا

کوئی اتنا قریب لٹاتے ہوئے اس کی نظریں اس کے چہرے سے ٹکرائی تھیں۔ بڑی بادامی سی آنکھیں بند پپوٹے سوجھے اور لمبی پلکیں بھیگ کر جڑی ہوئیں چھوٹی لیکن کھڑی سی گلابی ناک جس میں بالکل چھوٹی سی سفید زرقون کی لونگ اور باریک گلابی ہونٹ جو اس وقت سختی سے بھنچے ہوئے تھے بالوں کی موٹی سی چوٹیا جو اس نے ساری ہنگامہ آرائی میں اس کے سینے پر بے ترتیب پڑی تھی اپنے دائیں ہاتھ کو اس کی کمر کے نیچے سے نکالتے ہوئے اس نے عجیب سے احساسات سے دو چار اپنی منکوحہ کو دیکھا تھا اور پھر دھیرے سے اس کے وجود پر سفید چادر گردن تک اوڑادی تھی۔

سینے سے ایک آہ خارج ہوئی تھی اور وہ جان محمد کے کمرے کی جانب پلٹ گیا تھا ناصر کو چند ضروری ہدایات دینے اور چند ضروری فون کرنے کے لئے۔

✧✧✧

کچھ آوازوں سے ارشام کی گہری نیند ٹوٹ گئی تھی کمرے میں ملگجا سا اندھیرا چھایا ہوا تھا سامنے کھڑکی سے چودھویں کا چاند نرم خوشی روشنی ہر سو پھیلائے شاید اس کمرے کی آواز پر ادھر جھانک رہا تھا ارشام کو کچھ احساس ہوا تھا یکدم وہ کرسی پر سیدھا ہو کر بیٹھا تھا۔ سارے دن کی بھاگ دوڑ کے بعد وہ شاید موبائل دیکھتے دیکھتے کرسی پر ہی اونگھ گیا تھا ہر سو خاموشی کا راج تھا بس چند ایک آوازیں تھیں لیکن یہ آواز ان سے مختلف تھی۔

وہ گہری نیند میں تھی اور کراہ رہی تھی ہلکے ہلکے اپنے سر کو دائیں بائیں نفی میں ہلا رہی تھی وہ کچھ بدبدا بھی رہی تھی پھر اس کی کیفیت میں ہیجان نمایاں ہونے لگا تھا اب وہ سر کو پٹخنے لگی تھی وہ کسی کو بے تابی سے پکار رہی تھی۔ ارشام کو کچھ پل سمجھ نہیں آئی کہ وہ کیا کرے۔

"مت جائیں، اندھیرا ہے...... بہت گہرا...... مجھے کنویں میں مت پھینکے مت جائیں!" وہ چلانے لگی تھی اس کی آنکھیں اب بھی بند تھیں لیکن اُس کا لاشعور پوری طرح سے بیدار تھا ارشام تیزی سے اٹھ کر اُس کے قریب آیا تھا۔

"کیا ہوا......؟ سنو! کچھ نہیں ہوا"۔ بے ربط ہو کر وہ بولا تھا وہ کیا کرے اور کیا کہے ایک پل کو اُسے سمجھ نہیں آیا لیکن افراح کی حالت ہیجانی ہوتی جا رہی تھی وہ اپنے ہاتھوں کو بھی پٹخنے لگی تھی جسم کو چھوٹے چھوٹے جھٹکے لگ رہے تھے۔ ارشام نے تیزی سے ایک ہاتھ اس کے سر کے نیچے رکھا تھا جو وہ پٹختے ہوئے لوہے کے بیڈ پر مارنے لگی تھی اور دوسرے ہاتھ سے اس کے دونوں ہاتھوں کو جکڑنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ اس طرح اس کے قابو میں نہیں آرہی تھی دیکھنے پر بے حد خوفزدہ لگ رہی تھی اور کسی شدید کرب میں مبتلا تھی۔

وہ اس سے اپنے آپ چھڑانے کے لئے جیسے زور لگانے لگی تھی ٹانگیں مچل رہی تھیں۔ ارشام نے اپنی ایک ٹانگ اُس کی ٹانگوں پر رکھی تھی وہ اُسے اپنے قابو میں کر کے اُس کے جھٹکے روکنا چاہتا تھا وہ اس کے نازک سے وجود پر چھایا ہوا تھا پر افراح کو اس بات کی خبر تھی ناں ہوش وہ ہذیان میں چلا رہی تھی۔

"مما مت جائیں، بابا کو لیکر مت جائیں، مجھے مت پھینکیں...... میری بات سنیں سنیں......!" وہ پھر چلائی تھی۔

"بس...... شی!...... شی! ریلیکس ہو جاؤ"۔ ارشام نے نرمی سے اُسے جکڑے سرگوشی کی تھی۔

"کوئی نہیں پھینک رہا تمہیں، شی! میں نہیں

چھٹکنے دوں گا تمہیں، بس مجھے پکڑے رکھو۔ بس مجھے پکڑے رکھو ریلیکس! ٹیک اٹ ایزی...... میں ہوں ناں تمہارے پاس"۔ وہ نرمی سے سرگوشیاں کر رہا تھا۔ افراح کی دھونکنی کی طرح چلتی سانس تھمنے لگی تھی اور پھر اس کا سر ایک طرف ڈھلک گیا جسم یکدم بے جان ہو گا تھا ارشام اس کی حالت سے پریشان ہو گیا تھا وہ جلدی سے اسے چھوڑ کر ہٹا تھا اور تیزی سے کمرے سے باہر نکلتا چلا گیا تھا۔

✣ ✣ ✣

"اصل میں یہ نیند آور ادویات کے زیر اثر ہیں ان کے اعصاب بے حد تناؤ کا شکار ہیں اس وجہ سے ان کی یہ حالت ہے ہم انہیں اسی لئے خواب آور ادویات دے رہے ہیں تا کہ ہوش میں آ کر ان کا نروس بریک ڈاؤن نہ ہو جائے جو ان کی جان بھی لے سکتا ہے۔ یہ جس قدر تناؤ کا شکار ہیں انہیں برین ہیمبرج بھی ہو سکتا ہے۔" وہ جو ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر کو فوراً بلا کر لایا تھا اور جس نے بے ہوش افراح کا چیک اپ کر کے کئی بار کہی بات پھر دہرا دی تھی۔ یہ ٹھیک ہیں۔ ڈاکٹر ارشام کو تسلی دیتا ہوا کمرے سے نکل گیا تھا اور پیچھے ہی ڈیوٹی پر موجود نرس بھی ارشام کے سینے سے ایک ٹھنڈی سانس خارج ہوئی تھی اور وہ کرسی پر ڈھیر ہونے والے انداز میں بیٹھ گیا تھا اس کی سوچیں بے ربط تھیں اس ہاتھوں پر ایک نازک سے لمس کا احساس اجاگر ہونے لگا تھا جسے اُس نے اپنی سوچوں کی طرح ہاتھوں کو جھٹک کر دور کرنا چاہا تھا۔ عورت ذات سوائے فریب اور دھوکے کے کچھ نہیں اُس نے خود کو جیسے باور کرانا چاہا اور چاند یہ سن کر اپنی روشنی سمیٹے کھڑکی کے دائیں کونے میں سمٹ گیا تھا۔

✣ ✣ ✣

محبت نارسائی ہے
عذاب ہے۔ جدائی ہے
وہ جس کی خاطر کسی نے چھوڑا سارے زمانے کو
اُس کے حصے میں
آئی تنہائی ہے
محبت نارسائی ہے
عذاب ہے، جدائی ہے۔

رات کے گہرے سناٹے میں وہ اپنے دل کی بات پھر کاغذ کے صفحے پر نظم کی صورت میں اُتار رہی تھی دل بوجھل تھا۔ اُداس تھا اور اِک تانگ تھی جو ختم ہونے کے نام ہی نہیں لے رہی تھی اک لاحاصل کی تلاش تھی اس کے اندر جو اُسے کسی صورت چین نہیں لینے دیتی تھی سوچیں پھر سے اکٹھی ہو کر لانے کا ارادہ رکھتی تھیں۔ جبھی بھاری دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی وہ اس دستک کو بہت اچھی طرح پہچانتی تھی جبھی نم ہوئی آنکھوں کو جلدی سے صاف کرتی رائٹنگ ٹیبل سے اٹھ کر دروازہ کھولنے گئی تھی جانتی تھی کہ اب وہ اس سے بات کئے بغیر نہیں جائیں گے یقیناً انہوں نے درز سے جھانکتی ٹیبل لیمپ کی روشنی دیکھ لی تھی جو اس کے جاگنے کا پتہ دے رہی تھی۔ دھیمے سے اُس نے دروازہ کھولا تھا۔

"ابھی تک جاگ رہی ہوں؟" اتنے سالوں میں ناں وہ اس سوال کو پوچھتے تھکے تھے اور ناں وہ ایک ہی جواب دیتی۔

"جی بھائی! نیند نہیں آ رہی تھی۔"

"ہوں رات کافی ہو گئی سو جاؤں شاباش"۔ دروازے سے باہر کھڑے ہی نرمی اور شفقت سے اُس کے سر پر ہاتھ رکھتے انوں نے ہمیشہ کہا جملہ دہرایا تھا اور اُس نے ہمیشہ کی طرح فرماں برداری سے سر جھکا کر دھیمے سے کہا تھا۔

''جی بھائی جان''

''شب بخیر!'' واپسی مڑتے انہوں نے کہا تھا اور اپنی نوابی چال چلتے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے تھے۔

''شب بخیر!'' ان کی پروقار شخصیت کو پیچھے سے تشکرانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے اس نے جواب دے کر دروازہ آہستہ سے بند کر دیا تھا۔ کبھی کبھی غیر اور انجان لوگ آپ کو رشتوں کی قدر اور اہمیت سکھا دیتے ہیں۔

✦✦✦

''ناصر! میں نے تمہیں کوئی کام کہا تھا۔'' تیز تیز قدم اٹھاتے اس نے اپنے ہم قدم دوست سے استفسار کیا تھا۔

''جی سر ہو گیا ہے وہ آپ کی کمرے میں منتظر ہیں، میں نے ٹریس کر کے اور ساری صورتِ حال سے آگاہ کر دیا تھا۔'' ناصر نے جھٹ جواب دیا تھا۔

''ہوں گڈ......'' وہ ہسپتال کے کمرے میں داخل ہوا تھا جہاں پر اس کی منکوحہ آج تیسرے روز بھی دوائیوں کے زیرِ اثر سو رہی تھی۔ آفس سے فارغ ہو کر وہ سیدھا اِدھر ہی چلا آیا تھا۔ نائلہ اور زبیر بھی وہیں موجود تھے اس کی غیر موجودگی میں نائلہ یا چچا جان ہسپتال میں رہتے تھے ورنہ اس کے آنے کے بعد وہ کچھ دیر بعد چلے جاتے تھے کل تو چچا جان رات یہیں رکنے کا کہہ رہے تھے تاکہ وہ گھر جا کر آرام کر سکے۔ دو راتوں سے وہ یہیں قیام پذیر تھا اور صبح اس کا ماتحت سپاہی استری شدہ اس کی یونیفارم لے آئے تھے اور وہ یہیں سے تیار ہو کر آفس چلا جاتا تھا ناشتہ لنچ، اور ڈنر ہمیشہ گھر سے بن کر آتا تھا۔

''نہیں میں ٹھیک ہوں، ڈاکٹر کہہ رہا تھا یہ جلد ہی سنبھل جائے گی ہم جلد گھر آ جائیں گے، آپ جائیں اور...... ٹھیک ہیں آپ جائیں'' اُس نے نفی میں سر ہلائے اپنے چچا کو جواب دے دیا تھا اور کچھ پوچھتے پوچھتے چپ کر گیا تھا۔

''بھائی جان کو تمام صورتِ حال سے آگاہی ہے تمہارے بارے میں فکر مند ہیں انہوں نے ہی کہا تھا کہ آج رات میں یہیں رک جاؤں اور تم گھر جا کر آرام کر لوں دیکھنا چاہتے ہیں وہ بیٹی کو بھی لیکر تم نے......'' چچا جان کی بات کاٹتے وہ جلدی سے گویا ہوا تھا۔

''نہیں ہم جلد ہی گھر آ جائیں گے مل لیں اس سے۔'' چچا کو کل رات اس نے یہی جواب دیا تھا۔

نائلہ اور زبیر اسے دیکھ کر اپنی جگہ سے اٹھے تھے اور ساتھ ہی صوفے پر نائلہ کے قریب بیٹھی ایک متوسط گھرانے کی ادھیڑ عمر خاتون بھی اسے دیکھ کر اُٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ چہرے کے تاثرات پریشان کن تھے اور آنکھیں روئی ہوئی تھیں۔

''او کے ارشام ہم چلتے ہیں۔'' سلام کا جواب سر کی جنبش سے دے کر وہ خاموش کھڑا رہا تھا ماتھے پر شکن اور آنکھوں میں سنجیدگی تھی زبیر نائلہ کو لئے ارشام سے کہتا باہر نکل گیا تھا جس کا جواب اس نے سر کے اشارے سے ہی دیا تھا نرس اُس کی خبر پا کر مستعدی سے کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

''کیسی طبیعت ہے اب اس کی؟ کوئی Improvement بہتری؟'' نرس سے اُس نے اپنی کیپ اتارتے ہوئے پوچھا تھا۔

جی سر کچھ دیر کے لئے ہوش میں آئی تھیں لیکن پھر چیخنے چلانے لگیں۔ تو ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق انجکشن لگا دیا تھا۔

''ہوں! ڈاکٹر کہاں ہیں؟'' سوال پھر سنجیدگی سے پوچھا گیا تھا وہ اور وہ خاتون ہنوز کھڑے تھے۔

راؤنڈ پر ہیں سر، بس آ ہی رہے ہیں۔'' نرس نے تھوک نگلتے جواب دیا تھا۔

''ٹھیک ہیں آپ جائیں۔'' نرس کو اس نے جواب دیا تھا اور پھر وہ صوفے کے قریب آتے خاتون سے مخاطب ہوا تھا۔

''آپ ایسی آئی جان محمد کے ہمسائے میں رہتی ہیں؟''

''جی جناب ابھی کچھ دیر پہلے وہ ناصر صاحب آئے تھے انہوں نے بتایا سب کچھ اور کہا کہ آپ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔'' قدرے پریشاں اور دکھ بھرے لہجے میں انہوں نے جواب دیا تھا۔

''آپ تشریف رکھیں'' سنگل صوفے پر بیٹھتے ہوئے اس نے ادھیڑ عمر خاتون کو بھی بیٹھنے کا کہا تھا جو وہ جلدی سے بیٹھ گئی تھیں۔

''ناصر سے میں نے کہا تھا کہ وہ تمام صورت حال سے آگاہ کریں آپ شاید جان محمد کے آپریشن کے وقت بھی اس کے ساتھ موجود تھیں۔'' بات کا آغاز کرتے ہوئے اس نے افراح کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا تھا۔

''ہاں جی جب فون پر افراح کو اطلاع ملی تھی اور پولیس گاڑی آئی تھی اسے ہسپتال لیجاتے تب اس نے مجھے ہی سب بتایا تھا اور میں اس اکیلی بچی کو یوں ہسپتال کیسے آنے دیتی اس لئے ساتھ آئی تھی۔ رہتی بھی اس کے ساتھ لیکن میرا سات سال کا پوتا چھت سے گر گیا اور ٹانگ تڑوا بیٹھا بس اس کی پریشانی سے میں دوبارہ آ ہی نہیں پائی اور ناں فون کر پائی وہ تو آج ناصر صاحب گھر آئے اور جان محمد کے انتقال اور تدفین کا بتایا دل بہت دکھی ہے میرا اس بچی کے لئے تن تنہا رہ گئی بھری دنیا میں۔''

خاتون کافی باتونی معلوم ہوتی تھیں ارشام کے نرم انداز سے اب وہ پر سکون ہو کر بولنے لگی تھیں۔

''دیکھیں...... آ...... آپ کو میری اور اس کی شادی کا تو علم ہو چکا ہوگا، انہیں اپنے باپ کی وفات کا بہت صدمہ ہے اور میں ان کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتا یہ تو جو ڈرائیور اس روز میں نے جان محمد کے گھر گاڑی سمیت بھجوایا تھا اس کے گھر والوں کو اطلاع کرنے کے لئے وہی ڈرائیور آج ناصر کو آپ کے پاس لیکر گیا تا کہ ہم اس کے متعلق کچھ جان سکے اس کے کوئی رشتہ دار وغیرہ جس کا آپ کو علم ہو تا کہ ہم انہیں بلوا سکے۔'' اپنی شادی کے متعلق جھجک کر بات کا آغاز کرتے ہوئے ارشام نے پوچھا تھا اور خاتون کو یہاں بلانے کی وجہ بیان کی تھی۔

''آہ! نہیں بیٹے ان کا کوئی رشتے دار نہیں'' ۔خاتون نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے جواب دیا تھا۔

''کوئی رشتے دار نہیں؟'' ارشام نے حیرت سے سوال کیا تھا اور مزید گویا ہوا تھا۔

''ان کی والدہ......؟''

''ارے بیٹا دو سال ہوئے اسے فوت ہوئے کہ باپ بھی اس دارِ فانی سے کوچ کر گیا۔'' وہ خاتون جھٹ بولی تھیں اور پھر بولتی چلی گئیں۔ تقریباً بیس سال سے یہ لوگ اسی محلے میں رہ رہے ہیں اور ہم بھی شروع سے یہی کے مکین تھے کافی آنا جانا تھا جان محمد کی بیوی کا ہماری طرف بیٹی بنایا تھا میں نے اسے اور اس نے بھی ماں کہا نہیں ہمیشہ سمجھا بھی مجھے ایک دوسرے کے دکھ سکھ کے ساتھی ہیں ہم میری چار بیٹیاں اور

ایک بیٹا ہے جان محمد اور اس کی بیوی بانو نے بہن بھائی بن کر ہی بیاہ کئے تھے سب کے بس ایک رات سوئی تھی بانو چنگی بھلی لیکن صبح نہیں اٹھی ماں اور بیوی کی اچانک موت نے باپ بیٹی کو بڑا دکھ دیا تھا بڑی مشکل سے سنبھلی تھی افراح تب بھی بہت بڑا دکھ جھیلا تھا۔ میری بچی نے اور اب باپ کا غم یہ حالت تو ہونی ہی تھی اس کی۔'' خاتون بات کرتے کرتے رو پڑی تھیں۔

''ان کی والدہ یا جان محمد کے بہن بھائی آئی مین رشتے دار وغیرہ۔'' ارشام نے سینے سے سانس خارج کرتے پوچھا تھا۔

''ارے نہیں بیٹا کوئی نہیں ہے ان کا جان محمد بانو کا تایازاد تھا۔ صادق آباد سے آگے کوئی بہت دور گاؤں ہے جہاں کے یہ رہنے والے تھے بس جان محمد کے بھائی کی گاؤں میں کسی سے لڑائی ہوئی اور بات بڑھتے بڑھتے دشمنی تک جا پہنچی۔ دونوں خاندان اس لڑائی کی لپیٹ میں آگئے اور دشمنی نے سب کی جانیں لے لیں۔ افراح سے بڑا پانچ سال کا بھائی تھا اس کا وہ بھی اس دشمنی کی نظر ہوگیا بس کسی نہ کسی طرح بے جان محمد بیوی اور بیٹی کو چھپا کر اور بچا کر یہاں بہاولپور لے آیا یہیں پر پولیس کی نوکری کر لی اور پھر پلٹ کر یہ لوگ اس گاؤں نہیں گئے بعد میں جب دونوں خاندانوں میں صلح ہوگئی تو جو کوئی بچے کچے رشتے دار تھے جان محمد ان سے سال دو سال بعد مل آتا تھا لیکن ناں وہ لوگ ان کے گھر آئے کبھی اور ناں کبھی جان محمد افراح یا بانو کو لیکر گیا بانو میری بیٹی بنی ہوئی تھی۔ سارے دکھ وہ مجھ سے کہتی تھی اُسی نے بتایا تھا مجھے یہ سب جب میں نے پوچھا تھا کہ کبھی ان کے گھر کوئی ان کا رشتے دار آتے جاتے نہیں دیکھا۔'' خاتون نے عادت کے مطابق تفصیل سے جواب دیا تھا اور ارشام بس بھنویں اُچکا کر رہ گیا تھا۔

''ان کی کوئی منگنی یا رشتہ وغیرہ؟'' دل کی کھوج زبان پر چلی آئی تھی اور ارشام کے۔

''نہیں بیٹا ایسا کچھ بھی نہیں ہوا ابھی تو افراح یونیورسٹی پڑھ رہی ہے کہا ضرور ہوا تھا رشتے کے متعلق جان محمد نے مجھ سے لیکن ابھی تک کوئی مناسب رشتہ ملا نہیں بانو کے جانے کے بعد جان محمد بہت پریشان رہنے لگا۔ افراح کی وجہ سے ڈیوٹی پر اُسے دیر ہو جاتی تھی یا نائٹ شفٹ ہوتی تھی تو میں ہی افراح کے پاس آ کر رہتی تھی میرا بیٹا اور بہو بھی بہت خیال رکھتے تھے۔ افراح کا امجد کے لئے یہ پانچویں بہن ہے۔'' خاتون نے جواب دیا تھا۔ اسی دوران افراح کے بے خبر وجود میں جنبش ہوئی تھی وہ نیم غنودہ آواز میں کراہ رہی تھی آواز سن کے خاتون فوراً اُس کے قریب جا پہنچی تھیں۔

''میری بچی کیسے دکھوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تجھ پر مجھے کیا خبر تھی یہ سب کچھ ہو جائے گا وہ منحوس مارے اختر نے ایسی مت ماری اور ہسپتال میں رہتے ہوئے میں تجھ سے غفلت برت گئی، زبیر سے پوچھتی بھی تھی کہ افراح کا فون نہیں آیا کیا بھی تھا اس نے ایک دو بار پر تیرا فون بند تھا۔'' افراح ہوش میں آ گئی تھی اور اب گم صم نظروں سے پہنچاتے ہوئے ان کی بات سن رہی تھی۔

''افراح میری جان میں تیری نانی، نانی نسرین، کیسی ہے میری بچی؟''۔

خاتون نے شفقت سے افراح کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے محبت پاش لہجے میں پوچھا تھا۔

''نانی! نانی نسرین!'' افراح نے آنکھیں جھپکتے اُن کے الفاظ دہرائے تھے وہ اب مکمل

ہوش میں تھی۔ اور پھر دماغ میں یاد کا کوندا لپکا تھا۔

''نانی! نانی بابا...... بابا چلے گئے...... اماں چلی گئیں...... سب چلے گئے...... مجھے چھوڑ گئے...... مجھے چھوڑ گئے سب نانی۔'' افراح روتے ہوئے بولی تھیں اور نانی نسرین نے اسے جھک کر اپنے سینے میں چھپا لیا تھا۔ یہ کافی رقت آمیز منظر تھا وہ دونوں بس روئے چلی جا رہی تھیں۔ کمرے میں داخل ہوتے ناصر کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں تھیں اور پھر ارشام کے اشارے پر ڈاکٹر کو بلانے چلا گیا تھا ڈاکٹر فوراً چلا آیا تھا یقیناً اسے اے۔ ایس۔ پی ارشام کی آمد کی اطلاع مل چکی تھی وہ پہلے ہی ادھر آ رہا تھا۔ کمرے میں داخل ہو کر جب اس نے افراح کو یوں بلکتے دیکھا تو وہ ارشام کی طرف چلا آیا اور بولا۔

''آئی تھنک شی از او کے ناؤ سر (میرا خیال میں اب یہ ٹھیک ہیں جناب) انہیں رو لینے دیں دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا میں کچھ دیر میں آ کر ان کا مکمل چیک اپ کرتا ہوں اگر انہیں اس دوران دوبارہ Yets پڑے تو مجھے فوراً بلا لیجیے گا۔''

''او کے''۔ ارشام نے مختصر جواب دیا اور ڈاکٹر چلا گیا ساتھ ہی ناصر بھی ڈاکٹر کے ساتھ چلا گیا ارشام صوفے پر بیٹھ گیا اس کے چہرے پر سوچ کے گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ کافی دکھ بھری کہانی معلوم ہوئی تھی محترمہ کی ارشام نے دل میں خود سے کہا تھا تو کیا یہ رشتہ ہمدردی کی بنیاد پر استوار ہو سکے گا۔ دل نے پوچھا تھا جواب نفی میں تھا یہ رشتہ محض جان محمد کا احسان چکانے کے لیے اس کی خواہش پر بنا تھا اور بس یہیں تک ہی رہ سکتا تھا ناں اس سے کم ناں اس سے زیادہ سینے سے ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے اس نے بلکتی افراح پر ایک نظر ڈالی اور پھر پھیر لی تھی۔

✧✧✧

نظریں تو وہ بھی پھیر لینا چاہتی تھی اس ظالم اور سفاک حقیقت سے جس کا اسے آج کل سامنا تھا دل غم و غصے کی شدت سے بوجھل اور بے چین تھا یہ بے چینی یہ اذیت اُسے مارے ڈال رہی تھی ''ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟'' بار بار وہ خود سے یہی سوال کرتی تھی اور جواب ناں پا کر اس کی نفرت اور غصہ بڑھنے لگتا تھا اُسے [illegible] پر شدید غصہ تھا جس نے اس [illegible] دی تھی۔

✧✧✧

''آرام سے! وہ آرام سے!'' نائلہ نے افراح کو بیڈ کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھنے میں مدد دیتے ہوئے کہا اور ساتھ ہی اُس کی کمر کے پیچھے تکیہ سیٹ کیا۔

''میں تمہارے لئے جوس بنا کر لاتی ہوں۔ آرام کرو اور رونا بالکل نہیں ہے۔''

جاتے جاتے نائلہ نے انگلی اٹھا کر نصیحت کی تھی جس پر افراح نے پھیکی سی مسکان کے ساتھ ہلکے سے سر ہلا دیا تھا۔

نائلہ کے جاتے ہی ارشام اپنے دھیان میں کمرے میں داخل ہوا تھا۔ اور سامنے بیڈ پر نیم دراز افراح کو دیکھ کر ٹھٹھک گیا تھا۔

''وہ نائلہ بھابی مجھے زبردستی اِدھر لا گئیں میں نے ان سے کہا تھا کہ وہ صوفے پر مجھے بٹھا دیں۔'' افراح کو شاید اس کے دل کی خبر تھی اور اس کی آہٹ پر آنکھیں کھولیں تو جھٹ وضاحت دی وہ اول روز سے اس کمرے میں اور کمرے کے مالک کے دل میں اپنا مقام جان

چکی تھی۔ ساتھ ہی اٹھنے کی کوشش کی وہ صوفے پر جانا چاہ رہی تھی۔ جو صوفہ نما سنگل بیڈ کی طرح کا تھا۔

''ٹھیک ہے ٹھیک ہے، لیٹی رہو میں اِدھر سو جاؤں گا۔'' ارشام ان جلدی سے کہا تھا۔ افراح نے ان سنی کئے بیڈ سے اٹھ کر کھڑی ہوئی اور شدید چکر آنے پر بس گرنے ہی لگی تھی جب دو مضبوط مردانہ ہاتھوں نے اُسے تھام لیا تھا ایک پل دل کی دھڑکن رک گئی تھی اور آنکھوں کے گرد اندھیرا چھا گیا تھا۔ صبیح پیشانی پر ننھے قطرے پھوٹ پڑے تھے۔ ارشام جو افراح کو کچھ سخت جملہ کہنے لگا تھا اس کی حالت دیکھ کر اُسے نرمی سے بیڈ پر بیٹھا دیا تھا اور سائیڈ ٹیبل پر پڑے پانی کے جگ سے جلدی سے گلاس میں پانی انڈیل کر اس کے لبوں کے قریب کرتے بولا تھا۔

''پانی پیو!'' افراح نے دو گھونٹ بھر کر منہ پرے کر لیا تھا۔

''مجھے بات بار بار دہرانے کی عادت نہیں جب میں نے کہہ دیا کہ ادھر سو جاؤں گا تو کیوں اٹھ رہی تھی۔'' لہجے کی سختی پر قابو پائے بولا تھا عورت ذات ہوتی ہی ہٹ دھرم ہے دل میں کہا تھا۔''

''آپ کو اپنے بیڈ کے علاوہ کہیں اور نیند نہیں آتی اس لئے۔'' دھیمے سے جواب دیا تھا اور ارشام اُس کے جملے پر چونک گیا تھا پہلے کے حساسات اُڑنچھو ہو گئے تھے۔ ''اسے کیسے مسلوم ہوا؟'' دل سے پوچھا تھا۔

''اس روز جس طرح بے ترتیب ہو کر آپ یہاں سوئے تھے مجھے اندازہ ہو گیا تھا۔'' دل کی بجائے افراح نے ہی جواب دیا تھا۔ آنکھیں کس سوچ سے بھر آئی تھیں شاید اُسے اپنا گھر یاد آیا تھا۔ ارشام کو اس کے کرب کا ادراک ہوا تھا وہ بھی اس کی طرح ایک اذیت سے دو چار تھی۔ اپنوں کے دور ہو جانے کی اذیت بہت دردناک ہوتی ہے چاہے وہ مر جائیں یا آپ کے لئے زندہ مر جائیں دکھ تو ہوتا ہے ناں۔

''پلیز مجھے وہاں ریسٹ کرنے دیں'' آنسوؤں کو پیتی وہ بولی تھی۔

''ٹھیک ہے آجاؤ''۔ ارشام نے نرمی سے اس کا ہاتھ تھام کر اسے اُٹھنے میں مدد کی تھی۔

''میں خود چلی......''

''میں نے کہا ناں مجھے بات دہرانے کی عادت نہیں''۔ اب کی بار اُس نے نرمی سے ٹوکتے افراح سے کہا تھا اور صوفے پر لا بٹھایا تھا۔ وہ اس سے کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن سمجھ نہیں آ رہی تھی کس طرح کہے دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ ارشام جو افراح کے قریب کھڑا کچھ کہنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جلدی سے دروازے کی طرف بڑھ گیا تھا اور تھوڑا سا دروازہ کھول کر باہر نکل کر اس نے پیچھے دروازہ بند کر دیا تھا۔ شاید وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی افراح کو اس کے بیڈ کی بجائے صوفے پر دراز دیکھے۔ ''کیوں؟'' دل کے سوال کو اس نے یکسر نظر انداز کر کے نائلہ کی طرف دیکھا تھا جو گلاس میں فریش جوس بنا کر لائی تھی۔

''یہ افراح کو پلا دیجیے گا، ڈاکٹر نے کہا تھا کہ وہ کافی کمزور ہو گئی ہے آج کے دن اسے جوس وغیرہ ہی دینا ہے۔ کل سے ہلکی پھلکی نرم غذا۔'' نائلہ نے ٹرے ارشام کی طرف بڑھاتے کہا تھا۔

''جی!'' ٹرے تھام کر وہ پلٹنے کو تھا جب نائلہ نے جھٹ پکارا۔

''وہ ارشام بھائی! تایا جان اور باقی سب گھر والے بھی افراح سے ملنا چاہ رہے ہیں

تعزیت وغیرہ بھی کرنی ہے۔" ارشام کے لئے دیئے انداز کی وجہ سے اس گھر کے سبھی مکین اُس سے خائف ہی رہتے تھے اس لئے نائلہ نے قدرے جھجک کر اپنا مدعا بیان کیا تھا۔

"ابھی رات کافی ہوگئی ہے، ڈاکٹر نے اسے خواب آور دوائی دی تھی وہ اس کے زیر اثر ہے صبح مل لیں سارے۔ میں آتا ہوں کچھ دیر میں پپا کے کمرے۔"

ارشام نے نائلہ سے کہا اور پلٹ گیا تھا جواب سنے بغیر شاید اسے سننے کی ضرورت نہیں تھی نائلہ اثبات میں سر ہلاتی مڑ گئی تھی اس کا پیغام باقی سب کو بتانے جو اس وقت ارشام کے پپا کے کمرے میں ہی موجود تھے باقی سب کون چچا اشفاق، زبیر اور تایا جان باسط۔ چچی رخشندہ اور نور کو کسی اور کو اتنی اہمیت دینا بالکل پسند نہیں تھا وہ تو روز نائلہ وغیرہ کے ہسپتال جانے پر بھی ناک بھوں چڑھاتی تھیں اگر تایا جان کا لحاظ نہ ہوتا تو جو باتیں اسے ڈھکے چھپے انداز میں سنائی جاتی تھیں دو ٹوک انداز میں بیان کی جاتیں کسی پرائی لڑکی کے لئے بھلا اتنا تجل خراب ہونے کی کیا ضرورت۔

"ایک رات موصوف محترمہ کو اٹھا لانے کہ بیوی ہے۔ ابھی نکاح ہوا ہے اور ہم سب مان لیں اور ایک رات اس کی......"

"بس! چپ کر جاؤ" چچا اشفاق نے صبح ناشتے کی میز پر بڑبڑاتی بیوی کو اگلا جملہ کہنے سے باز رکھتے ہوئے خاموش ہونے کو کہا تھا جس کا غصہ انہوں نے میز پر چائے کا کپ پٹخنے نائلہ پر نکالا تھا۔

"اور تم! اگر آج شام تک موصوف اپنی بیمار بیوی کو ہسپتال سے لے آتے ہیں تو ٹھیک ورنہ کل سے تم تیمارداری کے لئے نہیں جاؤ گی حد ہو گئی چوتھا دن ہیں محترمہ میاں صاحب کے ساتھ صبح کی ہسپتال جاتی ہیں اور شام کو پلٹتی ہیں۔ گھر، نوکر چاکر کو دیکھ دیکھ کر میں اکیلی جان ہلکان ہو گئی نور تو بچی ہے کیسے سنبھال سکتی ہے اتنے بڑے گھر کی ذمہ داریاں۔"

"جی!" نائلہ نے دھیرے سے جواب دیا تھا۔

"بیٹا بھائی جان کے کمرے میں ناشتہ بھجوا دیا ہے اور لنچ پیک کر لیا ہے۔"

چچا اشفاق نے نرمی سے نائلہ کو مخاطب کیا تھا۔ بیوی کی تلخ اور تلخ کلام کے آگے انہوں نے اپنے نرم رویے اور جملوں کا بند باندھتے تا تھا جو کبھی تو کامیاب ہو جاتا تھا اور کبھی سیلابی ریلے کے آگے تنکوں کی طرح بہہ جاتا تھا۔

"جی سب کر لیا ہے۔" نائلہ نے فرماں برداری سے مختصر جواب دیا تھا۔

سمیر اور نور ابھی تک سوئے ہوئے ہیں۔" زبیر نے پوچھا تھا سوال ماں سے تھا لیکن جواب بیوی سے موصول ہوا تھا۔

"جی!"

"چلیں پپا!" زبیر نے اثبات میں سر ہلا کر باپ سے پوچھا تھا اور ان کے سر ہلانے پر وہ لوگ ہسپتال جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تھے پہلے وہ نائلہ کو ہسپتال چھوڑتے پھر اپنے آفس جاتے۔

چچی رخشندہ نے نخوت سے سر جھٹکا تھا اور ناشتہ کرنے میں مصروف ہو گئی تھیں۔

نائلہ صبح کی باتیں سوچتی تایا جان کے کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

✦✦✦

ارشام جب کمرے میں داخل ہوا تو وہ دوائی کے زیر اثر بے ترتیب سی سوئی پڑی تھی

اس کا ایک بازو صوفے سے نیچے لٹک رہا تھا۔ اور سر بھی صوفے کے کنارے ڈھلکا ہوا تھا۔

ارشام نے ٹرے قریبی ٹیبل پر آرام سے رکھی اور افراح کو بچوں کی طرح سیدھا کر کے کندھوں سے پکڑے صوفے پر لٹایا اس کی لمبی گھنی پلکوں نے ہلکی سی جنبش کی ناک کی چھوٹی سی لونگ پر اک لہر آئی اور وہ دوسری طرف رخ کیے سوئی رہی ارشام نے اس پر چادر اوڑائی اور خود کمرے سے ملحق وارڈ روب روم میں چلا گیا کپڑے بدلنے فریش ہو کر وہ کمرے کی لائٹس آف کیے اپنے پپا سے ملنے ان کے کمرے میں چلا گیا تھا۔

وہیں پر اس کے نوکر خادم نے کھانا لا دیا تھا اور خود اس کی اجازت پر سرونٹ کوارٹر چلا گیا تھا کھانا کھاتے اُس نے آج کے متعلق چند باتیں بتائیں نانی نسرین سے ملنے والی معلومات باپ کو پہنچائیں تھیں چچا جان بھی ادھر ہی چلے آئے تھے جو کچھ دیر پہلے ہی گئے تھے باسط صاحب نے فون کر کے بلا لیا تھا وہ ارشام سے بہت کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن اس کا سنجیدہ اور لئے دیئے والا انداز کھل کر بولنا نہیں دے رہا تھا انہیں۔

"بیٹا بچی بہت گہرے صدمے میں ہے اور اس کے باپ نے تمہاری جان بچاتے اپنی جان گنوائی ہے، خیال کرنا اس کا۔"

"اسی بات کا تو خیال ہے۔" حسب حال جواب موصول ہوا تھا۔ مزید کچھ کہنے سے انہوں نے خود کو روک لیا تھا۔

اشفاق صاحب نے باپ بیٹے سے کاروبار کے کچھ معاملات ڈسکس کرنے تھے وہ تینوں اسی نوعیت کی گفتگو میں محو ہو گئے تھے۔

"کافی وقت ہو گیا ہے، تھک گئے ہوں گے۔ تین چار دن سے تو ہسپتال تھے۔ جاؤ جا کر آرام کرو تمہیں اپنے بیڈ کے بغیر نیند بھی تو نہ آتی ہسپتال جاگتے ہی رہے ہوں گے۔" باسط صاحب نے جمائی لیتے دیکھ کر ارشام سے کہا تھا۔

"ہاں بھئی، مجھے بھی نیند آ رہی ہے۔" اشفاق صاحب بھی اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

"دوائیاں!......"

"لے لیں ہیں۔ جاؤ جا کر سو جاؤ۔" ارشام کے سوال کو بھانپتے انہوں نے جواب دیا تھا اور ارشام اٹھ کھڑا ہوا تھا اور پھر اپنے کمرے میں داخل ہوا تھا ابھی وہ چند قدم آگے بڑھا تھا جب اُسے اچانک افراح کی ہلکی سی چیخ سنائی دی تھی وہ جلدی سے اس کی طرف پلٹا تھا۔

"بابا لائٹ چلی گئی ہے، اندھیرا ہے...... لائٹ آن کریں۔ مجھے سانس نہیں آ رہی...... بابا لائٹ آن کریں۔" وہ صوفے پر بیٹھی چلائی تھی ارشام نے تیزی سے سوئچ بورڈ کے پاس جا کر لائٹ آن کی تھی وہ زور سے آنکھیں میچیں ہوئی تھی اور بس ایک ہی بات کہے جا رہی تھی۔

"بابا لائٹ آن کریں۔"

"آنکھیں کھولو، لائٹ آن کر دی ہے۔" ارشام قریب آ کر بولا تھا اس کی آواز پر اس نے جھٹ آنکھیں کھولی تھیں اپنے سامنے باپ کی بجائے ایک لمبے چوڑے جوان کو پا کر چکراتے سر کے ساتھ اس نے اِدھر اُدھر متلاشی نظروں سے دیکھتے پوچھا تھا۔

"بابا کدھر ہیں؟ میرے بابا کدھر ہیں؟"

ارشام نے اپنے لبوں پر زبان پھیرتی تھی اس سوال کا وہ کیا جواب دیں اسے سمجھ نہیں آیا تھا پہلی بار اُسے اپنے سامنے موجود لڑکی پر ترس آیا تھا وہ کسی معصوم ڈرے سہمے بچے کی مانند نظر آ رہی تھی۔ ارشام صوفے کے ایک کونے پر ٹکتے اس سے مخاطب ہوا تھا۔

"تمہارے بابا اب اس دنیا میں نہیں ہیں"۔

"نہیں...... نہیں۔" اس جواب پر وہ نفی میں سر ہلانے لگی تھی بڑی گہری آنکھیں متوحش ہرنی کی طرح وحشت زدہ ہو کر مزید پھیل گئیں تھیں۔

"دیکھو اس سچائی کا سامنا کرو اور یہی سچ ہے جتنی جلدی سچ کو مان لوگی اذیت سے نکل جاؤ گی اگر حقیقت سے نظریں چراتی رہو گی تو جی نہیں پاؤ گی"۔ اپنے تجربے کی بناء پر وہ بولا تھا۔

اُس کی بات پر وہ مزید وحشت زدہ ہو کر اپنے ہاتھوں کو اپنے گھٹنوں پر مارتی مسلسل سر کو نفی میں ہلائے جا رہی تھی ارشام کو اس کی کیفیت پر غصہ آ گیا تھا جبھی اس نے سختی سے اُس کے دونوں کندھوں کو تھام کر کہا تھا۔

"فوت ہو گئے ہیں وہ، فوت!۔"

"تمہارے ماں باپ اب اس دنیا میں نہیں رہے تم اس دنیا میں اپنے والدین کے بغیر جیوں گی یہی سچ ہے مان لو اور جان لو۔" ارشام اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بولا تھا کبھی کبھی پاؤں میں چبا تو کیلا کانٹا یا کانچ کی کرچی کھینچ کر نکالنی پڑتی ہے اُس وقت درد تو بہت ہوتا ہے لیکن جو تکلیف یا جو چبھن وہ کانٹا یا کرچی مسلسل دے رہے ہوتے ہیں نکال دینے پر وہ ختم ہو جاتی ہے ارشام اس کی یہ تکلیف یہ کرچیں کھینچ کر نکال دینا چاہتا تھا۔

"تت..... تمہاری جان بچاتے ہوئے میرے باپ نے اپنی جان دے دی؟ اک پل کو بھی میرا نہیں سوچا، اپنی جان دے دی۔" افراح نے روتے ہوئے ارشام سے کہا پہلی بار وہ اُس سے یوں مخاطب ہوئی تھی لاوے کو نکلنے کا راستہ چاہیے تھا۔

اپنی جان دے دی اپنا فرض پورا کیا اپنی ڈیوٹی نبھاتے ہوئے شہید ہو گئے تم جیوں گی اس فخر کے ساتھ کہ تم ایک شہید باپ کی بیٹی ہو یوں رو رو کر خود کو ہلکان کر کے ان کی اگلی زندگی دوبھر نا کرو۔ انہیں اذیت سے دوچار نا کرو خود کو اذیت میں مبتلا کر گئے۔" اور یہ راستہ ارشام کے جملوں سے دے دیا تھا۔

"ارشام میرے بابا شہید ہو گئے"۔

اچانک ارشام کے ہاتھوں کی گرفت جو اس کے ہاتھوں پر ڈھیلی پڑ گئی تھی اس کے ہاتھوں سے اپنے ہاتھ آزاد کراتے وہ اس کشادہ سینے میں منہ دیئے اس کے گریبان کو اپنے ہاتھوں سے پکڑے بچوں کی طرح بلکنے لگی تھی ارشام اس صورتِ حال کے لئے تیار نہیں تھا پہلی بار افراح نے اس کا نام لیا تھا۔

ارشام اپنی کیفیات پر قابو پائے اسے رونے دیا تھا کبھی کبھی آپ کو ایک کندھے کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ تنہائی کا احساس آپ کے غم کو مزید بڑھا دیتا ہے اور وہ غم آپ کے لئے ناقابلِ برداشت ہوتا چلا جاتا ہے ایسے میں جب آپ کو کسی غم گسار کا کندھا میسر آ جائے تو آپ اس غم کا سامنا بھی کر سکتے ہو اور سہہ بھی سکتے ہو۔ ارشام ایسے احساسات سے باخوبی واقف تھا کتنی راتیں وہ یونہی تڑپ کر رویا تھا کسی کی جدائی پر لیکن اپنا غم اسے خود سے ہی بانٹنا پڑا تھا تب یہ غم روگ کی صورت اختیار کر کے آپ کے اندر ڈیرے ڈال کر آپ کو پتھر کا کر دیتا ہے ایسا پتھر جو روئے بھی تو آنکھ سے آنسو نہ چھلکے وہ ایسا ہی بن چکا تھا لیکن وہ اس لڑکی کو ایسا پتھر کا بت بنتا نہیں دیکھنا چاہتا تھا اور "کیوں" اس اہم سوال کی طرف اس کے دل کا دھیان ہی نہ گیا تھا

اور ارشام نے بھگنے دیا تھا اپنا گریبان و سینہ بھی ایک لڑکی کے آنسوؤں سے عورت ذات سے شدید نفرت کرنے کے باوجود۔

✦✦✦

جاب اتنی ڈسپلن والی ہے لیکن موصوف کی اپنی زندگی کافی بے ترتیب سی معلوم ہوتی ہے۔ بیڈ پر آڑا ترچھا بے خبر سوئے ارشام پر اک نظر ڈالتے اُس نے کمرے پر بھی طائرانہ نگاہ ڈالی تھی اور دل میں سوچا تھا رات نہ جانے وہ کب روتے روتے ارشام کے سینے کے ساتھ لگی سوگئی تھی رات کی باتیں اس کی شعور میں مبہم خاکے کی طرح تھیں کچھ خواب سی نہ جانے حقیقت تھی یا خواب دوائی کے زیرِ اثر اس کا شعور واضح آگاہی نہیں رکھتا تھا وہ بیدار ہو چکی تھی اور سوچ رہی تھی کہ کیا کریں سر میں درد ہو رہا تھا اور بھاری بھی تھا ہمت کر کے اٹھی تھی کافی نقاہت محسوس کر رہی تھی اور واش روم کی جانب قدم بڑھائے تھے اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی وہ فریش ہونے کے لئے واش روم چلی گئی تھی جو کشادہ کمرے کی طرح کافی کشادہ تھا اور کمرے کی طرح یہاں پر بھی بے ترتیبی پھیلی وضو کر کے وہ کمرے میں آکر جاء نماز ڈھونڈنے لگی تھی کہیں ناں پا کر اس نے کپڑوں کی الماری کا ایک پٹ کھولا تھا جو کمرے سے ملحق وارڈ روب تھا ایک چھوٹا سا کمرہ اور پھر اس کے تو آگے واش روم۔

''کیا کر رہی ہو یہاں؟'' اس کے یوں اچانک پیچھے آکر پوچھنے پر وہ ڈر کر بری طرح اُچھل پڑی تھی جس کی وجہ سے اس سے ہی ٹکرائی تھی بے اختیار ہی کندھوں سے تھاما تھا اس نے۔

''کیا تلاش کر رہی ہو؟'' انداز میں تفتیش نمایاں تھی۔

''وہ...... جائے نماز، مجھے نفل پڑھنے تھے''۔ تھوک نگلتے ہوئے بولی تھی اور اپنے کندھوں کو خفیف سی جنبش دی تھی جو ابھی تک اس کے بھاری ہاتھوں تلے دبے ہوئے تھے اور اک ہونے پر ارشام نے فوراً اپنے ہاتھ اس کے کندھوں پر سے اٹھائے تھے۔

''ہٹو یہاں سے میں دیتا ہوں''۔ ماتھے پر تیوری چڑھی تھی وہ مڑی لیکن وہ لمبا چوڑا نوجوان اُس کے نازک وجود کے لئے تمام راہیں مسدود کئے کھڑا تھا نظریں اٹھیں اور پھر جھکیں تھیں۔

''ہٹو بھی!'' الماری کے پٹ کو جھٹکا دیتے ہوئے وہ کوفت زدہ ہوا تھا اور وہ جو پٹ کے ساتھ لگی کھڑی تھی دھکا لگنے پر سیدھا اس کے سینے سے جا ٹکرائی تھی کرنٹ کھا کر وہ ایک طرف ہٹا تھا اور وہ گلابی چہرہ لئے کمرے میں چلی آئی تھی جائے نماز صوفے پر رکھے وہ پلٹ گیا تھا اور جا کر سو گیا تھا۔ وہ ہمیشہ تکیہ نیچے لئے الٹا لیٹ کر بیڈ کی چوڑائی رخ سوتا تھا۔

''عجیب شخص ہے اتنی کچی نیند کے ہلکے سے کھٹکے پر کھل جائے اور پھر دوبارہ ایک اتنی گہری نیند میں سو جائے''۔ نوافل ادا کر کے اپنے والدین کی ایصالِ ثواب کی دعا کر کے اس نے سوئے ارشام کو دیکھا تھا ''ابھی پتہ نہیں تمہیں اس کی کتنی عجیب باتیں پتہ چلے گیں''۔ دل نے سرگوشی کی تھی اور وہ جس خاموش سی جائے نماز پر بیٹھی اس کے نقش و نگار پر اپنی انگلی پھیرنے لگی تھی سوچیں اس کی زندگی کی طرح بے مہار ہو گئیں تھیں۔

✦✦✦

محسنؔ ہمارے ساتھ بڑا حادثہ ہوا
ہم رہ گئے، ہمارا زمانہ چلا گیا

''ارے ناشتہ تو آرام سے کرو نایاب!''

جلدی جلدی چائے کے سپ بھرتے دیکھ کر وہ ٹو کے بنا رہ نا پائی تھیں۔

"بھابھی بہت دیر ہو گئی ہے یونیورسٹی سے۔" اس نے بڑا سا سلائس کا ٹکڑا منہ میں ڈالا تھا جسے نگلنے کے لئے پھر سے چائے کا گھونٹ بھرا تھا اور گرم گرم چائے نے پھر اسے اندر سے جلایا تھا زبان سے "سی" بے اختیار نکلا تھا۔

"چہ! آرام سے! رات پھر دیر تک جاگتی رہی ہو۔" بے اختیار ٹوکتے ہوئے انہوں نے پوچھا تھا۔

ان کے سوال کے پسِ منظر کو جانتے ہوئے اس نے نظریں چرائی تھیں۔

"سلمان بھائی واک پر گئے ہیں؟" ان کے سوال کو اپنے سوال سے ٹالا تھا جو وہ جان گئی تھیں تبھی ناراض نظروں سے دیکھا تھا اور اثبات میں سر ہلایا تھا۔

"مت جاگو کرو رات رات بھر، ناں جلایا کرو خود کو شمع کی طرح۔"

"جی!" جھٹ فرماں برداری ظاہر کی تھی اس موضوع سے ہٹنے کے لئے۔

"اچھا جاؤ دیر ہو رہی ہے تمہیں یونیورسٹی سے" اسے نظریں چراتے دیکھ کر انہوں نے گویا اس کی جاں خلاصی کر دی تھی اور وہ فوراً اٹھ کر گاڑی کی چابی اور بیگ سنبھالے پورچ کی جانب بڑھتی چلی گئی تھی۔

"کتنی پیاری اور پروقار سی شخصیت ہے اس کی لیکن نصیب اتنے ہی خراب۔" پیچھے سے دیکھتے ہوئے اسے انہوں نے توس کا کونہ کترتے ہوئے سوچا تھا اور پھر انگلش اخبار کو پڑھنے میں محو ہو گئی تھیں۔

❖❖❖

وہ اسے لیکر اپنے پپا کے کمرے میں آیا تھا اندر سے وہ خاص خائف تھی ابھی تک وہ اس گھر کے مکینوں سے مکمل تعارف نہیں رکھتی۔ ماسوائے نائلہ بھابھی، زبیر بھائی اور چچا اشفاق کے تعارف تو وہ اُس شخص سے بھی نہیں رکھتی تھی جسے تقدیر نے اس کا شوہر بنا ڈالا تھا۔

"اسلام علیکم!" نظریں جھکائے اس نے سلام کیا تھا مسلسل اتنے دنوں سے پہنا اس کا سیاہ لباس شکن آلود اور ملجگا تھا۔ لاشعوری طور پر اس نے اپنے ہاتھ سے شکنیں دور کرنے کی کوشش کی تھی وہ ارشام کے پپا سے ملتے ہوئے بہت گھبرائی ہوئی تھی۔ نوافل ادا کر کے وہ جانے کتنی دیر وہیں بیٹھی رہی تھی جب وہ نہا دھو کر فریش سا سفید قمیض شلوار پہنے اس کے قریب آیا تھا گھنے سلکی بالوں سے پانی کے قطرے نمایاں تھے اس کے دراز کی طرح "پپا تم سے ملنا چاہ رہے ہیں چلو۔" وہ بہت سٹریٹ فارورڈ تھا لگی لپٹی بغیر اور سیدھا مدعا پر آ کر بات کرنے کا عادی تھا۔ کیسی ہو، طبیعت کیسی ہے جیسی اخلاقیات نبھانا اُسے شاید پسند نہیں تھا یا پھر اس کیس اتھ یہ سب کرنا پسند نہیں زبرستی گلے پڑا ڈھول بجانا پڑ رہا تھا اُسے وہ خاموشی سے اُٹھ کر اس کے پیچھے ہولی تھی یہ بالائی منزل تھی اپنے کمرے کے دوسرے کونے کے کمرے کی جانب رخ تھا پیچھے دیکھے بغیر وہ کمرے میں داخل ہوا تھا اور آگے بڑھ کر ڈبل صوفے پر جا بیٹھا تھا جہاں میز پر ناشتے کا سامان لگا ہوا تھا۔

"وعلیکم السلام!" ایک بھاری گھمبیر آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی تھی کسی نے اُٹھ کر اس کے سر پر دستِ شفقت نہ رکھا تھا بس بستر پر بیٹھے بیٹھے سلام کا جواب دیا تھا افراح کا دل ڈوبا تھا۔

"تو میں باپ بیٹے کے لئے ناپسندیدہ ہوں۔"

''ادھر میرے پاس آؤ بیٹی!'' بیڈ پر بیٹھی شخصیت نے پکارا تھا اور اس نے یک بارگی جھکی پلکیں اٹھائی تھیں وہ ایک پروقار نرم خو شخصیت کے مالک تھے پہلا تاثر اس پر یہی پڑا تھا جو اس کی جانب دوستانہ مسکراہٹ سے دیکھتے ہوئے اُسے اپنے قریب بیڈ پر بیٹھنے کا اشارا کر رہے تھے۔

''خادم کافی ٹھنڈی ہو چکی دوبارہ بنا کر لاؤ۔'' چائے کی پیالی پرچ میں پٹختے ہوئے اس نے فون پر کسی سے کہا تھا۔

''اتوار کے روز تو ناشتہ آرام سے کیا کرو''۔ انہوں نے جلد جلد کھانے پر ارشام کو ٹوکا تھا جس نے سنی ان سنی کر دی تھی۔

''معافی چاہتا ہوں بیٹا، میں اُٹھ کر تمہارا استقبال نہیں کر سکتا۔''

انہوں نے اپنی بے جان ٹانگوں کو دیکھتے ہوئے کہا تھا اور افراح جلدی سے ان کے پاس آ کر ایک کونے پر ٹک کر بیٹھی گئی تھی۔

''میں ارشام کا پپا باسط حسین ہوں، تمہارا کیا نام ہے؟''

بات کا آغاز کرتے ہوئے پوچھا تھا۔

''افراح! افراح جان محمد''۔ دھیمے سے وہ بولی تھی۔

''افراح! بڑا پیارا نام ہے کیا مطلب ہے اس کا؟'' انہوں نے نام دہراتے ہوئے نرمی سے پوچھا تھا ارشام دونوں سے لاتعلق ناشتہ کرنے میں مصروف تھا لیکن کان اِدھر ہی لگے ہوئے تھے۔

''خوشیاں دینے والی!'' نظریں جھکائے وہ بولی تھی۔

''ارے واہ جتنا پیارا نام ہے اتنا ہی پیارا مطلب بالکل ٹھیک نام ہے تمہارا اس گھر میں خوشیاں ہی تو لیکر آئی ہو میری بہت خواہش تھی کہ یہ گدھا شادی کرے لیکن یہ آہ! مانتا ہی نہ تھا میں بہت خوش ہوں تم دونوں کی شادی پر۔'' وہ خوش ہوئے بولے تھے افراح کو وہ پسند آئے تھے جتنا وہ ان سے ڈری ہوئی تھی اب اتنی ہی پرسکون تھی۔

اس دوران خادم حسین دروازے پر ناک کرتا ہوا گرم گرم چائے کی کیتلی لئے حاضر ہوا تھا اور مودب انداز میں ارشام کے قریب جا کر رکھ دی تھی۔

''خادم حسن!'' باسط صاحب نے اسے پکارا تھا۔

''جی سر!'' وہ مودب ہوا تھا۔

''اشفاق سے کہنا اپنی ساری فیملی کیساتھ میرے کمرے میں پندرہ منٹ بعد آجائے افراح کا ان سب سے تعارف کروانا ہے تب تک یہ ناشتہ کر لے''۔ باسط نے خادم حسین سے کہا تھا اور وہ ''جی سر'' کہتا ہوا پلٹ گیا تھا۔

''باتیں پھر ہوتی رہے گی تم پہلے ناشتہ کر لو جاؤ شاباش''۔ انہوں نے افراح سے نرمی سے کہا تھا اور وہ اٹھ کر ارشام کی طرف سنگل صوفے پر آن بیٹھی تھی بھوک سے اس کا برا حال تھا کافی نقاہت محسوس کر رہی تھی جبھی ناشتے میں مگن اور اس سے لاتعلق ارشام نے خاموشی سے جوس کا گلاس اس کے قریب میز پر رکھا تھا وہ اس کی جھجک کو محسوس کر رہا تھا اس سے زیادہ دیر تک وہ لاتعلقی رہ نہیں پاتا تھا جان محمد سے کیا وعدہ اس نے نبھانا تھا باسط صاحب سائیڈ ٹیبل پر موجود شہاب نامہ پڑھنے میں مگن ہو چکے تھے۔

ناشتے سے فارغ ہوتے ہی دروازے پر دستک ہوئی تھی وہ بس آدھا سلائس اور جوس ہی پی پائی تھی بھوک ہونے کے باوجود اُس سے کچھ کھایا پیا نہیں جا رہا تھا بابا۔ اماں بابا بہت یاد آ رہے تھے پھر سے اُسے۔

"آجائیں"۔ باسط صاحب نے جھٹ کہا تھا اور وہ سبھی لوگ کمرے میں باری باری داخل ہو کر اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے تھے یہ بھی کافی کشادہ کمرہ تھا جس میں صوفے اور کرسیاں موجود تھیں۔

"یہ اشفاق ہے مجھ سے چھوٹا میرا بھائی کہنے کو یہ میرا چچا زاد ہے لیکن میرے سگے بھائیوں سے بڑھ کر ہے میں اس کا احسان مند ہوں اور مرتے دم تک رہوں گا۔" باسط صاحب نے تعارف کا آغاز اشفاق چچا سے کیا تھا جو ان کے قریب ہی بیٹھے تھے۔

"شرمندہ نہ کریں بھائی جان" وہ جلدی سے بولے تھے افراح نے ایک نظر انہیں اٹھا کر دیکھا تھا۔

یہ ان کی نصف بہتر رخشندہ بھابھی ہیں اور کتنے سالوں سے اس گھر کے نظام کو خوش اسلوبی سے سنبھالے ہوئے ہیں۔" باسط صاحب نے باقاعدہ رخشندہ چچی سے تعارف کروایا تھا جنہوں نے اپنے چہرے پر زبردستی کی مسکراہٹ لانے کی کوشش کی تھی۔

"یہ ان کا بڑا بیٹا زبیر اور یہ اس کی بیوی نائلہ ہیں۔ یہ زبیر اور نور سے چھوٹا میر اور یہ ہماری لاڈلی نور ہے یقیناً تم ان سب کے ساتھ جلد ہی گھل مل جاؤ گی زبیر اشفاق کے ساتھ کاروبار دیکھتا ہے۔ سمیر سیل فون نائلہ گھر کے معاملات دیکھتی ہے اور نور فیشن کے معاملات۔" باسط صاحب نے شرارتی انداز اپنایا تھا۔

"تایا جان!" سمیر اور نور کی جانب سے یک زبان احتجاج بلند ہوا تھا۔

"اچھا بھئی سمیر نے میٹرک کیا ہے اور نور نے بی۔اے۔"

"اور میں ارشام کا پپا ہوں باسط حسن۔"

"جی آپ نے بتایا تھا۔" افراح نے جھٹ کہا جس پر وہ مسکرائے تھے۔

"اور یہ ارشام حسین ہے، اے۔ایس۔پی ارشام حسین۔ میرا بیٹا اور تمہارا شوہر اسے صرف اپنی نوکری سے محبت ہے اس کا شوق، اس کا جنون سبھی کچھ اس کی نوکری ہے۔ اخروٹ کی طرح ہے باہر سے سخت اور اندر سے نرم"۔ ان کا انداز شرارت لئے ہوئے تھا جس پر سب مسکرانے لگے تھے ماسوائے ارشام کے جو اپنے سیل فون پر مصروف تھا۔

"تمہارے والد کا سن کر بے حد دکھ ہوا، میں ان کا تمام عمر احسان مند رہوں گا کہ انہوں نے اپنی ہیرے جیسی بیٹی میرے پتھر دل بیٹے کو دے دی میں تم سے ہسپتال ملنے آنا چاہتا تھا اور رات بھی تعزیت کرنا چاہتا تھا لیکن ارشام نے کہا تھا تم جلد ٹھیک ہو کر آجاؤ گی تم خود کو اب اس گھر کا ایک فرد ہی سمجھو کبھی خود کو تنہا نہ سمجھنا میرے لئے تم بہو سے زیادہ بیٹی ہو۔ جاؤ شاباش آرام کرو بہت بڑے صدمے سے گزر رہی ہو اللہ تمہیں صبر جمیل عطا کرے اور تمہارے والدین کو جنت میں اعلیٰ درجہ عنایت کرے جاؤ شاباش"۔ گفتگو سمیٹتے ہوئے انہوں نے کہا تھا اور افراح جس کی آنکھیں ماں باپ کے ذکر پر چھلکنے کو تھیں پلکیں جھپکنے لگی ارشام پہلے ہی کمرے سے نکل گیا بغیر کسی سے کچھ کہے اور بتائے۔

"آؤ افراح تمہارے کمرے میں چلتے ہیں۔" نائلہ نے باسط صاحب کی اشارے پر آگے بڑھتے ہوئے افراح سے کہا جو جلدی سے اُٹھ کر کھڑی ہوئی تھی اور سب کو خدا حافظ کہتی ہوئی نائلہ کے ساتھ کمرے سے نکل گئی تھی رخشندہ اور نور کی نظروں میں اس کے لئے کاٹ تھی جو انہوں نے جھوٹی مسکراہٹ کو چہرہ پر سجا

کر چھپا لیا تھا سمیر کی نظریں ضرورت سے زیادہ چمک رہی تھیں۔

✧✧✧

''آپ کی مما کہاں ہیں؟'' وہ جو کوئی ضروری فائل لینے کے لئے عجلت سے کمرے میں داخل ہوا تھا افراح نے پوچھا تھا وہ سارے راستے کمرے تک آتے آتے یہی سوچتی آئی تھی کہ انکل نے ارشام کی مما کے بارے میں تو کچھ نہیں بتایا وہ جب سے آئی تھی انہیں دیکھا بھی نہیں تھا وہ کہیں گئی ہوئی تھیں یا خدانخواستہ......

اپنی انہیں سوالوں کو سوچتے بے ساختہ وہ ارشام سے پوچھ بیٹھی تھی جو اس کا سوال سن کر بے حد غصے سے مڑا تھا۔

''کیوں تمہیں کوئی کام ہے ان سے؟'' جملے کو چباتے ہوئے غرایا تھا افراح اس کی تیوری دیکھ کر ششدر رہ گئی تھی اس نے تو بس یونہی پوچھا تھا آخر اس میں اس قدر بھڑکنے والی کونسی بات تھی اس نے قدم پیچھے ہٹتے ہوئے نفی میں سر ہلایا تھا۔

''نہیں میں نے تو بس یونہی......''

وہ جو اسے سخت سست سنانے کے انداز میں آگے بڑھا تھا سیل فون کے بجنے پر تیزی سے کال رسیو کرتا باہر نکل گیا تھا۔

''جی سر فائل مل گئی ہے میں بریف کرتا ہوں۔'' آخری جملہ افراح کے کانوں میں اس کا ٹکرایا تھا وہ سینے سے سانس خارج کرتی صوفے پر جا بیٹھی تھی خود کو کافی مس فٹ محسوس کر رہی تھی یہاں وہ نہا کر فریش ہونا چاہتی تھی اتنے دنوں سے یہی سوٹ زیب تن کر رکھا تھا مگر اس کے پاس ناں اُس کے کپڑے تھے ناں اس کی چیزیں۔

نہ جانے کتنا وقت گزر گیا تھا وہ اپنی سوچوں میں غلطاں صوفے پر اوپر پاؤں کیے بیٹھی تھی جب وہ دوبارہ کمرے میں آیا تھا اور اسے یوں گم صم چپ چاپ بیٹھا دیکھ کر بیڈ کے سائیڈ ٹیبل کی طرف بڑھ گیا تھا۔

''یہ لو!'' اس نے اسے متوجہ کرتے ہوئے کہا تھا اُس کی آواز پر وہ اچھل ہی پڑی تھی وہ اپنی سوچوں میں اس قدر گم تھی کہ اس کی آمد کی خبر بھی ناں ہوئی تھی اسے۔

''تمہارا سیل فون ہسپتال کے کمرے میں ملا تھا''۔ فون اس کی جانب بڑھاتے اس نے کہا تھا اور اس نے خاموشی سے پکڑ لیا تھا یقیناً چارج نہ ہونے کی وجہ سے وہ بند پڑا تھا۔ وہ واپس اپنے آفس ٹیبل کی جانب مڑ گیا تھا جو کہ کافی بڑا تھا اور اس پر ہر چیز بے ترتیب پڑی تھی لیپ ٹاپ، فائلیں، کتابیں اور نہ جانے کیا کیا ٹیبل کے پیچھے بڑی سی بک شیلف تھی جس میں کافی کتابیں موجود تھیں اس نے اس کی چوڑی پشت کو ایک نظر دیکھا اور پھر نظریں جھکا لیں۔

دروازے پر دستک ہوئی تھی۔

''آجاؤ'' مصروف انداز میں کہا گیا تھا۔

''سر جی کھانا بن گیا ہے آپ سب کے ساتھ نیچے کھائیں گے یا یہیں پر۔'' خادم حسین نے تھوڑا سا دروازہ کھولے باہر کھڑے ہی پوچھا تھا۔

''یہیں لے آؤ۔'' مصروف سے انداز میں جواب دیا تھا اور کچھ دیر بعد ہی خادم حسن ایک ٹرالی میں کھانا سجائے حاضر تھا۔ دروازے پر دستک دے کر اندر آنے کی اجازت پا کر وہ ٹرالی افراح کے قریب پڑے میز کی طرف لے آیا تھا۔

''جا سکتے ہو''۔ حکم سنتے ہی وہ فوراً کمرے سے نکل گیا تھا۔

"یہ میرا کافی پرانا ملازم ہے پانچ سال ہو گئے ہیں مجھے یہ جاب کرتے تب سے یہ میرے پاس ہے۔" یہ پہلا تعارف یا جملہ تھا جو اس نے سنگل صوفے پر اس کے قریب بیٹھتے ہوئے اپنے متعلق کہا تھا وہ جو ملازم کی آمد پر سمٹ کر جھٹ اپنے سر پر دوپٹہ جمائے بیٹھی تھی اس کی بات پر خاموش رہی تھی سالن کے باؤل کا ڈھکن اٹھاتے ہی اس کی تیوری چڑھی تھی اور جھٹ سیل فون پر اس نے کال ملائی تھی۔

"خادم حسین یہ کریلے گوشت کیوں بنایا ہے آج لیکر جاؤ اسے۔"

تو گویا میری اس کی پسند بھی جدا جدا ہے کریلے گوشت بھلا کسے پسند نہیں اس نے سوچا تھا۔ ڈش کا نام سن کر افراح کو بھوک ستانے لگی تھی صبح کا بس ایک گلاس جوس پیا تھا اور ایک توس کھایا تھا۔

"سر یہ لیں، ماش کی دال میں نے بنا دی تھی آپ کے لئے ٹرالی باجی پروین نے سیٹ کی تھی آپ کے لئے ماش کی دال رکھنا بھول گئی۔" خادم حسن نے جلدی سے آکر اپنی صفائی دیتے ہوئے ایک چھوٹا باؤل اس کے پاس میز پر رکھا تھا۔

"رخشندہ چچی نے بنوایا ہے یہ کریلے گوشت؟" ارشام نے پوچھا تھا۔

"جی سر" خادم نے مختصر جواب دیا تھا اور اس کے سر کے اشارے پر کمرے سے نکل گیا تھا اس کے کشادہ ماتھے پر بل نمودار ہوئے تھے۔

"کھاؤ جی کھاؤ" افراح سے کہا گیا تھا اور اسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ اپنی پسندیدہ ڈش کھائے یا اس کی پسندیدہ دال ماش" بھلا کریلے گوشت چھوڑ کر دال ماش کون کھاتا ہے"۔ اس نے بے چارگی سے سوچا اور پھر رائتہ ایک باؤل میں ڈال کر کھانے لگی۔ ارشام نے اس کی حرکت نوٹ کی تھی اور کریلے گوشت کا باؤل اس کی جانب سرکایا تھا۔

"کھا سکتی ہوں چچی مجھے چڑانے کے لئے سنڈے کو یہ ڈش تیار کرواتی ہیں یہ میرا اور اس ڈش کا معاملہ ہے۔ تم کھانا چاہتی ہو تو کھا سکتی ہو"۔ کھانا میں مصروف اس نے کہا تھا اور افراح اس کی سمجھ پر حیران سی کھانا کھانے لگی تھی۔

"مجھے اپنے گھر جانا ہے۔" کچھ دیر بعد وہ بولی تھی۔

"کپڑے اور اپنا کچھ ضروری لانا ہے۔" اس کی سوالیہ نظروں کو اپنی جانب اٹھتے دیکھ کر اس نے جلدی سے بات مکمل کی تھی۔

"ہوں ٹھیک ہے میں دو گارڈ بھجوا دوں گا تمہارے ساتھ اور اپنے ساتھ باجی پروین کو لے جانا پیکنگ میں تمہاری مدد کر دے گی۔"

گویا یہ تو واضح تھا کہ وہ اسے گھر میں رہنے کی اجازت دے رہا تھا اور دل میں۔ اس کے دل نے اچانک پوچھا تھا گڑبڑا کر اس نے نظریں جھکائے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

"آرام کرو"۔ مختصر جملہ کہہ کر وہ پھر کمرے سے نکل گیا تھا۔ سیل فون پھر بجنے لگا تھا۔ اے ایس پی صاحب کو اتوار کے دن بھی ناں خود چین ہے ناں ان کے سیل فون کو افراح نے نیم دراز ہو کر یونہی سوچا تھا اور خود کو بھٹکتی سوچوں کے حوالے کر دیا تھا۔

✦✦✦

"سر آپ میرا مطلب بھابھی کیسی ہیں اب طبیعت سنبھلی ان کی؟" وہ جو کافی دیر آفس کے کاموں میں الجھا ہوا تھا ساتھ میں ناصر بھی دلاور شاہ کا کیس مکمل تیار تھا اس کو بریف کرنا بہت ضروری تھا اب تھوڑی دیر کے لئے ریسٹ لیتے

ہوئے اس نے گرم بلیک کافی منگوائی تھی اور چائے پیتے ہوئے ناصر نے پوچھا تھا اس کے آفس میں اب ریلیکس موڈ میں صوفہ براجمان تھا۔

''ہوں، آں ٹھیک ہے، کیا ٹائم ہوا ہے؟'' اچانک کچھ خیال آتے کافی کا گھونٹ بھرتے اس نے ناصر کے سوال کا جواب دیا تھا اور ساتھ ہی پوچھا تھا۔''

''ساڑھے پانچ؟'' ناصر نے اس کی پشت کے پیچھے موجود وال کلاک کو دیکھتے ہوئے جواب دیا تھا۔

''عطاء الرحمن کو فون کرو کیا وہ میڈم کو لیکر گھر آ گیا۔'' ایک فائل کو کھولتے ہوئے اس نے ناصر سے کہا تھا۔

ناصر نے اپنے سیل سے کسی کا فون ملایا اور مختصر بات کرنے کے بعد بتایا تھا۔

''نہیں وہ ابھی اپنے گھر میں ہی موجود ہیں۔'' ارشام نے فائل سے نظر اٹھا کر ایک پل ناصر کو دیکھا۔

''عطاء سے کہو اسے لیکر گھر آئے کافی دیر ہو گئی ہے صبح کی میرے ساتھ ہی نکلی تھی۔''

ناصر نے فون ملایا تھا اور ساتھ ہی ارشام کو دیکھا تھا۔

''اس کا نمبر نہیں ہے میرے پاس آج جا کر لوں گا۔'' ناصر کی نظروں میں آئے سوال کو بھانپتے ہوئے اس نے مصروف انداز میں جواب دیا تھا۔

''وہ کہہ رہا ہے کہ میڈم ابھی وہیں رکنا چاہتی ہیں۔'' کچھ توقف کے بعد ناصر نے کہا تھا۔

''بات کرواؤں میری اُس سے۔'' ناصر نے عطاء سے دوسری طرف کہہ کر سیل فون اس کی جانب بڑھایا تھا جہاں سے کچھ دیر بعد اس کی روتی ہوئی بوجھل آواز شام کی سماعت سے ٹکرائی تھی اس کی تیوری چڑھی تھی۔

''شام ہو رہی ہے تمہارا اتنا دیر رکنا مناسب نہیں باقی پھر کسی دن دیکھ لینا گھر پہنچو!'' وہی دوٹوک انداز اور سیل فون ناصر کو تھما دیا تھا اور پھر اپنے کام میں مصروف ہو گیا تھا۔

✧✧✧

اتنے بڑے اور کشادہ کمرے میں اس کا سامان بآسانی سما سکتا تھا بھاری بھر کم دو بیگز کو نوکروں کی مدد سے ارشام کے کمرے میں رکھ کر وہ انکل باسط کے کمرے کی جانب مڑ گئی تھی۔ باقی کے لوگ اُسے کہیں نظر نہیں آ رہے تھے دروازے پر دستک دے کر وہ اندر داخل ہوئی تھی۔

''السلام علیکم!'' ملگجے اداس حلیے میں واضح پتہ چل رہا تھا کہ وہ بے تحاشہ روئی ہے چھوٹی سی ناک سرخ اور لونگ خاموش تھی۔

''وعلیکم اسلام!'' باسط صاحب نے کتاب سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے جلدی سے جواب دیا اور پوچھا تھا۔

''ابھی آئی ہو؟''

''جی ابھی آئی ہوں سوچا آپ کو بتا دوں اور چائے کا پوچھ لوں آپ چائے پئیں گے۔'' نیم وا دروازے میں کھڑی اُس نے پوچھا باسط صاحب کو اُس کا انداز بہت اچھا لگا تھا۔

''بالکل پئیں گے لیکن اکیلے نہیں اگر تم ساتھ دو تو۔'' خوشگوار انداز میں انہوں نے جواب دیا تھا۔

''جی میں اپنے لئے بنانے لگی تھی اسی لئے تو پوچھا ہے۔'' جھکی پلکوں سے اس نے جواب دے کر مڑنا چاہا جب انہوں نے پیچھے سے کہا تھا۔

''دو کپ چائے اور ایک کپ کافی یہ چائے نہیں پیتا۔'' تبھی افراح کو کس دوسرے کی

موجودگی کا احساس ہوا تھا وہ اس سے پہلے ان کے کمرے میں موجود تھا اور دروازے کی سائیڈ میں تھا ان کی بڑی سی بک ریک میں سے شاید ان کی پسند کی کتاب دیکھ رہا تھا۔ باپ بیٹا اس سوشل میڈیا دور میں بھی کتب بینی کے شوقین لگتے تھے۔ اس کے کسرتی اور لمبے چوڑے جسم پر پولیس کی وردی جچتی تھی وہ ایک نظر اسے دیکھتی اور سلام کر کے باہر نکل گئی کچن نیچے تھا اسے معلوم تھا کچن کافی بڑا تھا اس گھر کی تعمیر میں کشادگی کو نمایاں رکھا گیا تھا یا پھر اسے اپنے چار مرلے کے چھوٹے سے گھر کے سامنے یہ بہت بڑا اور وسیع لگتا تھا باجی پروین کچن میں ہی موجود تھی۔ وہ واپسی پر اُس کے سامنے ہی کچن میں گئی تھیں رات کے کھانے کی تیاری کر رہی تھیں۔ ساتھ خادم حسن بھی موجود تھا جو مہارت سے آٹا گوندھ رہا تھا دونوں اسے کچن میں آتا دیکھ کر مؤدب ہو گئے تھے اس کے بارے میں بھی ملازمین کو خبر ہو چکی تھی پروین سے پوچھ کر چائے کے لوازمات اکٹھے کیے وہ چائے بنانے لگی تھی پروین نے کہا تھا کہ وہ بنا دیتی ہے لیکن یہ کہتے ہوئے اس نے نرمی سے منع کر دیا تھا کہ سارا دن آپ میرے ساتھ وہاں کام کرواتی رہی ہیں میں بنا لوں گی۔

''پروین میرے لیے مکرونی......'' نور بلند آواز میں بولتی کچن میں داخل ہوئی تھی اور افراح کو کچن میں پا کر بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔

''ارے ارشام چائے کب سے پینے لگ پڑا؟'' اس نے حیرت کا اظہار کیا تھا کافی بے تکلفی تھی اس کی ارشام کے ساتھ کہ عمر میں بڑا ہونے کے باوجود وہ اس کا نام لے رہی تھی۔ افراح نے اندازہ لگایا تھا۔

''اپنے لیے بنا رہی ہوں۔'' افراح نے جواب دیا تھا۔

''اوہ تم دو کپ چائے پیتی ہو۔'' میز پر چائے کے دو مگ پڑے دیکھ کر اس نے بے تکلفی سے پوچھا تھا۔

''انکل کے لیے بھی بنا رہی ہوں''۔ اس نے نرمی سے ہی جواب دیا تھا جس پر نور نے بھنویں اچکائیں تھیں۔

''خادم حسین تمہیں باہر غلام رسول ڈھونڈ رہا تھا''۔ چوکیدار کا نام لیتے ہوئے نور نے خادم حسین کو باہر کا راستہ دکھایا تھا اور وہ مؤدب سا باہر چلا گیا تھا۔

''پروین تمہیں امی بلا رہی ہیں۔'' پروین کو بھی اس نے کچن سے باہر بھجوا دیا تھا۔

''اور پلیز آ کر میرے لیے مکرونی سیلڈ بنا دینا''۔ جاتی ہوئی پروین سے نور نے کہا تھا۔

''اچھا بی بی جی''۔ پروین یہ کہتی ہوئی خورشید بیگم کی بات سننے چلی گئی تھی۔

''ارشام تایا جان کے کمرے میں ہی ہے دیکھا تھا میں نے ادھر جاتے اس وقت Coffe Mocha پیتا ہے۔'' نور نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا تھا وہ جو کافی جار ہاتھ میں پکڑ کر کافی بنانے لگی تھی اس کی بات پر سر ہلا دیا تھا اور نور دوستانہ سی مسکراہٹ اُچھالتی واپس چلی گئی تھی افراح نے بھی پھیکی مسکراہٹ سے جواب دیا تھا۔

''مما کو بتاتی ہوں مہارانی کچن تک پہنچ چکی ہے ان کی اجازت کے بغیر۔'' نور کا رخ اپنی ماں کے کمرے کی طرف تھا۔ ساتھ ہی اس کی آنکھیں کسی خیال سے چمکی تھیں۔ Cofee Mocha کو بنانے میں اُسے تھوڑی دیر لگی تھی۔ باقی کی اشیاء ڈھونڈتے اور پوری کرتے پروین نے اسے جلدی جلدی اشیاء کے بارے میں بتا دیا تھا۔

"وہاں کے اجنبی بن کو تم اپنی اپنائیت سے دور کرو وہ سب لوگ ایک دوسرے سے واقف ہیں اجنبی تم ہو اور تمہاری اپنائیت ہی تمہارے اجنبی پن کو دور کرے گی۔" نانی نسرین کا جملہ اُس کے ذہن میں گونجا تھا چائے کی ٹرے تھامے وہ انکل کے کمرے میں چلی آئی تھی وہ تمہیں بہو کے روپ میں اپنا چکے ہیں اب تمہیں بتانا ہے کہ تم نے بھی انہیں اپنا سسرال مان لیا ہے نانی نے اسے سمجھایا تھا۔

"ارے واہ بہت مزے دار اور خوشبو دار چائے ہے"۔ گھونٹ لیتے ہی انہوں نے تعریف کی تھی۔

Coffee Mocha کا کپ سٹڈی ٹیبل پر رکھ کر وہ سامنے صوفے پر اپنا چائے کا مگ تھامے جا بیٹھی تھی۔

"شکریہ!" ان کی تعریف پر وہ مسکائی تھی۔

"ہم تو کافی باادب ہیں بیٹا آپ کا شغف ہے لٹریچر وغیرہ کی طرف"۔ انہوں نے شرارتی انداز میں پوچھا تھا افراح کو ان کی بات کرنے کا انداز اچھا لگا تھا جبھی ہلکے سے مسکاتے اُس نے جواب دیا تھا۔

"جی انکل میں بھی کافی باادب ہوں انگلش لٹریچر میں ماسٹر کر رہی ہوں"۔ باسط صاحب نے اس کے جواب پر قہقہہ لگایا تھا۔

"ارے تم ماسٹر کر رہی ہو اتنی دھان پان سی لڑکی میں تو سمجھا ابھی ایف۔اے یا میٹرک کے پیپر دیئے ہوں گے۔"

وہ واقعی کہیں سے بھی ماسٹر کی سٹوڈنٹ نہیں لگی تھی۔ نازک سی اور معصوم سی۔

ارشام جوان سے بظاہر لاتعلق کارل مارکس کو پڑھنے میں مصروف تھا دل میں وہ بھی حیران ہوا تھا اور پھر کتاب واپس رکھ کر وہ اٹھ کر کھڑا ہوا تھا۔

"میں ذرا Change کرلوں اور کچھ کام بھی ہے مجھے۔"

باپ سے کہتا ہوا وہ کمرے سے نکل گیا مگ جوں کا توں پڑا تھا تعریف تو دور کی بات اُس نے گھونٹ تک نہیں لیا تھا افراح نے اپنا نچلا لب ہلکے سے دانتوں تلے لیا تھا شاید اُسے زبردستی کی بے تکلفی پسند نہیں آئی تھی اس زبردستی رشتے کی طرح دل میں پہلی گانٹھ پڑی تھی جو نور نے لگائی تھی۔

✦✦✦

انکل نے اُسے تھوڑی دیر بعد کمرے میں بھجوا دیا تھا یہ کہہ کر کہ وہ بھی کافی تھک چکی ہوگی اب اُسے آرام کرنا چاہیے۔ کمرے میں دستک دیئے بغیر وہ داخل ہوئی آخر یہ اس کا بھی تو کمرہ تھا اور وہ جو بیڈ پر نیم دراز بغیر شرٹ کے لیپ ٹاپ پر کام کرنے میں مصروف تھا اس کے آنے پر اک نظر ڈال کر سکرین پر نظریں جمائی تھی اور پھر لیپ ٹاپ کو سائیڈ پر رکھ کر وہ اٹھ کر ساتھ والے وارڈ روب میں چلا گیا تھا وہ جو سرخ پڑتے چہرے کے ساتھ واش روم میں تیزی سے چلی گئی تھی۔ اس کے آنے تک وہ بلیک ٹی شرٹ پہنے اپنے کام میں مصروف ہو چکا تھا۔ ان دونوں کے درمیان بات کرنے کو کچھ تھا نہیں فی الحال اگر چاہتے تو ڈھیر ساری باتیں تھیں لہٰذا افراح صوفے پر جا کر لیٹ گئی وہ اس وقت کچھ بھی نہیں سوچنا چاہتی تھی تھک گئی تھی بس سو جانا چاہتی تھی۔

"خادم حسین کھانا کمرے میں ہی دے جاؤ۔" اُس نے فون کر کے کہا تھا گویا افراح کو جتایا تھا کہ وہ کھانے کھائے بغیر نہ سوئے لیکن یہ بات تو وہ اُس سے بھی کہہ سکتا تھا کیا تمام عمر وہ

اس کے انداز اور رویوں کو اپنے مطلب کا مفہوم پہناتی رہے گی وہ بس سوچ کر رہ گئی تھی۔

✧✧✧✧

لیکن اس کے سوا کوئی اور چارہ بھی تو نہیں تھا کم از کم اس وقت تک کے لئے جب تک وہ اپنے پیروں پر کھڑی نہ ہو جاتی اور یہ تبھی ممکن تھا جب اُس کے ماسٹر کی ڈگری ہوتی اور اُسے کوئی جاب مل جاتی نانی نسرین نے بھی اُسے سمجھایا تھا وہ گھر لاک کر کے چابی ان کے حوالے کر آئی تھی یہ گھر اب اس کی ملکیت تھا نانی کو ارشام سلجھا اور اچھا لگا تھا پھر اس کے باپ نے اپنے آخری وقت میں اس کا ہاتھ ارشام کے ہاتھ دیا تھا مرتے دم تک اُسے یہ رشتہ نبھانا تھا اور پھر تن تنہا لڑکی آخر جاتی بھی کہاں یہ گھر اس کی تحفظ گاہ تھا اور ارشام کا سہارا محفوظ تر نانی نے سمجھایا تھا کہ اُسے آہستہ آہستہ صدمے سے نکل کر اپنے نئے رشتے کے متعلق سوچنا ہو گا جتنا اچانک اور نیا رشتہ یہ اس کے لئے تھا اتنا ہی ارشام کے لئے بھی تو تھا اُسے ارشام کو وقت دینا اور خود بھی لینا ہو گا ایک دوسرے کو سمجھنے کے لئے وہ ان کی باتوں کو سنتی اور سمجھتی رہی تھی اور انہیں پر عمل پیرا ہونے کا ارادہ تھا۔ ہاں مگر اس کے ساتھ ساتھ اسے اپنی انا بہت عزیز تھی۔ جبھی اُس نے کمرے پر حق رکھتے ہوئے بھی صوفے پر سونے کو ترجیح دی جب تک کہ ارشام اُسے وہاں سونے کو ناں کہتا۔

✧✧✧

جب سے اس نے شہر کو چھوڑا ہر رستہ سنسان ہوا
اپنا کیا ہے سارے شہر کا اک جیسا نقصان ہوا
اتنی دیر میں اجڑے دل پر کتنے محشر بیت گئے
جتنی دیر میں تجھ کو پا کر کھونے کا امکان ہوا

”ارے چھڑا چھانٹ، کنوارا لڑکا جس کا نہ آگا نہ پیچھے ہر وقت ہمارے گھر میں گھسا رہتا ہے۔“ وہ برآمدے میں جاتی ہوئیں بڑبڑائی تھیں بات انہوں نے اپنے بھلے مانس شوہر کو سنائی تھی اور انہوں نے سن بھی لی تھی۔

”کیا ہو گیا ہے بھلی مانس صفو شروع سے ہمارے گھر آتا جاتا ہے بچپن سے ہمارے ساتھ ہی پلا بڑھا ہے سو کام کر دیتا ہے۔ خواہ مخواہ بیر نہ باندھا کر۔“ سمجھانے کی ناکام کوشش کی تھی۔

”شکریہ صفدر بھائی!“ اس کی منگوائی ہوئیں کتابیں وہ شہر سے لیتا آیا تھا اور وہی اسے لا کر دی تھیں جو اس نے آپا کی بات سنتے ہوئے صفدر سے لے لیں تھیں اسے پڑھنے کا بے حد شوق تھا ابھی ضد کر کرا کے اس نے ایف اے کیا تھا۔ وہ بھی پرائیویٹ کہ جہاں کی وہ رہائشی تھی وہاں پر بس میٹرک تک سکول تھا اس کی ایک ہی ضد تھی پڑھنا ڈھیر سارا پڑھنا لیکن ایف۔ اے کے بعد شادی ہو گئی اب تو اس کا پانچ سال کا بیٹا بھی تھا اس دوران وہ اپنے پڑھے لکھے شوہر سے خواہش منوا کر پرائیویٹ بی اے کر چکی تھی ان کا قصبہ نما گاؤں شہر سے کافی دور تھا جو کوئی بھی جاتا وہ پڑھنے کے لئے کوئی ناں کوئی کتاب منگوالیتی اور اُسے کسی چیز کا شوق نہیں تھا اپنے بیٹے کو بھی وہ گھر پڑھاتی رہتی یوں تو اس کا مجازی خدا پڑھا لکھا تھا لیکن نوکری نہ ملنے پر گاؤں میں ہی کھاد کی دکان کھول رکھی تھی گزر بسر اچھی ہو جاتی تھی بس اللہ کا شکر تھا پھر کچھ مال ڈنگر بھی تھا۔

”ارے بٹو سنبھل کر ابھی گرنے لگے تھے“۔ وہ جو کتابیں دیکھ کر بس شوق سے گود میں لئے بیٹھی تھی فوراً بھاگ کر گیند بلا کھیلتے اپنے عم زاد کے ساتھ گیند پکڑتے بیٹے کی طرف بھاگی تھی اس وقت صفدر چاچو نے اسے سنبھال لیا تھا دونوں کی ٹکر ہوتے ہوتے بچی تھی اور دونوں ہی

کھسیا کر ہنس پڑے تھے۔ کسی کے شاطر دماغ نے بہت آگے کی سوچی اور ٹھانی تھی۔

✧✧✧

''جی چاہتا ہے دھکے مار کر اُسے گھر سے نکال دوں میں اُس کے ساتھ کچھ نہ کچھ کر دوں گی میں بتا رہی ہوں۔'' کمرے میں چکر لگاتے ہوئے اس نے دانت کچکچائے تھے۔

''ارے دھیرج کر بنا بنایا کھیل بگاڑ دی گی تو تو، تیری ماں جو بساط بچھانے لگی ہے تو بچھانے سے پہلے ہی الٹ دے گی۔''

انہوں نے گھورتے ہوئے اسے کہا تھا۔

''مہارانی کچن تک پہنچ گئی ہے کمرے کی مالکن تو وہ بغیر کچھ کیے ہی بن گئی اور میں جو کب سے پاپڑ بیل رہی ہوں.....'' دھپ سے بیڈ پر بیٹھتے ادھوری بات کی تھی اور غصے سے بستر پر مکا مارا تھا۔

''دل تک تو نہیں پہنچی اور ناں پہنچے گی تو جانتی ہے اس کے دل میں جتنا زہر ہے وہاں کوئی بس نہیں سکتا ہے اور جو کوشش وہ کرے گی'' ہم ناکام بنادے گی بس اس کھیل کو بڑے صبر کے ساتھ کھیلنا پڑتا ہے جانتی ہوں میں تو میری بات دھیان سے سن دوست بن جا اُس کی رازدار اور پھر ایسی کوئی کمزوری کوئی راز اس کا لے لیں جو اس کی تباہی کی وجہ بن جائے۔'' انہوں نے قریب ہوتے ہوئے نادان بیٹی کو سمجھایا تھا۔

''اور سن یہ اپنی نائلہ بھابھی سے ہوشیار رہنا اسے بھی اپنے شوہر اور سسر کی طرح خلوص اور اپنائیت کا دورہ پڑتا ہے بنا بنایا کھیل بگاڑ دے گی یہ لوگ بس موقع کی تلاش میں رہ کر دل میں شک کا بیج بو دے بیج ڈالنے کی دیر ہے تناور درخت بننے میں دیر نہیں لگتی اور جہاں شک ہوں وہاں رشتے بنتے نہیں اجڑتے ہیں''۔ وہ

ماں بیٹی ارشام اور افراح کے رشتے کو لیکر کافی خائف تھیں رخشندہ چچی کے اپنے تحفظات تھے اور نور کو اپنے اُجڑے دل کا صدمہ لہٰذا ماں بیٹی سر جوڑے ارشام اور افراح کے کمزور رشتے کو مزید کمزور کرنے کی منصوبہ بندیاں کرنے میں مصروف تھیں وہ جانتی تھیں ارشام نے تمام عمر شادی نہ کرنیکی قسم کھائی تھی عورت ذات سے اُسے چڑ تھی لیکن قدرت نے ایسی صورتِ حال بنائی کہ وہ بے بس ہوگیا اور اپنی قسم توڑنے پر مجبور تھے۔ عرصے سے جو سب گھر والے خاص طور پر اس کے والد سمجھا بجھا رہے تھے شادی کرنے کے لئے اور اس کی ضد ناں ہاں میں نہیں بدلی اور جب بدلی تو وہ ناں کر ہی نہیں پایا تھا ایسا رشتہ بھلا ارشام نے کہاں نبھانا تھا اور نور جسے آس تھی کبھی تو وہ اس کی طرف متوجہ ہوگا۔ اور پھر گھر کی بات تھی تایا جان سے کی جاتی تو وہ کسی نہ کسی طرح منا ہی لیتے ایک سو ایک حربے تھے۔ ماں بیٹی کے پاس بات منوانے کے لیکن تقدیر نے یہ نوبت ہی نہیں آنے دی تھی اور افراح یوں ارشام کی زندگی میں شامل ہوئی کہ اسے فوری طور پر نکال باہر نہیں کیا جاسکتا تھا اب تو کوئی کھیل کھیلنا تھا اور رخشندہ چچی بہت ماہر کھلاڑی تھیں ایسے کھانوں کی۔ ایسے تو اسے گھر کی مالکن ناں ہو کر بھی مالکن بنی بیٹھی تھیں۔

✧✧✧

''کرونا کی وجہ سے جو چھٹیاں دی گئیں تھیں وہ ختم ہونے کو ہیں تین چار دنوں میں یونیورسٹی کھل گئی تو میں پڑھنا چاہتی ہوں میرا لاسٹ سمسٹر جا رہا ہے ماسٹر کا۔'' اگلے روز کمرے میں ہی ناشتہ کرتے ہوئے اس نے مصروف سے ارشام سے بات کا آغاز کیا تھا وہ زیادہ تر اپنے کمرے میں رہتا تھا سب گھر

والوں کے ساتھ زیادہ فرینک نہیں تھا۔ افراح نے نوٹ کیا تھا۔

"اپنا فون نمبر مجھے دو، ضرورت پڑ جاتی ہے۔" ناشتے سے انصاف کرتے ہوئے اس کی بات کا جواب دیئے بغیر وہ بولا تھا۔

"جی!" افراح نے فون نمبر دیا تھا اور اُسے چوتھے بوائل انڈے کی سفیدی بلیک کافی کے ساتھ کھاتے دیکھا تھا۔

"تمہارے نمبر پر میری مس کال آگئی ہے نوٹ کرلو"۔ سامنے میز پر پڑے اُس کے موبائل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا جس نے میز پر رکھے موبائل کو وہی پر رکھے نمبر کو ارشام کے نام سے محفوظ کیا تھا دل تو چاہا تھا کھڑوس لکھ کر Save کرے لیکن وہ اس کی کارروائی دیکھ رہا تھا اور وہ جتنا تیز مشاہدہ رکھتا تھا اُسے اس کا اندازہ ہوتا جا رہا تھا اس نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا تھا اور دوبارہ ابھی پوچھنا مناسب نہیں لگا تھا۔

"شام کو تیار رہنا ڈاکٹر سے Apointment ہے تمہارا چیک اپ کروانا ہے میں آجاؤ......" تبھی ارشام کا سیل فون بجا تھا۔

"ہاں ناصر آج ڈی سی سے میٹنگ کنفرم ہے پرسوں جو شہر میں جلوس نکل رہا ہے اس کے متعلق پوری تیاری کرلو ہیں بریفنگ دینی ہے۔ رات میں نے تمہیں کچھ ضروری ای میل کی تھیں گڈ چیک کرلیں؟ میں بس نکل رہا ہوں۔"

فون پر مصروف دیکھ کر وہ اٹھی تھی اور بے دھیانی میں اُس کے دوپٹے کا ایک کونہ اس کے بوٹ کے نیچے دبا ہوا تھا۔ اٹھنے پر سر پر ٹکا دوپٹہ ڈھلک گیا تھا لمبے گھنے گیلے بال دوپٹے میں سمیٹے بکھرے گئے تھے۔ جھٹکا کھانے پر وہ دوبارہ دھپ سے صوفے پر بیٹھی تھی صبح ہی نہا دھو کر اُس نے لباس تبدیل کیا تھا پھیکے سے رنگ کے لباس میں وہ خود بھی پھیکی پھیکی لگ رہی تھی جو اتنے دنوں سے اُسے کالے سوٹ میں دیکھنے کا عادی ہوگیا یہ پھیکا سا سکن کلر کا سوٹ اُس پر اچھا نہیں لگا تھا "تمہیں اس سے کیا وہ پھیکا پہنے یا گاڑھا" دل نے ٹوکا تھا اور اس کے ماتھے پر لکیریں نمودار ہوئیں اپنی مڑی ہوئی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے اس نے قدرے غصے سے کہا تھا۔

"دھیان سے نہیں اٹھ سکتی ابھی کافی گرنے لگی تھی۔"

"آپ کے جوتے کے نیچے میرا دوپٹہ ہے۔" منہ پھلائے وہ جلدی سے بولی تھی۔

"ایک پل میں غصے کے گھوڑے پر سوار ہو جاتا ہے کھڑوس"۔ دل میں خفگی سے کہا تھا۔ وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا تھا اور سٹڈی ٹیبل سے اپنی ضروری چیزیں پکڑتا کمرے سے باہر نکلتے نکلتے کہہ گیا تھا۔

"شام میں تیار رہنا۔" جواب سننے کی اُسے ضرورت نہیں تھی لہٰذا اُس نے دیا بھی نہیں تھا اس کے جانے کے بعد اتنا وسیع کمرہ یکدم خالی اور مزید وسیع لگنے لگا تھا خادم حسین برتن اٹھا کر لے گیا تھا کمرے پر اک طائرانہ نظر ڈالی اور اس کی بے ترتیبی دیکھ کر اُسے ہی ٹھیک کرنے کا سوچا جبھی وہ چلتی ہوئی کپڑوں کی الماری کی طرف آئی تھی کہ الماری کو سیٹ کرلے اور اپنا سامان بھی رکھ لے۔ اف کپڑوں کے ریک کا حال دیکھ کر اس کا سر چکرایا تھا۔ سب ایک دوسرے سے گتھم گتھا الماری میں ٹھنسے ہوئے تھے۔

"کیا کر رہی ہو یہاں پر؟"۔ اپنے پیچھے ارشام کی آواز سن کر وہ اچھل ہی پڑی تھی۔

"ابھی تم ٹھیک نہیں ہوئی آرام کرو اور میری کسی چیز کو ہاتھ مت لگانا۔" اپنے پہلے جملے کا اثر

زائل کرنے کے لئے اس نے تنبیہہ کی تھی گویا اور ضروری فائل جو وہ بھول گیا تھا لیکر باہر نکل گیا تھا۔

"یہاں کی ہر چیز تو اس کی ہے سوائے میرے" بے دلی سی ہو کر وہ بڑبڑاتی صوفے پر آن بیٹھی تھی۔

"آہ!" بہت مشکل لگ رہا تھا اُسے زندگی کو نئے سرے سے ترتیب دینا۔

✧✧✧

ڈاکٹر کو دکھا کر وہ جب گھر آئے تو سبھی گھر والے لاؤنج میں اُن کے منتظر چائے پی رہے تھے۔

"ڈاکٹر نے اُس کی ادویات بند کر دی ہے اب یہ ٹھیک ہے ہاں کمزوری تھی جو اچھی خوراک سے یقیناً دور ہو سکتی تھی اور باقی اگر وہ Stress سے دور ہے اور اُسے کوئی اعصابی تناؤ ناں دیا جائے تو زیادہ بہتر تھا۔" چچا اشفاق کے پوچھنے پر اُس نے کھڑے کھڑے بتایا تھا وہ بہت تھک گیا تھا کام کا لوڈ ضروری میٹنگز اور پھر آتے ہی ہسپتال اس کا دماغ ایک پرسکون نیند کا متلاشی تھا۔

"فریش ہو کر تم لوگ بھی بھائی جی کے کمرے میں آجاؤ ہم لوگ وہیں جا رہے ہیں۔" رخشندہ چچی نے اس کے بیزار اور تھکے تاثرات کو بھانپتے ہوئے جھٹ سے کہا ساتھ ہی نور پر بھی اک مسکراتی نظر ڈالی جیسے کہہ رہی ہوں اب تماشہ دیکھو۔

"کیوں آج کیا خاص بات ہے جو سبھی اُدھر جا رہے ہیں۔"

بیزار انداز میں اُس نے پوچھا تھا۔

"نائلہ پروین سے کہو رات کا کھانا جلدی بنا لے وہیں کھائیں گے سب لوگ اتنی ضروری اور خاص پروگرام بنانا ہے۔ بات چیت میں کافی وقت لگ جائے گا۔" چچی رخشندہ نے اپنی بہو کو ہدایت جاری کی تھی جو افراح کو مسکراتا ہوا دیکھ کر کچن کی جانب سعادت مندی سے اٹھ کر چلی گئی تھی افراح نے بھی اُسے ہلکی مسکان سے جواب دیا۔ آج سارا دن بیزار اور اُداس رہی تھی وہ نائلہ اُس کا حال دریافت کرنے آئی تھی اور اُسے ہوں ہاں بات کرتے دیکھ کر آرام کرنے کا کہہ کر اُٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"لو جی! یہ جیسے تم اچانک شادی کر کے لے آئے ہو اور لاگر لگتا ہے کہ بھول گئے ہو کہ یہ تمہاری بیوی ہے اور ......" رخشندہ چچی نے آنکھیں گھماتے بات شروع کی جسے اس نے کاٹتے ہوئے بیزار کن انداز میں کہا تھا۔

"مطلب کی بات کریں چچی۔"

"بھئی رخشندہ کا مطلب ہے کہ اب تمہارا اور افراح کا ولیمہ ہو جانا چاہیے۔" اشفاق چچا نے دونوں کے درمیان حائل ہوتے ہوئے کہا۔

زبیر اور سمیر نے بھی اثبات میں سر ہلایا تھا۔

"بہت مزا آئے گا میں نے فل ولیمے سے ڈی جے پلے کرنا ہے کوئی ناں مجھے روکے۔" سمیر نے جوش سے کہا تھا۔

"ولیمہ!" تھکے ارشام نے حیرت سے کہا تھا اور صوفے سے اُٹھ کھڑا ہوا تھا جو ابھی کچھ دیر پہلے ہی بیٹھا تھا خاموش بیٹھی افراح نے نظریں اٹھا کر دیکھا تھا۔

"ہاں بھئی ولیمہ۔ ہے۔ اب لوگوں کو تمہاری شادی کا بھی تو بتانا ہے۔ کئی لوگ ملنے آتے جاتے رہتے ہیں یہ سادہ سے حلیے میں کون لڑکی ہے کا جواب یہ تو دینے سے رہے کہ ایک رات تم اسے اپنی بیوی بنا کر لے آئے ہر کسی سے اس قسم کی باتیں تو نہیں کی جا سکتی ناں۔ ولیمہ کریں گے تو سب کو تمہاری شادی کا پتہ چل جائے اور

کوئی من گھڑت کہانی بنا دیں گے ہم بھی۔“ رخشندہ چچی نے گردن کو اونچا کرتے ہوئے کہا تھا۔

”کوئی ولیمہ نہیں ہو رہا اور کسی کو کوئی من گھڑت کہانی سنانے کی ضرورت نہیں۔“ اتنا کہہ کر وہ سیڑھیاں چڑھتا چلا گیا تھا ہمیشہ کی طرح اُسے وہیں سب میں اکیلا چھوڑ کر افراح کو اس کے جواب نے سب سے نظریں چرانے پر مجبور کر دیا تھا اور سمیر منہ پھلا کر اُٹھ گیا تھا۔ زبیر بھی اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔

”امی میں پروین کو کھانے کے متعلق بتا آئی ہوں۔“ نائلہ نے آ کر کہا تھا۔

”ارے بھئی رہنے دو موصوف شادی تو کر بیٹھے ہیں اب نبھانی مشکل لگ رہی ہے پہلے یہ لڑکا شادی کے نام سے بدکتا تھا۔ ساری عمر شادی ناں کرنے کے دعوے کرتا تھا اور جب کی تو یوں کہ ایک رات دلہن لے آئے اب ولیمہ نہیں کرنا چاہتے یہ بھی ہمیں کسی دن ولیمے کے کارڈ مل گئے کہ شامل ہو جائیں یا پھر......!“

”افوہ تھکا ہوا ہے کتنے بڑے عہدے پر ہے پر کتنی ذمہ داریاں ہیں تم بھی آتے ہی شروع ہو گئی۔“ اشفاق چچا نے رخشندہ چچی کی نان سٹاپ چلتی زبان کو روکا تھا۔ نائلہ خاموشی سے اپنے کمرے چلی گئی تھی اور افراح بھی بوجھل دل کے ساتھ اوپر چلی آئی تھی۔ ان سے اجازت لیکر اشفاق چچا بھی اُس کے پیچھے تھے اور ان کا رخ باسط صاحب کے کمرے کی طرف تھا جاتے جاتے اُس کے سر پر نرمی سے ہاتھ رکھ کر بولے تھے۔

”فکر نہ کرو سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ اس نے پھیکی مسکراہٹ سے سر ہلا دیا تھا اُس کا دل پریشان اور اداس تھا بابا اماں کی بہت یاد آ رہی تھی وہ پلٹ کر نیچے اتر آئی تھی اس کا رخ باہر لان کی طرف تھا شام کے ملگجے سائے میں وہ لان میں رکھی کرسیوں میں ایک کرسی پر آ بیٹھی تھی نور جس نے اُسے لان کی طرف جاتے دیکھا تھا ایک طنزیہ مسکراہٹ سے کچھ سوچتی اس کے پیچھے چلی آئی تھی۔

”ارے تم اِدھر بیٹھی ہو۔ ارشام نے کافی پی لی جب وہ آفس سے بے حد تھک جاتا ہے تو آتے ہی کافی پیتا ہے اُسے میری بنائی کافی بہت پسند ہے آئی ایم شیور تمہاری بنائی بھی پسند آئی ہوگی۔“ نور نے بے تکلفی سے اُس کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا تھا چچی کی طرح اُسے بھی نان سٹاپ بولنے کی عادت تھی۔ مقابل کی بات سنے بغیر بس اپنی کہے جانے کی عادت تھی۔ افراح نے دل میں سوچا تھا۔ اور ساتھ ہی کل کا Caffee Mocha کا مگ یاد آیا تھا جسے اس نے جوں کا توں وہیں رہنے دیا تھا ایک سپ تک نہیں بھرا تھا دل بدگمان ہونے لگا تھا۔

”کہیں ارشام اور نور!“ نور کی ارشام کے متعلق بے تکلف انداز میں گفتگو نے افرا کو ایک اور ہی سوچ کے رستے پر لا کھڑا کیا تھا۔

”کیا سوچ رہی ہو افراح بھئی میں تم سے کچھ پوچھ رہی ہوں۔“ نور نے اُسے متوجہ کیا تھا۔

”آں، ہاں کیا؟“ افراح چونکی تھی۔

”چہ، خیر چھوڑو ارشام کے متعلق میں تمہاری مدد کر سکتی ہوں۔“ نور نے کہا تھا۔

”کیسی مدد؟“ افراح نے اس کی بات پر حیرت کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا تھا اُسے واقعی نور کی بات سمجھ نہیں آئی تھی۔

باقی اگلے ماہ

تم میری عید سعید ہو

نورین معشوق



تو غنی ہے سو خزانوں سے عطا کر مالک
مجھ سے در در کا تماشہ نہیں دیکھا جاتا

''آپ جو بھی کہیں ڈیڈ میری طرف سے انکار ہے۔ آپ جب جب یہ بحث چھیڑیں گے مایوسی ہی ہونگے۔ کچھ بھی ہو میرا فیصلہ نہیں بدلے گا۔'' اُس کا لہجہ حتمی اور ٹھوس تھا۔

''وہم سچ نہیں ہوا کرتے'' تمش پاشا نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ کینوس پہ اس کا برش ساکت ہوا۔ پلٹ کے شکایتی نظروں سے پیچھے کھڑے ڈیڈ کو دیکھا۔

''وہم ہوتی تو کبھی مجسم میرے سامنے نہ آتی۔ کھلی آنکھوں سے اس حسین پیکر کو میں نے دیکھا تھا۔ میرے اتنے قریب تھی وہ کہ چاہتا تو اک پل میں چھو لیتا اسے۔'' وہ ایک ایک لفظ پہ زور دے کر بول رہا تھا۔

''کتنی بار......؟'' تمش پاشا نے پوچھا۔

پھر خود ہی شہادت کی انگلی کھڑی کر دی۔

''صرف ایک بار۔ یونہی سر راہ تمہاری نظر سرسری سی اس پہ پڑ گئی اور تم طے کر بیٹھے کہ تمہیں اپنی پوری زندگی اُس کے ساتھ گزارنی ہے۔ دیکھو حدشان! زندگی بھر کے فیصلے یونہی پل بھر میں جذباتی رو میں بہہ کر نہیں کئے جاتے۔ تم باشعور ہو کے بھی پچھلے چھ سالوں سے اک ایسی لڑکی کی تلاش میں خوار ہو رہے ہو جس کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں۔ اور اگر ہے بھی تو کیا وہ اب تک تمہارے انتظار میں کنواری بیٹھی ہوگی۔'' انہوں نے بغور اس کا بے چین اور مضطرب چہرہ دیکھا اور پھر سے گویا ہوئے۔

''اور بالفرض وہ کنواری بھی ہوئی تو کہاں ہے۔ اتنی تلاش کے باوجود وہ ملی کیوں نہیں۔ وہ اس لئے کہ خواب کبھی حقیقت کا روپ نہیں دھارتے۔ یہ صرف بند آنکھوں پہ ٹکے جگمگاتے

مکمل ناول



ہیں۔ آنکھیں کھلنے پہ اندھیروں میں غائب ہو جاتے ہیں۔ یار جو روشنی کا مقابلہ ہی نہیں کر پاتے ان کے پیچھے خوار ہونے کا فائدہ۔'' وہ مدلل رویہ اختیار کیے اسے سمجھا رہے تھے۔ وہ جانتے تھے زور زبردستی سے معمولات سدھرنے کے بجائے مزید بگڑتے ہیں۔

''شاید میری جستجو میں ہی کوئی کمی رہ گئی ہو۔ ورنہ تلاشنے والے تو رب کو بھی ڈھونڈ لیتے ہیں......'' وہ اب بھی اپنے موقف پہ ڈٹا کھڑا تھا۔ تمکش پاشا نے پرسوچ نظروں سے اُسے جانچا۔ وہ ایک گھاگ بزنس مین تھے۔ زندگی کے نشیب وفراز سے لڑ جھگڑ کے تو کبھی مصالحت کے تحت جھک کر وہ آسمان کی بلندیوں تک پہنچے تھے۔

وہ بات منوا لینے کے گر سے بخوبی واقف تھے۔

''ٹھیک ہوے پھر۔ ایک موقع اور دیا۔ اس دفعہ اتنی شدت سے تلاشو کہ وہ خود چل کر مجسم حقیقت کا روپ دھار کر تمہارے سامنے کھڑی ہو۔ میں اپنی شکست کو بخوشی گلے کا ہار بناؤں گا۔ لیکن......ناکامی کی صورت تم بخوشی وہی کرو گے جو میں تمہیں کہوں گا۔'' تمکش پاشا اُس کے کمرے سے باہر جانے کے لیے مڑ گئے پھر دروازے کے پاس رک کر پلٹے۔

''یاد رکھنا......اس دفعہ میں کوئی رعایت برتوں گا ایسا سوچنا بھی مت۔'' وہ سخت لہجے میں کہتے کمرے سے باہر نکل گئے۔

ان کے جاتے ہی حد ثان نے ہاتھ میں پکڑا برش فرش پہ دے مارا۔ بے بسی بتدریج بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ اپنی ادھوری پینٹنگ کے سامنے آ کھڑا ہوا جس میں سیاہ رات کی اوٹ سے جھانکتا چاند بالکل اسی کی طرح بے بس اور افسردہ دکھائی دے رہا تھا۔

وہ پاشا گروپ آف انڈسٹریز کا اکلوتا چشم و چراغ تھا۔ والدہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ بے حد ذہین وفطین اور سلجھی ہوئی عادات کا مالک۔ تمکش پاشا کو کبھی اس سے کوئی شکایت نہیں رہی تھی۔ وہ سیاحت کا رسیا اور قدرتی مناظر کا دلدادہ تھا اکثر و بیشتر وہ دوستوں کے ساتھ آؤٹنگ پہ جاتا رہتا تھا۔ وہ بھی ایک ایسا ہی دن تھا۔ اک عام سا دن۔

دھوپ سنہری تھی اور ہواؤں میں ٹھنڈک رچی بسی تھی۔ اس کے اطراف گاڑیوں اور لوگوں کا بے ہنگم شور تھا۔ یہ اسی کا مشورہ تھا کہ بس میں سفر کیا جائے۔ بس ٹرمینل پہ کھڑی وہ ہونق پن سے سامنے کا نظارہ دیکھ رہے تھے۔ افراتفری کے عالم میں بھی ایک دوسرے کو دھکیلتے بس میں سوار ہونے کی کوشش کر رہے تھے کیا عورتیں کیا مرد۔ سب کا یہی حال تھا۔ شامیر اور عفان نے ہمت کر کے چڑھنے کی کوشش کی مگر شدید دھکے کھا کے وہ بھی مسکین صورت بنائے اس کے ساتھ آ کھڑے ہوئے تھے۔

''یہ سب تیری وجہ سے ہوا ہے......بازو کو سہلاتے شامیر نے اسے لتاڑا۔ مشورہ جو اس نے دیا تھا۔

''ایویں......تم دونوں دیکھو کیسے پلک جھپکتے بس میں سوار ہوتا ہوں۔'' وہ فرضی کالر جھاڑتا آگے بڑھا۔ دونوں تمسخر سے ہنسے۔

''چڑھ ہی نہ جاؤ۔'' عفان نے منہ بنایا عید الفطر کا پہلا دن تھا۔ اور یوں لگتا تھا سارا پاکستان آج ہی سیر کرنے کے لیے باہر نکلا ہے۔ اور وہ بھی بس کے ذریعے۔

دو چار دھکے کھانے کے بعد وہ بس پہ پہلا

قدم رکھنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ اور تبھی کوئی تیزی سے بس پہ چڑھا تھا۔ حدثان جو دروازے میں کھڑا تھا اسے زوردار دھکا لگا۔ وہ لڑکھڑا کے پہلو کے بل سڑک بوس ہوگیا تھا۔ تبھی وہ وجود پلٹا۔ جو سبز آنچل کے ہالے میں گلاب سا دمک رہا تھا۔ بس اسٹارٹ ہوگئی تھی۔ نیچے اترنا حماقت تھی۔ سو اس نے وہیں سے کان پکڑ کے معذرت کرلی۔

معصوم سی صورت اور اس پہ کان پکڑ کے اک ادا سے ''سوری'' کہنا۔ حدثان تو جیسے لٹ گیا۔ ہجوم جیسے عدم ہوگیا۔ اطراف میں سناٹا چھا گیا تھا۔ ایک گلاب کی ادھ کھلی کلی اس کے چہرے سے ٹکرائی۔ جو عجلت میں ہر جانے کے طور پر پھینکی گئی تھی۔

بس جا چکی تھی۔ عفان اور شامیر اسے اٹھا رہے تھے۔ وہ لنگڑاتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ اس پہ نجانے کیا جنون سوار ہوا کہ وہ بس کے پیچھے بھاگنے لگا۔ حق دق سے دونوں نے بڑی دقتوں سے اسے قابو کیا تھا۔

بیچ میں نجانے کتنی عیدیں گزر گئی تھیں۔ اسے نہ ملنا تھا اور وہ نہ ملی۔ حالانکہ وہ کتنی دفعہ بس کے ہر سٹاپ کا چپہ چپہ چھان چکا تھا۔

اس نے الماری سے لکڑی کا خوبصورت منقش باکس نکالا۔ جس کے اندر آج بھی گلاب کی ادھ کھلی کلی سوکھی ہوئی حالت میں موجود تھی۔ اس نے بہ آہستگی سے اُسے چھوا تھا۔ نجانے کیوں اس کی خوشبو اس پیکر کی خوشبر معلوم ہوتی تھی۔

''تم کہاں ہو ماہِ سیما؟'' لکڑی کے باکس میں اک تراشہ ہوا خاکہ تھا جس میں سبز آنچل کے ہالے میں مقید گلاب مکھڑا مسکرایا تھا۔ یہ واحد خاکہ تھا جو اس نے اس پری جمال کا بنایا تھا۔ اس پیکر کو نام ماہِ سیما دیا تھا (چاند پیشانی والا محبوب) وجہ اس کی جگمگ کرتی آنکھیں اور اس پہ تابندہ روشن پیشانی تھی۔

''ڈیڈ جو بھی کہیں لیکن میں جانتا ہوں۔ تم ہو۔ اور یقیناً ایک دن مجھ سے آملو گی۔'' وہ اس دلکشی کے پیکر سے مخاطب تھا جسے سب کی نظروں سے بچا کے اس باکس میں چھپا کے رکھا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا محمش پاشا نہ صرف یہ خاکہ دیکھ چکے ہیں بلکہ اپنے طور پہ اسے تلاش بھی کر چکے ہیں اور ہر طرح سے ناامید ہو کے وہ سخت رویہ اپنانے پہ مجبور ہوئے تھے۔

✧✧✧

ہنسنے نہیں دیتا کبھی رونے نہیں دیتا
یہ دل تو کوئی کام بھی ہونے نہیں دیتا

''واٹ......!'' اس کی چیخ اتنی بلند تھی کہ ملازمین تک سہم گئے تھے۔ جبکہ اعظم بیگ نے خائف نظروں سے اُسے گھورا۔

''یہ مذاق تھا نہ ڈیڈ...... اف...... آپ نے تو میری جان ہی نکال دی تھی۔'' اگلے لمحے وہ فوراً سنبھلتی ہوئی صوفے پہ ڈھیر ہوتی بے پروائی سے بولی تھی۔

اعظم بیگ نے اس دفعہ ناگوار نظروں سے اسے دیکھا۔ بلیک پینٹ پہ ڈھیلی ڈھالی شرٹ پہنے وہ اپنے حلیے سے بے نیاز اور باپ کی نظروں سے انجان تھی۔ جو سخت برہم تھے۔ ناقدرانہ نظروں سے اس کے عجب رنگ میں رنگے بالوں کو دیکھا۔ جو ہر مہینے بدلتے ہی رہتے تھے۔ بالوں کا اصل رنگ گیا تھا۔ اس سے تو وہ خود بھی ناواقف ہی ہوگی۔

''یہ مذاق نہیں ہے شامہ۔ محمش کو زبان دی ہے میں نے۔ رخصتی جب تم چاہو مگر نکاح میں طے کر چکا ہوں۔'' وہ نپے تلے لہجے میں بولے۔

جس میں سختی نمایاں تھی وہ اسے ذرا سی بھی ڈھیل نہیں دینا چاہتے تھے۔

”سو واٹ...... زبان آپ نے دی ہے میں نے نہیں۔“

”شامہ......“ اس کی بدتمیزی پہ کڑے تیوروں سے گھورتے تنبیہ ضروری سمجھی۔

”ڈیڈ آئم ناٹ اے چائلڈ۔ جو آپ انگلی پکڑ کے جہاں چاہیں گے بھیج دیں گے میں بڑی ہو چکی ہوں۔ ویسے بھی فی الحال میرا شادی کرنے کا کوئی موڈ نہیں ہے۔ سو پلیز اس فرسودہ ٹاپک کو یہیں ختم کر دیں۔“

اس نے اپنے تئیں بات ہی ختم کر دی۔

اعظم بیگ کا پارہ چڑھنے لگا۔ چائے لاتی فاکیہ نے ایک نظر خود سر بیٹی اور دوسری شوہر پر ڈالی جو شامہ کی فضول گوئی بمشکل برداشت کر رہے تھے۔

”فاکیہ! اپنی صاحب زادی کو سمجھا دیں۔ یہ جتنی بڑی ہو جائے ہو گا وہی جو میں چاہوں گا، اس کا نکاح طے ہے۔ موڈ نہیں ہے تو بنا لے۔ میں مزید آرگومنٹ برداشت نہیں کروں گا۔ اور اگر پھر بھی اس نے کوئی ایسی ویسی حرکت کی تو نتائج کی ذمہ داری یہ خود ہو گی۔ سمجھا دیں اسے۔“ اعظم بیگ نے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے تحکم سے اپنا فیصلہ سنایا۔ ان کے حتمی اور دو ٹوک انداز کو دیکھتے شامہ کی ساری لاپرواہی اڑن چھو ہوئی۔ اس نے بے یقین نظروں سے باری باری دونوں کو دیکھا۔

”یہ فاؤل ہے ڈیڈ۔ آپ میری زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ ایسے کیسے کر سکتے ہیں۔ بنا دیکھے پرکھے جانے میں کیسے کسی بھی اجنبی کو اپنی زندگی میں شامل کر سکتی ہوں۔“

اس کا احتجاج بجا تھا۔ فاکیہ نے بھی تائیدی انداز میں شوہر کی طرف دیکھا۔

”کیا میں تمہارا برا سوچوں گا۔“

”ہرگز نہیں۔ لیکن مجھے انتخاب کا حق مذہب، معاشرہ اور تعلیم نے دیا ہے۔ آپ مجھے اس حق سے محروم نہیں کر سکتے۔“

”ٹھیک ہے۔ میری طرف سے کوئی پابندی نہیں۔ دس دن ہیں نکاح ہیں۔ اس بیچ تم دونوں مل لو۔ خوب جانچ پرکھ لو ایک دوسرے کو۔ اچھا ہے تمہارا کوئی گلہ تو ختم ہو۔“ وہ اپنی کہہ کے اٹھ کے اپنے کمرے کی طرف چلے گئے۔

”مما......“ ان سے مایوس ہو کر شامہ نے فاکیہ کی طرف رخ کیا۔

”ارے مجھے تو ابھی ڈنر کی بھی تیاری کرنی ہے۔ تم باپ بیٹی کے چکر میں بھول ہی گئی تھی۔“ وہ خود سے بڑبڑاتیں کچن کی طرف چلی گئیں۔

شامہ نے غصے سے موبائل اٹھا کے پرے پھینکا جو ایک کلابازی کھا کے اس کے قریب ہی ڈھیر ہو گیا تھا۔

”دیکھ لوں گی میں آپ دونوں کو......“ وہ پیر پٹختی ہوئی دھپ دھپ کر کے سیڑھیاں چڑھ گئی۔

✦✦✦

فٹ پاتھ کی دیوار سے چپکے ہوئے پتے
اک روز ہواؤں کو درختوں پہ ملے تھے

”کیا نوکری کرنا ضروری ہے؟“ وہ عصر کی نماز ادا کر کے دھلے ہوئے کپڑے استری کرنے بیٹھی تھی کہ طلعت بانو کے سوال پہ چونک اٹھی۔

”ہاں...... کیونکہ میں اعظم ماموں پہ مزید بوجھ نہیں بننا چاہتی۔“

”تمہیں کس نے کہا ہے منوہ تم بھائی صاحب پہ بوجھ ہو۔ وہ تمہیں شامہ کی طرح ہی

پیار کرتے ہیں۔ ان فضول سوچوں کو اپنے ذہن سے جھٹک دو۔" طلعت بانو بھائی کی بے پناہ محبت و خلوص سے واقف تھیں۔ اس لئے وہ اسے سکون رہنے کی تلقین کر رہی تھی۔ مگر سامنے بھی منوہ تھی۔ جس میں خودداری اور خود اعتمادی کوٹ کوٹ کے بھری تھی۔ نجانے دبو اور بزدل سی طلعت بانو کے ہاں اتنی نڈر بیٹی کیسے پیدا ہوگئی۔ وہ اکثر خود سے سوال کرتی تھیں۔

"جانتی ہوں امی! لیکن آپ بتائیں ہم کب تک ماموں کی اچھائیوں سے فائدہ اٹھاتے رہیں گے۔ آپ کا حصہ تو ابو لیکر فرار ہوگئے تھے۔ یہ تو ان کی رحمدلی ہی ہے جو اپنے گھر میں ہمیں سر چھپانے کے لئے سائبان دے دیا۔" اس نے استری کا پلگ نکال کے کن اکھیوں سے ماں کو دیکھا۔ جن کے چہرے پہ اذیت چھانے لگی تھی۔ وہ اُٹھ کے ان کے پاس بیڈ پہ آئی اور ان کے کانپتے ہاتھ تھام لئے۔

"آئم سوری امی لیکن حقیقت یہی ہے۔ میں بھولنا بھی چاہوں تو لوگ یاد کرا دیتے ہیں۔ میرا مقصد آپ کو ہرٹ کرنا نہیں تھا۔ بس چاہتی ہوں میری طرح آپ بھی اس حقیقت کو تسلیم کرلیں۔" طلعت بانو نے سنبھلتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔ منوہ ریلیکس ہوتی ہوئی دوبارہ استری کرنے کے لئے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"لیکن بھائی صاحب کیا مان جائیں گے؟" تکیے سے ٹیک لگاتے ان کی نظریں اپنی بیٹی کے صبیح وملائم چہرے پر تھیں۔

"فی الحال تو ماموں جان شمامہ کے نکاح کی تیاریوں میں بزی ہیں۔ ایک دفعہ فارغ ہو جائیں پھر میں خود ہی ان سے بات کرلوں گی۔"

"پر؟"

"امی آپ خدشات کو ایک طرف رکھیں اور میرے لئے دعا کریں کل آپ کی بیٹی کا پہلا امتحان ہے۔ بس آپ دعا کریں میں انٹرویو میں پاس ہوجاؤں۔"

وہ اُٹھ کے ان کے پاس آتی لاڈ سے ان کے گلے میں بازو حمائل کر گئی تھی۔ طلعت نے مسکراتے ہوئے اسے دعاؤں سے نوازتے اس کی ہتھیلی کا بوسہ لیا۔

"اللہ تمہیں کامیابیوں سے ہمکنار کرے۔ تم جو چاہو اس کے لئے راستہ ہموار ہوتے جائیں۔ آمین!"

"ثم آمین" وہ کھلکھلاتے ہوئے پلٹی۔

"اب آپ مزید کوئی سوال نہیں کریں گی اور مجھے استری کرنے دیں گی ٹھیک ہے۔" انہیں مزید بولنے سے باز رکھتے وہ استری سنبھال کے بیٹھ گئی۔

"اچھا دادی اماں!" طلعت ہنستے ہوئے تسبیح کے دانے گرانے لگیں۔

✧✧✧

دل کے ٹکڑے سر بازار لیے پھرتا ہوں
کاش ان سے تیری تصویر بنا دے کوئی

بلیک ویسٹ کوٹ سوٹ میں اس کی وجاہت قابل رشک تھی۔ خوبرو نقوش سے مزین چہرے پر سنجیدگی تھی۔ دل میں اضطرابی لہریں جوش مار رہی تھی۔ اس کے اختیار میں ہوتا تو وہ کب کا اٹھ کے بھاگ چکا ہوتا۔ لیکن یہ اس کے اختیار میں نہیں تھا۔ وہ محتشم پاشا سے کیا ہوا چیلنج ہار چکا تھا۔ جس کی سزا اُسے اِس نکاح کی صورت میں مل رہی تھی۔ وہ جسمانی طور پر تو مہمانوں سے بھرے وائیٹ اور سلور گرے فرنیچر سے خوبصورتی سے سجے ڈرائنگ روم میں تھا۔ مگر ذہنی وقلبی طور پر وہ سبز ڈوپٹے کے ہالے میں مقید گلاب چہرے کے پاس پہنچا ہوا تھا۔

اسے اپنا آپ کسی سرد خانے میں دھری لاش کی طرح معلوم ہو رہا تھا۔ احساسات سے عاری اور بے حد منجمد۔

"مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔" انہیں یہاں آئے کافی وقت بیت چکا تھا۔ تبھی پریشانی سے اعظم بیگ نے محتشم پاشا کو مخاطب کیا۔ وہ بغیر کچھ کہے ان کے ساتھ ہو لیے۔ بہنام بیگ انہیں لیے ایک الگ تھلگ کمرے میں آئے تھے۔ ماتھے پہ چمکتے پسینے اور جھکے کندھوں سمیت وہ انہیں تشویش میں مبتلا کر گئے۔ دفعتاً انہوں نے ہاتھ جوڑ دیئے۔

"میں تم سے معذرت خواہ ہوں یار۔ میری اولاد میرے سر میں خاک ڈال گئی۔ میری نیک نامی اور شملے کو داغ دار کر گئی۔ مجھے معاف کر دے یار۔" وہ نادم سے کہہ رہے تھے۔ محتشم پاشا الجھ سے گئے۔

"تم کیا کہہ رہے ہو؟ اور پلیز یہ ہاتھ مت جوڑو۔ سیدھے سبھاؤ بتاؤ کیا ہوا ہے۔ شامہ بیٹی تو ٹھیک ہے۔" محتشم پاشا نے ان کے جڑے ہوئے ہاتھ کھولتے تفکر سے پوچھا۔

"اسے کیا ہونا ہے۔ میرے لیے رسوائی کا سامان تیار کر کے نجانے کہاں چلی گئی ہے۔ یہ میسج چھوڑ کے گئی ہے میرے لیے۔" انہوں نے موبائل کی روشن اسکرین سامنے کی۔ جس میں شامہ کا پیغام درج تھا کہ وہ یہ شادی نہیں کرنا چاہتی اس لیے گھر چھوڑ کے جا رہی ہے۔ کہاں یہ بتانے کی زحمت گوارہ نہ کی تھی۔

میسج پڑھتے ہی محتشم پاشا کی پیشانی شکن آلود ہوئی۔

"تم جانتے ہو تمہاری بیٹی نے کیا کیا ہے۔ تماشہ لگا دیا ہے میرا اور میرے بیٹے کا۔ یہ نکاح نہ ہوا تو اپنے ساتھ لائے ہوئے مہمانوں کو کیا جواب دوں گا۔ کتنی جگ ہنسائی ہوگی ہماری۔" شدت طیش سے مٹھیاں بھینچتے وہ غصے سے چلائے تھے۔ البتہ آواز دھیمی رکھی تھی تاکہ کمرے سے باہر نہ جائے۔

"میں سخت شرمندہ۔" اعظم بیگ بولے۔

"تمہاری شرمندگی کا کیا کروں۔ ماتھے پہ تاج کی طرح سجا لوں۔" وہ چیخ اٹھے تھے۔ انہیں رہ رہ کے حدثان کا خیال آ رہا تھا۔ جو بڑی دقتوں سے ان کے قابو آیا تھا۔ اگر آج نکاح نہ ہوا تو وہ عمر بھر کے لیے اس وہم کے تعاقب میں بھٹکے گا۔

"ایک راستہ ہے۔ جس سے ہماری عزت بھی بچ جائے گی اور یہ نکاح بھی ہو جائے گا۔" کچھ توقف سے اعظم بیگ بولے۔

"کوئی راہ چھوڑی ہے تمہاری بیٹی نے۔" محتشم پاشا طنزاً بولا، اعظم بیگ نے بمشکل ان کا لہجہ ہضم کیا اور صبر کے گھونٹ بھرے۔

"میری بھانجی ہے۔ منورہ ممتاز۔ مجھے میری بیٹی کی طرح عزیز ہے۔ ایم فل کر رکھا ہے۔ اگر حدثان اور اس کا نکاح ہو جائے تو......"

"تم جانتے ہو اعظم کیا بول رہے ہو۔" محتشم پاشا کو ان کی بات نہایت ناگوار گزری۔

"تم ایک دفعہ اس سے مل تو لو۔" وہ مصر ہوئے۔

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" محتشم پاشا نے انکار کر دیا۔

تبھی دروازہ دھاڑ سے کھلا۔ منوہ اندر داخل ہوئی۔

"ماموں؟ ممانی بے ہوش ہو گئی ہیں۔ پلیز جلدی آئیے۔"

وہ جس تیزی سے آئی تھی اس تیزی سے پلٹ گئی۔ جبکہ حشمت پاشا کی نظریں گلابی لباس میں ملبوس اس کانچ کی گڑیا سے چپک کر رہ گئی تھیں۔

"کیا یہی منوہ تھی۔" ان کا انداز پرسوچ تھا۔ اعظم بیگ نے سر اثبات میں ہلایا۔

"ٹھیک ہے۔ مولوی سے کہو نکاح پڑھوائے۔" ان کے الفاظ اعظم بیگ کے اندر نئی روح پھونک گئے۔ مارے تشکر کے وہ ان سے لپٹ گئے تھے۔

✦✦✦

اس میں قسمت کی خطا ہے نہ زمانے کا قصور
غم تو انسان کے جینے کی سزا ہوتے ہیں

منوہ دنگ سی ماں کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ جنہوں نے ابھی کچھ دیر پہلے ماموں کا عندیہ آ کر سنایا تھا۔ وہ شمامہ کی عدم موجودگی میں اس کا نکاح کرنا چاہتے تھے۔ وہ اپنی داؤ پہ لگی عزت کو بچانے کے لئے اسے پیش کر رہے تھے۔ کیا وہ اتنی گئی گزری تھی کہ کس کے بھی پلّے اسے یونہی منڈھ دیا جاتا۔

"ہرگز نہیں"۔ وہ بپھر ہی تو اٹھی تھی۔

"آپ انکار کر کے کیوں نہیں آئیں امی۔ آپ سب نے سوچا بھی کیسے کہ میں یہ نکاح کروں گی۔ ابھی جائیں اور ماموں جان کو میرا انکار سنائیں۔" وہ کھولتے دماغ کے ساتھ کمرے میں دیوانوں کی طرح چکرا رہی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کیا سے کیا کر گزرتی۔ طلعت بانو بے بس نگاہوں سے بیٹی کے گلابی چہرے کو غصے سے سرخ پڑتا دیکھ رہی تھیں۔ لیکن یہ وقت بے بسی دکھانے کا نہیں تھا۔

"تم اپنے ماموں کی محبت کو ہمیشہ ان کا احسان سمجھتی آئی ہو نہ، تو اب وقت آ گیا ہے ان کے احسان کا بدلہ اتارنے کا۔ چاہو تو یہ نکاح کر کے سارے حساب بے باک کر دو۔ اگر نہیں تو پھر انکار کر کے اپنے ماموں کی عزت کا جنازہ نکلتے دیکھو۔"

"امی......" منوہ کی آواز سارے احتجاج کے پھٹ سی گئی۔ طلعت بانو نے بیٹی سے نظریں چرائیں۔ وہ فرشتوں جیسے بھائی کا مان نہیں توڑنا چاہتی تھی۔ ہمیشہ دینے والے بھائی نے پہلی دفعہ تو کچھ مانگا تھا۔ وہ کیونکر انکار کرتیں۔

"دیکھیں امی ابھی مجھے اپنا کریئر بنانا ہے۔ اپنے پیروں پہ کھڑے ہونا ہے۔ اپنی منزل کے انتہائی قریب آ کے میں اچانک سے اتنا بڑا فیصلہ کیسے کر سکتی ہوں۔" وہ دھیمی پڑتی لجاجت سے ان کے ہاتھ تھام کے بولی تھی۔

"ہاں تو کرتی رہنا اپنے خواب پورے۔ نکاح کے بعد پابندی تھوڑی ہو گی۔"

"بیشک پابندی نہ ہو۔ پر میں ایک دائرے میں تو قید ہو جاؤں گی" انہیں قائل نہ ہوتے دیکھ ہاتھ چھوڑ کے وہ پھر سے کمرے کے عرض و طول ناپنے لگی۔

"دیکھو منوہ! لڑکا پڑھا لکھا اور قابل ہے۔ تبھی تو بھائی صاحب نے اسے شمامہ کے لئے چنا تھا۔" طلعت بانو نے پینترا بدلا تو وہ تڑپ کے تیکھی نظروں سے انہیں گھورنے لگی۔

"ہاں اتنا قابل اور خاص کہ ان کی سگی بیٹی عین نکاح سے پہلے بھاگ کھڑی ہوئی۔" منوہ نے تنفر سے جھٹکا۔

"کیا تم نہیں چاہتی کہ تمہارے باپ نے بدنامی کا جو داغ میرے ماتھے منڈھا تھا وہ دھل جائے۔ قسمت نے موقع دیا ہے یہ ثابت کرنے کا کہ ہر کوئی ممتاز احمد جیسا احسان فراموش نہیں

ہوتا۔ میں ہاتھ جوڑتی ہوں منوہ مان جاؤ۔ میں نے تمہارے باپ کی وجہ سے بہت ندامت سہی ہے، میرے پاس کوئی وجہ تو ہو سر اٹھا کے جینے کی۔" طلعت بانو رو پڑیں تھیں۔ لوگوں کے طعنوں نے آتشیں لاوا ان کے اندر دہکا رکھا تھا جو آج ذرا سی نکاسی پا کے بہہ نکلا تھا۔ منوہ متحیر کھڑی تھی۔ اس نے اس طرح سے ٹوٹتے ہوئے انہیں تب بھی نہ دیکھا تھا جب سب کچھ سمیٹ کے اس کا باپ انہیں زمانوں کی ٹھوکروں پہ چھوڑ گیا تھا۔ وہ بے بسی سے لب کچلتی کشمکش کا شکار تھی۔

"ثابت کرو منوہ کہ تم میں تمہارے باپ کا خون نہیں بلکہ میری پرورش تمہاری رگوں میں دوڑتی ہے۔" وہ اسے جذباتی طور پہ بلیک میل کر رہی تھیں۔

"نہیں طلعت۔ تم میری بیٹی پہ دباؤ نہیں ڈالو گی۔ اگر اس کی مرضی ہوئی تو یہ نکاح ہو گا۔ ورنہ میں جا کے ابھی محتشم کو انکار کر دیتا ہوں۔ زیادہ سے زیادہ رسوائی ہی ہو گی۔ وہ تو میری اپنی اولاد کر ہی چکی ہے۔ منوہ بھی میری بیٹی ہے۔ اس لئے میں ایک کے کئے کی سزا دوسری بیٹی کو نہیں دے سکتا۔" انہوں نے شفقت سے اس کے سر پہ ہاتھ رکھا۔ وہ اچانک ہی کمرے میں آئے تھے۔

"حتمی فیصلہ تمہارا ہو گا بیٹا اور یاد رکھنا تمہارا یہ باپ تمہارے ساتھ کھڑا ہے۔" اس درجہ مان پہ منوہ کی آنکھیں بھر آئیں تھیں۔ اس نے ڈبڈبائی نظروں سے ان کے مہربان چہرے کو دیکھا اور اگلے پل ان کے فراخ سینے پہ سر رکھ دیا۔

"مجھے اپنے باپ پہ پورا بھروسہ ہے۔ وہ جو چاہیں میری زندگی کا فیصلہ کریں۔" اس نے نم لہجے میں کہتے اعظم بیگ کو معتبر کر دیا تھا۔

"جیتی رہو۔" وہ اس کا سر تھپتھپا کے کمرے سے باہر نکل گئے تھے۔

نکاح نامے پہ سائن کرتے اسے اپنے باپ کی یاد شدت سے آئی تھی۔ لیکن ان کی کمی ماموں نے آگے بڑھ کے پوری کر دی تھی۔ وہ ان کے کاندھے پہ سر رکھے ہیں اس طرح بلک بلک کے روئی کہ طلعت سمیت فاکیہ کو بھی رلا گئی۔

"تمہاری یہ قربانی میں ہمیشہ یاد رکھوں گا۔" اعظم بیگ نے اس کی تابندہ پیشانی کی چومتے ہوئے کہا۔ "یہ قربانی نہیں ہے ماموں ایک بیٹی کا فرض تھا جو میں نے پورا کیا ہے۔" قناعت سے کہتی وہ ان کی آنکھیں نم کر گئی تھی۔

طلعت بانو نے فخر سے اپنی بیٹی کو دیکھا جو برسوں بعد ان کا جھکا ہوا سر بلند کر گئی تھی۔

✦✦✦

کوئی ملال کوئی آرزو نہیں کرتا
تمہارے بعد یہ دل گفتگو نہیں کرتا
کوئی نہ کوئی مری چیز ٹوٹ جاتی ہے
تمہاری یاد سے جب بھی وضو نہیں کرتا

نکاح کے وقت وہ جیسے یہاں موجود ہی نہیں تھا۔ مولوی کیا کہہ اور پوچھ رہا تھا اسے کوئی خبر ہی نہیں تھی۔ وہ گھمبیر خاموشی کے بھنور میں ڈوبا اس ماہ جبیں کی یادوں میں غرق اسی بس ٹرمینل پہ پہنچا ہوا تھا۔

محتشم پاشا نے اس کا کندھا ہلا کے اسے متوجہ کیا تھا۔ اس نے بنا چونکے سرد اور سپاٹ نظریں اطراف میں دوڑائیں اور سامنے پھیلے کاغذات پہ یکے بعد دیگر سائن کرتا چلا گیا تھا۔ کس کس نے گلے لگایا، ہاتھ ملا کے مبارک باد دی اسے کسی شے سے غرض نہ تھی۔ وہ تو صرف خانہ پری کر رہا تھا اور جیسے ہی سب کھانے کی

طرف متوجہ ہوئے وہ بنا کسی کی طرف دیکھے باہر آ گیا۔ حالانکہ محمش پاشا نے اسے اس کی منکوحہ سے ملنے کے لئے بھی کہا تھا۔

وہ رش ڈرائیونگ کرتا سیدھا سٹوڈیو میں آیا تھا۔ ویسٹ کوٹ اتار کے پھینکتے اس نے سارا اشتعال اپنی مکمل اور ادھوری پینٹنگز پہ اتارا تھا۔ مختلف رنگوں کے ڈبے اٹھا اٹھا کے پھینکتے اس نے اسٹوڈیوز کا نقشہ بدل ڈالا۔ اشتعال تھا کہ پھر بھی ختم نہ ہوا۔ حالانکہ اس کوشش میں اس کے ہاتھ اور کپڑے بھی رنگے گئے تھے۔ اس کے اندر باہر آگ کا جنگل اُگ آیا تھا۔ وہ شاور کھول کے اس کے نیچے آ کھڑا ہوا۔ مختلف رنگ پانی کے ساتھ بہتے اس کے اشتعال کو بھی بہا کے لے جا رہے تھے۔ اگلے دن وہ اپنا مختصر سا سامان باندھے کچھ دنوں کے لئے مضافاتی علاقوں کی طرف جا رہا تھا۔ وہ فی الحال کچھ بھی یاد نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ نہ نکاح اور نہ کسی نئے وجود کو۔ وہ اپنا ہر دکھ درد برفیلی پہاڑیوں کے حوالے کر کے خود کو کھونے اور ٹوٹ جانے سے بچانا چاہتا تھا۔

✦✦✦

صبح محمش پاشا ناشتے کی ٹیبل پہ بیٹھے اخبار کی شہ سرخیوں پہ نظر ڈال رہے تھے۔

''حدثان نہیں آیا ابھی تک۔ جاؤ بلاؤ اُسے۔''

ملازم کو ناشتے کے لوازمات چنتے دیکھ انہوں نے اخبار فولڈ کر کے سائیڈ پہ رکھا اور گھڑی پہ نظر ڈالتے ملازم کو حکم صادر کیا۔

''وہ صاحب حدثان بابا تو فجر سے بھی پہلے چلے گئے۔ کہہ کر گئے ہیں کہ آپ کو بتا دوں۔ ہفتے دس دن میں لوٹ آئیں گے۔'' شکور نے ان کی پلیٹ میں آملیٹ رکھتے انہیں آگاہ کیا۔

''وہ فجر سے پہلے کہیں چلا گیا اور تم نے مجھے جگا کے بتانا بھی گوارہ نہ کیا۔'' اُس نے شکور کو خشمگیں نظروں سے گھورا۔

''وہ حدثان بابا نے منع کیا تھا۔'' شکور نے گڑبڑا کے وضاحت دی۔

''ٹھیک ہے جاؤ۔'' انہوں نے موبائل پہ حدثان کا نمبر ڈائل کرتے کہا اتنے سے میں جان چھوٹنے پہ شکور سر پہ پیر رکھ کے بھاگا تھا۔

''حد ہے۔ اتنا بڑا ہو گیا ہے مگر اس لڑکے کا بچپنا نہیں گیا۔'' اس کا نمبر پاور آف ملنے پہ وہ فون سائیڈ پہ پٹختے بڑبڑائے۔ سنگھائی کی برانچ میں کوئی گڑبڑ ہو گئی تھی انہیں [illegible] جانا پڑ رہا تھا۔ وہ جانے سے پہلے اس سے بات کرنا چاہتے تھے۔ کل بھی وہ تقریب سے جلدی اُٹھ آیا تھا اعظم بیگ اپنی الجھنوں میں الجھے ہوئے تھے۔ تبھی کچھ خاص نوٹس نہیں لیا تھا۔ البتہ مہمانوں میں ضرور چہ مگوئیاں ہوئیں تھیں۔ خیر کس طرح انہوں نے سنبھال لیا تھا۔

''شکور ڈرائیور سے کہو گاڑی نکالے اور میرا سامان بھی گاڑی میں رکھوا دو۔'' انہیں ایئرپورٹ کے لئے نکلنا تھا۔ اسی لئے سارے معمولات واپسی کے لئے رکھ چھوڑے تھے۔ اور ویسے بھی حدثان ان سے ناراض تھا۔ نہ ہی اُس نے نمبر آن کرنا تھا اور نہ ہی ان سے بات کرنی تھی۔ اب جو بھی ہونا تھا۔ ان کی واپسی کے بعد ہی ہونا تھا۔

✦✦✦

اُس نے اک طائرانہ نظر اپنے اطراف میں دوڑائی۔ ہر طرف پھیلا سبزہ، برف پوش پہاڑ جن سے ٹکرا کے سرد ہوائیں ماحول کو خنک کر رہی تھیں۔ اس کے سر پہ کھلا آسمان تھا جس پہ بادلوں کی ٹولیاں ہوا کے سنگ اڑتی پھر رہی تھیں۔ وہ خود کو آسمان پہ اڑتے پرندوں کی طرح آزاد

اور پر سکون محسوس کر رہی تھی۔
"تھینک گاڈ...... بالآخر میں ڈیڈ کے بنے ہوئے جال سے بروقت نکلنے میں کامیاب ہوگئی۔" اس نے کھلی کھلی فضا میں گہرہ سانس بھرتے خود کو شاباشی دی۔
"آئم سوری ڈیڈ...... لیکن میں شامہ بیگ ہوں میں نے اک ٹشو تک کسی کی پسند سے نہیں خریدا۔ یہاں تو معاملا ہی جیون ساتھی کا تھا۔ میرا ہمسفر ہونے کا اعزاز کسے حاصل ہوگا یہ صرف میں طے کروں گی۔ میں اپنے راستے خود چنتی ہوں۔"
وہ خود غرضی کی حد تک خود پسند لڑکی تھی۔ وہ خود کی پرستار تھی۔ قدرت نے حسن اسے بڑی فیاضی کے ساتھ عطا کیا تھا۔ اور پیدا بھی منہ میں سونے کا چمچ لیکر ہوئی تھی۔ اس کے دوست اور سرکل کے لوگ اس کے زبردست مداح تھے۔ وہ ہزاروں کی بھیڑ میں بھی جداگانہ اور سب سے نمایاں لگتی تھی۔ غرور کوٹ کوٹ کے بھرا تھا۔ اس کے لئے آہیں بھرنے والوں کی طویل قطاروں نے اسے بلاشرکت غیرے دیوی کے سنگھاسن پر لا بٹھایا تھا۔ اس کا معیار اتنا بلند ہو چکا تھا کہ خوبصورت سے بھی خوبصورت لڑکا اس کی نگاہ کو نہیں بھا سکتا تھا۔ پھر بھلا وہ بنا دیکھے کیسے کسی سے بھی شادی کرسکتی تھی۔ طے تو وہ بہت پہلے ہی کرچکی تھی کہ اسے یہ شادی کسی حال میں نہیں کرنی۔ لیکن وہ بہنام بیگ کے غصے سے بھی واقف تھی۔ اسی لئے نکاح کی تیاریوں میں بڑھ چڑھ کے حصہ لیتی رہی۔ وہ بہت سی نقدی لیکر پارلر میں تیار ہونے کے لئے گھر سے ڈرائیور کے ساتھ نکلی تھی۔ اور موقع پاتے ہی ڈرائیور کو چکما دے کر فرار ہوگئی تھی۔
وہ ایک بڑی ٹور کمپنی کے ساتھ مضافاتی علاقوں کی سیر کیلئے کالام کی طرف آگئی تھی۔ اعظم بیگ چاہ کے بھی اب اسے تلاش نہیں کر سکتے تھے۔
وہ جس جگہ کھڑی تھی اس کے عقب میں آبشار بہت بلندی سے گر رہی تھی۔ وہ ذہن میں کسی خیال کے آتے ہی پتھر پہ چڑھی۔ وہ پتھر آبشار کے کنارے پہ ہی تھا۔ اس کی ٹیم کے لوگ یہاں وہاں گھوم پھر رہے تھے۔ سامنے نشیب میں سڑک تھی جس کے کنارے کولڈ ڈرنک کارنرز بنے ہوئے تھے۔ وہاں لوگوں کا کافی رش لگا ہوا تھا۔ شامہ نے اک نظر آبشار میں جھانکا جس میں پانی تیز رفتاری سے بہہ رہا تھا۔ اس نے اسمارٹ فون کا کیمرہ آن کیا اور پتھر پہ قدم جماتے یادگار قسم کی سیلفی لینے لگی۔ آبشار کے گرنے کا منظر کچھ نمایاں نہیں تھا۔ اس نے ذرا سا رخ بدلہ اور یہی اس کی سب سے بڑی غلطی ثابت ہوئی۔ اس کا توازن بگڑا اور وہ لڑکھڑا کے نشیب کی طرف آبشار میں گرنے لگی تھی کہ کسی نے بروقت کلائی سے تھام کے اسے کھینچا۔ اسمارٹ فون ہاتھ سے چھوٹ کے پل میں گہرے پانی میں غائب ہوگیا تھا۔ وہ اتنی خوفزدہ تھی کہ مارے دہشت کے چلا بھی نہ پائی تھی۔
"غالباً آپ کا ارادہ خودکشی کرنے کا تھا۔ ورنہ اتنی اونچائی سے آپ ایسے اسٹنٹ کرنے کی کوشش ہرگز، ہرگز نہ کرتیں۔" وہ بچانے کے بعد اُسے لتاڑ رہا تھا۔ شامہ نے ہولے ہولے لرزتے آبشار سے نظر ہٹا کے اس کا ہاتھ تھامے کھڑے شخص کو دیکھا۔
حدثان نے بغور اسے دیکھا جس کی رنگت پیلے گلاب کی طرح زرد ہو رہی تھی۔ چہرے پہ خوف اور اضطراب رقم تھا۔ وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا مگر تیزی سے اس کے نین کٹوروں میں

سمندر بھرتا دیکھ لب بھینچ کے رہ گیا تھا۔ ٹورسٹ تیزی سے ان کے گرد جمع ہوئے تھے۔ اس کی غیر ہوتی حالت کے پیش نظر وہ اس کا ہاتھ تھام کے اسے اپنے ساتھ ایک طرف سرمئی پہاڑوں کے پاس لے گیا تھا۔ ایک پتھر پہ اسے بٹھا کے وہ خود کولڈ ڈرنک کارنر کی طرف چلا گیا تھا۔ وہ جب واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں منرل واٹر کی بوتل تھی۔

"پی لیں....." اس نے بوتل کا ڈھکن کھول کے اس کی طرف بڑھائی، ثمامہ نے چند گھونٹ بھرے اور بوتل واپس اسے تھمادی۔

"اگر میں گر جاتی تو میری لاش بھی نہیں ملتی۔" وہ فق چہرے کے ساتھ بولی۔

"اسی لئے کہتے ہیں خطرناک جگہوں پہ احتیاط سے رہیں۔"

اس کے قریب پتھر پہ ٹکتے اس نے نرم لہجے میں کہا۔ آنسو اس کی پلکوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگے تھے۔ حدثان نے اس کے شانے پہ ہاتھ رکھ کر تسلی دینے والے انداز میں تھپکا۔

"حوصلہ رکھیں۔ آپ ٹھیک ہیں۔ شکر کریں کوئی بڑا حادثہ نہیں ہوا۔" وہ جواب دیئے بنا سر جھکائے روتی رہی۔

"آپ اکیلی ہیں۔ آپ کی فیملی کہاں ہے؟" وہ اس کا دھیان بٹا رہا تھا۔

"میں اکیلی ہی ٹور کمپنی کے ساتھ آئی ہوں۔" آنسو پونچھتے وہ قدرے سنبھل سی گئی تھی۔

"دھیان رکھیے گا اپنا اور اپنے گروپ کے ساتھ ہی رہیں۔ یہ مرغزار جتنے خوبصورت ہوتے ہیں۔ اس سے کہیں زیادہ خطرناک بھی۔" وہ اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ وہ بے دھیانی میں اسے غائب ہونے تک دیکھتی رہی تھی۔ پھر یہ اتفاق ہی تھا کہ جس ہوٹل میں وہ ٹھہری تھی اسی میں وہ بھی تھا۔ ثمامہ نے موقع پاتے ہی اس کا شکریہ ادا بھی کر دیا تھا اور لگے ہاتھوں ڈنر کی آفر بھی کر ڈالی تھی۔ جسے حدثان نے فراخدلی سے قبول کر لیا تھا۔

ان کا ٹور مختصر تھا مگر اس مختصر سے وقفے میں وہ دونوں بہترین دوست بن چکے تھے۔

اک حادثے سے ہوئی ملاقات پہلے انسیت میں بدلی اور پھر تیزی سے چاہت کے مدار سے نکل کے محبت جیسے آفاقی اور اٹوٹ تعلق میں ڈھل چکی تھی۔

ثمامہ کا آئیڈیل مجسم اس کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔ حدثان کے جو بھی احساسات ہوں مگر وہ پور پور اس کی محبت میں ڈوب چکی تھی۔ وہ سب ماہوڈھنڈ کے کنارے وسیع و عریض سبزہ زار میں الاؤ دہکا کر بیٹھے تھے۔ وہ سب بیت بازی میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانا چاہتے تھے۔ ثمامہ بور ہونے لگی تھی۔ اسی لئے اٹھ کر ماہوڈھنڈ کے کنارے گھاس پر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر بعد اسے اپنے پاس کسی کی موجودگی کا احساس ہوا، وہ بنا دیکھے بھی آنے والے سے واقف تھی۔

"کل ہم اپنے اپنے گھروں میں ہوں گے۔" کتنی دیر خاموش رہنے کے بعد وہ بولی تھی۔ حدثان کی نظر میں سبزی مائل نیلی جھیل کے پیچھے بلند و بالا سبز پہاڑوں پہ تھیں۔ اس نے مغموم صورت سے ثمامہ کو دیکھا۔

"ہم جتنا بھی چل لیں، کبھی نہ کبھی سفر ختم کر کے واپس لوٹنا ہی پڑتا ہے....." اس کا خود کا لہجہ بجھا بجھا تھا۔

"کیا مسافر پھر سے کہیں کسی موڑ پہ ملتے ہیں؟" وہ ان بچھڑے لمحوں میں اظہار چاہ رہی

تھی۔ حد ثان کے لبوں پہ زخمی مسکراہٹ بکھری۔ جھیل کے نیلے پانی میں سورج کی سنہری کرنیں کسی پری وش کے نقوش بننے لگی تھیں۔ وہ خود کو کمپوز کرتا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ شمامہ کے اندر چھن سے کچھ ٹوٹا۔ وہ سر جھکائے سبز گھاس کو پیروں تلے روندھتا آہستہ آہستہ چلا جا رہا تھا۔ وہ لب بھینچے بے یقینی سے اسے جاتا دیکھ رہی تھی۔ کیا وہ نظر انداز کرنے اور یونہی چھوڑ کے جانے والی لڑکی تھی۔؟

اور جب وہ اسے سی آف کرنے آیا تو اس نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

''ہم ملتے رہیں گے۔ کیونکہ ہم گھروں کو ضرور لوٹ رہے ہیں مگر مسافر نہیں ہیں۔'' اس کے الفاظ نے شمامہ کے گرد دھما کہ کیا وہ ایڑھیوں کے بل گھومی اور خوشگوار حیرت سے سامنے کھڑے دلوں کو تسخیر کرتے اپالو کو دیکھا۔ وہ مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلا رہا تھا۔

✦✦✦

سنہری شام کسی پری کی مانند اپنے پنکھ پھیلائے دھیرے دھیرے سرک رہی تھی۔ شعبان کا آخری عشرہ اپنے اختتام کی طرف گامزن تھا۔ ماہِ رمضان کی بابرکت ساعتیں امت مسلمہ سے ہاتھ بھر کے دوری پر تھیں۔ ماہِ رمضان کی آمد آمد تھی مگر ابھی سے یوں لگتا تھا کہ فضاؤں میں نوری اجالا پھیلا ہوا ہے۔

اس وقت شام کی چائے پہ سبھی افراد خانہ لان میں بچھی کرسیوں پہ براجمان تھے۔ آج کتنے دنوں بعد اعظم بیگ خوشگوار موڈ میں نظر آ رہے تھے۔ تبھی موقع دیکھ کر منوہ نے اپنی جاب کے بارے میں بتا دیا تھا۔ کتنی دیر وہ خاموشی سے کچھ سوچتے رہتے تھے۔ بالآخر انہوں نے چائے کا کپ پلاسٹک ٹیبل پہ رکھا۔

''لیکن بیٹا مجھے اس بات کی سمجھ نہیں آ رہی کہ تم جاب کرنا ہی کیوں چاہ رہی ہو۔ کیا تمہارے فرائض کی ادائیگی میں مجھ سے کوئی کوتاہی ہوئی ہے۔'' وہ بڑے پریشان سے دکھنے لگے تھے۔

''نہیں ماموں جان۔ ایسا ہرگز نہیں ہے آپ نے تو ہمیشہ میرا ضرورت سے بڑھ کر خیال رکھا ہے۔ کبھی کسی چیز کی کمی نہیں ہونے دی...... منوہ نے بڑے احترام سے ان کی غلط فہمی دور کی۔ طلعت بانو اس کی خواہش سے آگاہ تھیں۔ اسی لئے پرسکون سی چائے کی چسکیاں بھر رہی تھیں۔ وہ اپنی بیٹی کی ذہانت پہ ناز کرتی تھی۔ انہیں یقین تھا وہ بھائی صاحب کو قائل کر ہی لے گی۔ فائقہ بھی بڑے غور اور دھیان سے زرد ڈوپٹے میں دمکتے اس کے گلابی مکھڑے کو تک رہی تھیں۔ وہ کبھی بھی روایتی ممانی اور بھابی ثابت نہیں ہوئیں تھیں۔

''تو پھر بیٹا ایسی کونسی ضرورت آ پڑی ہے کہ تم نوکری کرنا چاہتی ہو۔ اگر پیسوں کی ضرورت ہے تو بولو میں ابھی دے دیتا ہوں۔''

''مجھے پیسوں کی ضرورت نہیں ہے ماموں جان۔ آپ ہر طرح سے ہمارا خیال رکھتے ہیں۔ پر میں خود کچھ کرنا چاہتی ہوں۔ اپنے پیروں پہ خود کھڑی ہونا چاہتی ہوں۔ میں بڑی ہو گئی ہوں۔ اس لئے اپنا اور امی کا بوجھ خود اٹھانا چاہتی ہوں'' منوہ نے بڑے سکون سے اپنا موقف ان کے سامنے رکھا تھا۔

''ہوں......'' اعظم بیگ نے سمجھتے ہوئے ہنکارا بھرا۔

''اگر ایسا ہے تو تم کل سے آفس جوائن کر سکتی ہو۔'' انہیں اس کے خیالات جان کر اچھا لگا تھا۔

"ہرگز نہیں ماموں جان! آپ کے آفس میں مجھے آپ کی بھانجی ہونے کے تحت اپائنٹ کیا جائے گا۔ جبکہ میں خود اپنی صلاحیت منوا کر جاب حاصل کرنا چاہتی ہوں۔" وہ قطعیت سے بولی تھی۔ اعظم بیگ تذبذب کا شکار دکھائی دینے لگی تھی۔

"بچی کی خوشی جس میں ہے اسے وہی کرنے دے۔" فاکیہ نے بھی اس کی طرفداری کی تھی۔

"تم کیا کہتی ہو طلعت۔" انہوں نے بہن کی رائے جاننی چاہی۔

"مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ جیسا آپ مناسب سمجھیں۔"

انہوں نے ہمیشہ کی طرح بڑے بھائی کی مرضی پہ سب چھوڑ دیا۔

"تو کہیں یہ اپلائی کیا پھر؟" اعظم بیگ نے چائے کا کپ اٹھاتے استفسار کیا۔ ایک طرح سے اپنی رضامندی ظاہر کر دی۔ انہیں بھانجی کی خودداری بڑی عزیز تھی۔ منوہ کا چہرہ خوشی کے مارے گلاب کی طرح کھل اٹھا۔

"تھینک یو سو مچ ماموں جان" وہ چہکتی ہوئی ان کی کرسی کے پیچھے جا کے ان سے لپٹ گئی۔ انہوں نے دھیرے سے اس کا گال تھپتھپایا۔

وہ اب انہیں اپنی جاب کی بابت بتا رہی تھی۔ تبھی ملازم کارڈلیس اٹھائے لان میں ان کے پاس آیا۔ اعظم بیگ جوں جوں سنتے جا رہے تھے ان کی رنگت متغیر ہوتی جا رہی تھی چہرے پہ بے نام سا کرب سمٹ آیا تھا۔ تینوں خاموشی سے ان کا پریشان چہرہ دیکھتی رہیں۔

"کیا ہوا اعظم؟ کس کا فون تھا؟ سب خیریت تو ہے؟" کال سننے کے بعد بھی وہ گم صم بیٹھے رہے تو فاکیہ نے سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔

"ایکسیڈنٹ ہوا ہے ثمامہ کا۔ کسی ٹور سے واپس آ رہی تھی۔" وہ کسی نادیدہ نقطے پہ نظریں جمائے کہہ رہے تھے۔ فاکیہ کو لگا ان کی جان نکل گئی ہو وہ بے آواز رونے لگی تھیں۔ طلعت بانو انہیں سنبھالنے لگیں۔

"کہاں اور کیسی ہے اب وہ۔" منوہ مضبوط اعصاب کی مالک تھی۔ اسی لئے خود کو سنبھالتے ان سے پوچھا تھا۔

"یہیں اپنی کسی دوست کی طرف ہے۔ ایک ہاتھ پہ پلاسٹر چڑھا ہے اور ایک پیر بھی فریکچر ہوا ہے......" وہ گھٹے گھٹے لہجے میں کہہ رہے تھے۔ اس کا دیا زخم ابھی تازہ تھا مگر اس کی تکلیف کا سنتے ہی وہ بے چین سے ہو گئے تھے۔

"تو چلتے ہیں اعظم اسے لینے۔ نجانے کتنی تکلیف میں ہو گی میری بچی۔" فاکیہ تو فی الفور اٹھ کھڑی ہوئیں۔ طلعت بانو نے بھی تقلید کی۔

"اس سے تو کم میں ہو گی جتنی مجھے دی تھی۔" ان کے زخم ہرے ہونے لگے تھے۔ منوہ نے بغور انہیں دیکھا۔

"وہ بیٹی ہے آپ کی۔ اس وقت تکلیف میں ہے۔ یہ وقت گلے شکوے کرنے کا نہیں ہے ماموں جان۔ ممانی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ اسے ہماری ضرورت ہے۔ اسے واپس لے آتے ہیں۔" وہ ان کے ہاتھ نرمی سے دباتے کہہ رہی تھی۔ ایک طرف بیٹی کی نافرمانی اور ہٹ دھرمی تھی اور دوسری طرف اس کی تکلیف۔ ان کے اندر کا باپ انگڑائی لیکر جاگا تھا۔ وہ گہرا سانس بھرتے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

❖ ❖ ❖

تم نے دیکھا ہے کبھی چاند پر بہتا پانی
میں نے دیکھا ہے یہ منظر اس کے رخسار پہ اکثر

اس نے دس دن بعد آفس جوائن کیا تھا۔ محتشم پاشا بھی نہیں تھے۔ اسی لئے بہت سا کام پینڈنگ پڑا ہوا تھا۔ اُس نے پاور سیٹ سنبھالتے سب سے پہلے منیجر کو کمرے میں طلب کیا تھا۔ ہفتے بھر کی رپورٹ سے وہ مطمئن تو نہیں ہوا تھا لیکن چند ضروری ہدایت کر کے انہیں سیکرٹری کو بھیجنے کا کہا تھا۔

''اور ہاں مس نتاشہ کو کہیے رمضان میں ہونے والی آرٹ ایگزیبیشن کی ڈیٹیل والی فائل بھی لیتی آئیں۔''

وہ جانتا تھا اسے اب سر کھجانے کی بھی ضرورت نہیں ملنے والی اسی لئے وہ ایگزیبیشن کی ڈیٹیل آج ہی دیکھنا چاہتا تھا۔

''سر مس نتاشہ کی شادی ہو چکی ہے۔ وہ ریزائن کر گئی تھیں......'' منیجر نے بتایا۔

''تو کیا ابھی تک کسی کو اپائنٹ نہیں کیا گیا'' اس نے سامنے کھلی فائل پرے سرکائی۔ پیشانی شکن آلود ہو گئی تھی۔

''جی سر آپ کی ریکوئرمنٹ کے مطابق سکرٹری اپائنٹ کر لی گئی ہے۔'' وہ قدرے خائف ہوتے بولا۔

''ٹھیک ہے بھیجیں میرے پاس۔'' اس نے اطمینان بھری سانس خارج کی۔ منیجر سر ہلاتے باہر نکل گیا۔ حدثان پاشا جتنا مرضی ملازمین کا خیال رکھتا ہو مگر کام کے معاملے میں وہ کوئی کوتاہی برداشت نہ کرنے والا سخت گیر باس تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی غیر موجودگی میں بھی ہر کام منظم طریقے سے چل رہا تھا۔

اس کے موبائل فون کی اسمارٹ اسکرین روشن ہوئی اور شامہ کالنگ کے الفاظ جگمگانے لگے۔ اتنے کام کے بیچ بھی اس کے چہرے پہ مدھم مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اس نے کال ریسیو کی اور پاور سیٹ سے اُٹھ کے کھڑکی کے پاس آ کھڑا ہوا۔ سلائیڈنگ ہٹائی تو نرمی سنہری دھوپ نے اس کا استقبال کیا۔

''جی محترمہ فرمائیں۔'' وہ بشاش لہجے میں بولا۔

''ڈیڈ مجھے گھر واپس لے آئیں ہیں کل تمہیں یہی بتانے کے لئے کال کی تھی مگر تمہارا نمبر بند جا رہا تھا۔'' وہ چہک کر کہتی آخر میں شکوہ کر گئی تھی۔

''تھکن اتنی تھی کہ آتے ہی سو گیا تھا۔ اور بھرپور نیند لینے کے لئے فون کا بند ہونا ضروری تھا۔ خیر تم بتاؤ کیسا ہوا پھر تمہارا ویلکم؟'' اسے وضاحت سے جواب دیتے اک نظر افق پہ ڈالی۔ صاف ستھرے آسمان پہ اڑتے سفید پرندے بڑے بھلے معلوم ہو رہے تھے۔

''خوب بھاری ڈانٹ پڑی اور پھر سب نارمل ہو گیا۔ اور ویسے بھی ڈیڈ کی آدھی ناراضی تو مجھے زخمی دیکھ کر ہی ختم ہو گئی''۔

''اوہ سوری۔ اصولاً تو مجھے پہلے تمہاری خیریت معلوم کرنی چاہئے تھی۔'' وہ شرمندہ ہوا تھا۔

''اب کیسی ہو تم'' احساس ہوتے ہی اس نے فوراً اس کی خیریت معلوم کی۔ شامہ کی کھنکتی ہوئی ہنسی اسپیکر میں ابھری۔

''ایک ہفتے کا بیڈ ریسٹ ہے۔ پیر کی موچ تو ٹھیک ہے۔ مگر ہاتھ کا پلاسٹر بڑا تنگ کر رہا ہے۔'' وہ اسے بتاتی اپنے پلاسٹر زدہ ہاتھ کو گھورنے لگی۔ جس کے سبب وہ کمرے میں محصور ہو کر رہ گئی تھی۔

''اوہ سیڈ'' حدثان نے اتنا ہی کہا۔ تبھی اس کی پشت پر دروازہ کھلا اور ایک نسوانی وجود اندر داخل ہوا۔

"ٹھیک ہے تم بیڈ ریسٹ کرو اور احتیاط سے دوائیں لو انشاء اللہ جلدی ہی ٹھیک ہو جاؤ گی۔" اس نے الوداعی کلمات ادا کئے اور کھڑکی کے سامنے سے ہٹا۔ سنہری تیز دھوپ نے راستہ ملتے ہی اس کے پیچھے کھڑے وجود کو مکمل طور پر ڈھانپ لیا۔ دھوپ جیسے ہی چہرے پہ پڑی اس نے فائل جو ہاتھ میں پکڑ رکھی تھی۔ وہ چھوڑی اور دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیا۔ فائل گرنے پہ حدثان چونکا۔ فون کو گلاس ٹاپ میز پہ رکھتے اس نے محویت سے سامنے کے منظر کو دیکھا۔

وائٹ اور لیمن لان کے پرنٹڈ سوٹ میں وہ جو کوئی بھی تھی اس وقت اس کے وجود سے روشنیاں پھوٹی پڑ رہی تھیں۔

حدثان نے گلا کھنکھار کے کمرے میں پھیلی فسوں خیز خاموشی کو توڑا۔

لانبی مخروطی انگلیوں والے ہاتھ دھیرے سے ہٹے۔ فسوں گھٹنے کے بجائے مزید بڑھنے لگا۔ سنہری دھوپ کا عکس اس کے چہرے پہ واضح تھا۔ یہ خواب تھا نہ وہم۔ وہ حقیقتاً اس کے سامنے کھڑی تھی۔ حدثان قدم قدم چلتا اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ اب دھوپ کے راستے میں حدثان حائل تھا۔ اس کے عقب سے چھن کے آتی دھوپ ہر منظر کو واضح اور مزید تابناک بنا رہی تھی۔ اس کا ہاتھ بے ساختگی میں اٹھا۔ اور گلابی گال کی ملائمت پہ آ رکا۔ وہ جیسے اپنے خواب کو چھو رہا تھا۔

منو تڑپ کے دور ہٹی۔ اُس کے گال نے دہکتا انگارہ چھو لیا تھا۔ اس کی مغلئی بڑی بڑی روشن آنکھوں سے پہلے حیرت پھر بے یقینی اور بعد میں غصہ چھلکنے لگا۔ وہ مڑی اور دروازہ کھول کے باہر بھاگ گئی۔ پیچھے کھڑے حدثان نے اپنے خالی رہ جانے والے ہاتھ کو گھورا، مگر وہ خالی کہاں تھا۔ اس نے اس چاند کو چھو لیا تھا جو نجانے کب سے اس کی پلکوں پہ خواب سا ٹنگا تھا۔

ہاں وہ وہی تھی۔ جس سے اس کا ملن آسمانوں پہ عالم ارواح میں ہوا تھا۔ پھر وہ اس سے بچھڑ گئی تھی۔ اور آج اس کا بچھڑا ہوا گمشدہ اس کی ذات کا حصہ واپس مل گیا تھا۔

اس نے جھک کے نیچے گری فائل اٹھائی۔ وہ ہمیشہ اس کے لئے کچھ چھوڑ کے جاتی تھی۔ پہلی ملاقات میں پھول اور آج یہ فائل۔ لیکن وہ شاید ناراض ہو کے گئی تھی۔ وہ بے اختیار بے چین سا دروازے کی طرف بڑھا آج ہی تو وہ ملی تھی بھلا ناراض کیسے رہنے دے سکتا تھا وہ۔

✦✦✦

معذرت … کر نہیں پاتیں
کچھ خطائیں عجیب ہوتی ہیں

وہ بھاگتی ہوئی اپنی سیٹ تک پہنچی تھی۔ تنفس اتنا تیز تھا کہ دل کی دھڑکن کے سوا کچھ بھی سنائی نہیں دے رہا تھا۔ گال پہ انجان لمس دہکتا ہوا اسے رلا رہا تھا۔ وہ اتنا کیوں رو رہی تھی اسے خود بھی خبر نہیں تھی۔ اس کی پوزیشن بے حد آکورڈ ہو چکی تھی۔ کتنے چہرے حیرانی اور تجسس سے اس کی طرف متوجہ تھے وہ بے خبر نہیں تھی۔ مگر نجانے ایسا کیا تھا جو اس کا دل بار بار بھر آ رہا تھا۔

"میں یہاں جاب نہیں کروں گی......"

ہتھیلی سے تر گال رگڑتے اس نے خود سے عہد لیا اور سرعت سے اپنا استعفیٰ ٹائپ کرنے لگی۔

"آپ ریزائن نہیں کر سکتیں۔" وہ جانے کب اس کے پاس آ کھڑا ہوا تھا۔ اس نے بڑی بڑی آنکھیں اٹھائیں۔ سرخ ڈوروں سے سجی آنکھوں میں اب بھی آنسو تیر رہے تھے۔ حدثان کا دل ان نین کٹوروں میں ڈوب گیا۔

"اور مجھے ایسا کرنے سے آپ تو ہرگز نہیں روک سکتے۔"

وہ بھیگے نم لہجے میں کہہ رہی تھی۔ حدثان پہلے چونکا اور پھر مسکرایا۔

"کمپنی تو روک سکتی ہے۔ جس کے ساتھ آپ نے ایگری منٹ سائن کیا ہے۔ جس کی رو سے آپ ریزائن کرنا بھی چاہیں تو ایک ماہ قبل کمپنی کو آگاہ کرنا پڑتا ہے۔" وہ بڑے سکون سے چہرے پہ مسکراہٹ سجائے اسے بے سکون کر گیا تھا۔

"اگر آپ پھر بھی ایسا کریں گی تو مجبوراً ہمیں آپ پر کیس کرنا پڑے گا۔" وہ اُسے خوفزدہ کرنا چاہ رہا تھا تو کامیاب ہو چکا تھا۔ منوہ اس کی دھمکی سے نہیں ڈری تھی بلکہ اس احساس سے ڈر گئی تھی کہ اگر اُس پہ کیس ہو گیا تو اس کا اپنے پیروں پہ کھڑے ہونے کا دعویٰ بھربھری ریت کی طرح ڈھے جائے گا۔

"کیا اب بھی آپ ایسا کچھ سوچ رہی ہیں۔" وہ اپنی مسکراہٹ ضبط کرتا اس کی حالت سے حظ اٹھا رہا تھا۔ اس نے گردن کو نفی میں جنبش دی۔

"گڈ" اس کی سادگی پہ حدثان کے دل میں نرم سا احساس جاگا۔

"چہرہ دھو کر میرے آفس میں آئیں۔" وہ جیبوں میں ہاتھ ڈالے واپسی کے لئے پلٹا۔

"لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ آپ......" اس نے دانستہ لب کاٹتے جملہ ادھورا چھوڑ دیا تھا۔ حدثان نے مسکراہٹ ضبط کر کے قدم آگے بڑھائے۔ وہ اس کا اشارہ سمجھ گیا تھا۔ اگر اسے یہ غلط فہمی تھی کہ وہ اپنی حرکت پہ معافی مانگے گا تو یہ اس کی خوش فہمی ہی ثابت ہوئی تھی۔ وہ غصے سے ناک پھلائے اور بھنوئیں سکیڑے اس کی پشت کو گھور رہی تھی۔

وہ صرف اکیلی پی۔ اے ہی نہیں تھی بلکہ پرسنل ایڈوائزر بھی تھی۔ بلڈنگ کے لاسٹ فلور پہ اک آرٹ گیلری بنا کے اسے آفس سے الگ تھلگ کر دیا گیا تھا۔ جہاں ہر سال نہ صرف حدثان پاشا کہ بلکہ ملک کے محنتی اور نئے ابھرتے مصوروں کے فن پارے پیش کئے جاتے تھے۔ آٹھ اپریل کو حدثان کی برتھ ڈے تھی جو کہ رمضان میں آ رہی تھی۔ اس نے وہی دن ایگزیبیشن کے لئے چنا تھا۔ وقت بہت کم رہ گیا تھا۔ اور اسی حساب سے مصروفیت بھی بہت زیادہ تھی۔ کام میں بزی ہو کے وہ سب کچھ بھول چکی تھی۔ حدثان نے ایگزیبیشن کا سارا کام اس کے ذمے ڈال دیا تھا۔

✦✦✦

رمضان کا چاند نظر آیا اور امتِ مسلمہ عبادات میں مصروف ہو گئی۔ یہ وہ واحد مہینہ تھا جس میں سحری اور افطاری کی ساری تیاریاں فاکیہ اور طلعت مل کے سنبھال لیتی تھی۔ باقی گیارہ مہینے خانساماں کے ہاتھ کا ہی کھانا کھانے کو ملتا تھا اور کوئی نہ سہی مگر منوہ کی عید سے پہلے عید ہو جاتی تھی۔ اسے اپنی امی کے ہاتھ کا ذائقہ بہت پسند تھا اور یہ پورا مہینہ وہ ان کے ہاتھ سے بنے سادہ سے کھانوں سے لطف اٹھاتی۔ پہلے وہ ان کے ساتھ کچن کی کچھ ذمہ داری بھی اٹھا لیتی تھی مگر جب سے جاب میں مصروف ہوئی تھی اس کا کچن میں جانا نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا۔ البتہ اس نے عبادات کے معاملے میں کوئی کمپرومائز نہیں کیا تھا۔ یہ وہ مہینہ تھا جس میں اس کی خواہش ہوتی تھی کہ وہ کم سے کم سوئے اور اپنا زیادہ وقت قرآن پاک کی تلاوت اور نوافل کی ادائیگی میں گزارے۔

رمضان کے سبب آفس کی ٹائمنگ تبدیل ہوگئی تھی مگر اس پہ ذمہ داری تھی اس لئے وہ افطاری سے کچھ دیر پہلے ہی لوٹ پاتی۔ حدثان پاشا نے اسے آفر بھی کی تھی کہ وہ آرام سے افطاری آفس میں کرلیا کرے مگر منوہ کسی بھی قیمت پر بھی نہیں مانی۔ اسے افطاری میں ہلکے پھلکے اور سادہ سے کھانے کھانے کی عادت تھی جبکہ آفس میں سب کچھ کھلے تیل میں تلا ریڈی میڈ منگوایا جاتا تھا۔

گھر میں سبھی روزے رکھ رہے تھے سوائے شامہ کے۔ وہ پہلے بھی مارے باندھے کبھی روزہ رکھ لیا کرتی مگر اب تو وہ بیڈ ریسٹ پر بھی تھی۔ البتہ وہ آدھے پاکستانیوں کی طرح جمعۃ المبارک کا روزہ ضرور رکھتی تھی۔

آج کا دن منوہ کے لئے بہت خاص تھا۔ کیونکہ آج اسے اپنی محنت کا پھل ملنے والا تھا۔ آج ایک تو جمعۃ المبارک تھا۔ دوسرا حدثان پاشا کی سالگرہ اور تیسرا آج کے دن ہی ایگزیبیشن تھی۔

وہ چھ بجے ہی آرٹ گیلری پہنچ گئی تھی۔ حدثان جب آیا تو وہ بے حد مصروف تھی۔ کیسا عشق تھا اسے کام کے ساتھ بے حد تھکن کے باوجود بھی۔ اُس کی پیشانی پہ ایک ناگوار شکن تک نظر نہیں آتی تھی۔ روزے کے باوجود وہ سب کا خیال رکھنا اپنا فرض سمجھتی تھی۔ وہ اس کی محبت میں تو پہلے ہی مبتلا تھا۔ مگر یہ محبت بہت تیزی سے عشق کی حدود میں داخل ہو رہی تھی۔ وہ بھلا بیٹھا تھا کہ اس کی کوئی منکوحہ بھی ہے۔ جس کے نام تک سے بھی وہ واقف نہ تھا۔ ہاں البتہ یہ جانتا تھا کہ وہ بہنام بیگ کی اکلوتی بیٹی تھی۔ جس سے کبھی ملاقات تک نہ ہوئی تھی۔ اور یہی حال منوہ کا تھا۔ اس نے صرف تمش پاشا کو دیکھا تھا۔ ان کے بیٹے کا کیا نام ہے اور وہ کیسا دکھتا ہے۔ اس بارے میں اس کی معلومات بھی صفر تھی۔ نکاح کے وقت وہ اس قدر انتشار اور ذہنی دباؤ کا شکار تھی کہ اک نظر اٹھا کے اس نے خود کے ساتھ جڑنے والے شخص کا نام تک نہ دیکھا تھا۔

اور ان دونوں کی یہی بے خبری انہیں کتنے بڑے نقصان سے دو چار کرنے والی تھی۔ وہ لاعلم تھے۔ برے وقت کی آہٹیں ان کے بہت قریب رقص کرنے لگی تھیں۔

''میں اتنا بھی ظالم نہیں ہوں جتنا آپ ثابت کرنے پہ تلی ہیں۔'' وہ پینٹنگز کے پرائس ٹیگ چیک کر رہی تھی جب وہ اس کے عقب میں کھڑا خفگی سے کہہ رہا تھا۔

''مطلب؟'' وہ نوٹ پیڈ پہ کچھ لکھتی الجھن سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''آپ روزے کی حالت میں اتنا کام کریں گی تو سب یہی سمجھیں گے کہ میں بہت ظالم قسم کا باس ہوں۔'' پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اس نے پرشوق نظروں سے اسے دیکھا۔

وہ سفید گھٹنوں تک آتی فراک اور سفید ہی اسکارف حجاب کی طرح اوڑھے بہت معصوم اور معتبر لگ رہی تھی۔ اُس کے چہرے پہ چھائی پاکیزگی اسے سب سے نمایاں اور خاص ثابت کرتی تھی۔ بظاہر وہ سب سے فرینکلی ہو کے ملتی تھی مگر نجانے اس میں ایسا تھا کیا کہ سبھی اس سے احترام کے دائرے میں رہ کر پیش آتے تھے۔

''ایسا لوگ سمجھتے ہیں۔ میں نہیں۔ میں وہی کرتی ہوں جو میری ذمہ داری ہے اور بس۔'' وہ بہت عاجزی سے کہہ رہی تھی۔ اس میں اور اس کی باتوں میں ایسا سکون تھا کہ وہ کسی کی بھی مسیحائی پہ پورا اتر سکتی تھی۔

حدثان کی کال آرہی تھی۔ وہ سننے کے لئے سائیڈ پہ چلا گیا تھا۔ منوہ نے اک چور نظر اس پہ ڈالی۔ وہ اپنی عادت کے مطابق ایک ہاتھ پینٹ کی جیب میں ڈالے آہستہ قدموں سے فون کان سے لگائے دور جا رہا تھا۔ بعض لوگ اور چیزیں ہمیں چاہے جتنی مرضی پسند آئیں۔ مگر وہ ایسے حالات میں ملی ہوتی ہیں کہ ہم چاہ کے بھی انہیں اپنی زندگی میں شامل نہیں کر پاتے۔ ان کا دور جانا اور ان سے دور رہنا ہی بہتر ہوتا ہے۔

ایگزیبیشن توقعات سے بھی بڑھ کے کامیاب رہی تھی۔ حدثان سے زیادہ منوہ خوش تھی۔ وہ بار بار نم آنکھوں کو پونچھتی اللہ کا شکر ادا کر رہی تھی۔ حدثان کی نظریں اس کی گلابی مکھڑے پہ بار بار بھٹک رہی تھیں۔ وہ انجان نہیں تھی مگر بن رہی تھی۔ انجان رہنے میں ہی بھلائی تھی۔ مگر وہ بلا کا ہینڈسم بندہ جب اونچے قہقہے لگاتا تو اس کا دل ہتھیلی میں دھڑکنے لگتا۔ خود سے بھی نظریں چراتی وہ کنفیوژ ہوتی اور ریزرو ہو جاتی۔

آج کی افطار پارٹی حدثان کی سالگرہ کی خوشی میں تھی۔ یہ منوہ کی زندگی کی پہلی افطاری تھی جو وہ گھر والوں کے بنا باہر افطار کر رہی تھی۔ حدثان بڑے غیر محسوس انداز میں اس کا دھیان رکھ رہا تھا۔ پہلی ملاقات کی بے اختیاری کے بعد وہ بڑا محتاط ہو کے اس سے ملتا تھا۔

بظاہر گفٹ اسے ملنے چاہئے تھے مگر وہ خود اپنے اسٹاف میں تحائف تقسیم کر رہا تھا۔

''میرا گفٹ'' وہ جو سب میں گفٹ بانٹ رہا تھا منوہ کے سامنے دست طلب دراز کیے کھڑا تھا۔ وہ ایسے موقعوں پہ بونق بن جاتی تھی اور ننھی بچی لگنے لگتی تھی۔

وہ گفٹ نہیں لائی تھی۔ اسے یاد ہی نہیں رہا تھا یا پھر اس نے گفٹ دینے کا سوچا ہی نہیں تھا۔ اس نے شرمندہ ہوتے ٹیبل پہ دھرے واز سے سفید گلاب کے پھول کی کلی نکالی اور اس کی طرف بڑھا دی۔

''فی الحال میں یہی دے سکتی ہوں۔ مجھے معلوم نہیں تھا آپ گفٹ مانگ کے لیتے ہیں ورنہ ضرور لے آتی۔'' وہ پھول دینے کے بعد جتانا نہیں بھولی تھی کہ اس کے مانگنے پہ صرف دے رہی ہے۔ حدثان نے مسکراہٹ ضبط کی۔ اس نے ہر رنگ کے پھولوں سے سجے واز میں سے سفید پھول ہی کیوں دیا تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا۔

''کوئی بات نہیں۔ تمہاری پرانی عادت ہے۔'' پہلی ملاقات کا حوالہ دیتے اس کے پاس سے ہٹ گیا تھا وہ۔

✦✦✦

دور تک وادیاں ہیں پھولوں کی
میری آنکھوں میں عکس تیرا ہے
چاند نکلنے لگا ہے پانی سے
ہر طرف سانولا سویرا ہے

شمامہ نے دل کھول کے خود پہ اسپرے کیا اور پھر ایک نظر آئینے میں خود کو دیکھا۔ جینز پہ سرخ شرٹ پہنے اور نفاست سے کئے گئے میک اپ میں نظر لگ جانے کی حد تک حسین اور دلکش لگ رہی تھی۔

آج حدثان کی برتھ ڈے تھی۔ اس نے ایگزیبیشن میں اسے انوائٹ کیا تھا۔ چونکہ آج جمعۃ المبارک تھا اور اس نے روزہ بھی رکھا تھا اس لئے آنے سے معذرت کر لی تھی مگر وہ ڈنر اس کے ساتھ کرنے پہ اسے راضی کر چکی تھی۔ اس کا ہاتھ پلاسٹر سے تو آزاد ہو چکا تھا مگر درد ابھی باقی تھا۔

خیر وہ اپنی من پسند ہستی کے لئے اتنا درد تو

برداشت کر ہی سکتی تھی۔

وہ دونوں اس وقت اوپن ایئر ریسٹورنٹ میں بیٹھے تھے۔ کھانا سرو ہونے میں ابھی کچھ دیر باقی تھی۔ ڈنر سے پہلے شامہ نے کیک آرڈر کیا تھا۔ جو اس کے بے حد اسرار پہ اس نے کاٹ دیا تھا۔ وہ بچوں کی طرح تالیاں پیٹ رہی تھی اور حدثان اس کی خوشی دیکھ کر خود خوش ہو رہا تھا۔

''کیا سوچ رہے ہو؟'' ڈنر کے بعد وہ دونوں سی ویو آ گئے تھے۔ خوشگوار ٹھنڈی میٹھی ہوا چل رہی تھی۔ اسے گم صم اپنے ساتھ ٹہلتے دیکھ وہ استفسار کیے بنا نہ رہ سکی تھی۔

''آئم میرڈ۔'' وہ اس کے اچانک کہنے پہ رک سی گئی قدم جیسے زمین نے جکڑ لیے تھے۔

''مذاق سوچ سمجھ کے کرتے ہیں حدثان۔'' اگلے ہی پل وہ خود کو سنبھال گئی۔ وہ یہ سب مذاق سمجھ رہی تھی۔

''مذاق میں نے انہیں بلکہ زندگی نے میرے ساتھ کیا ہے۔ جسے میں نے چاہا وہ مجھے تب ملی جب میرے اختیار میں کچھ بھی نہیں رہا تھا۔'' وہ شکستہ لہجے میں کہہ رہا تھا۔ شامہ کو ٹھوکر لگی۔ حالانکہ راستے میں نہ کوئی رکاوٹ اور نہ پتھر تھا۔ وہ سنبھل گئی تھی۔ مگر کچھ تھا جو بہت تیزی سے زمین بوس ہوا تھا۔

''اچھا...... تم نے پہلے نہیں بتایا۔ کیسی ہے؟ یقیناً بہت خوبصورت ہوگی۔'' وہ چاہتے ہوئے بھی اپنے لہجے کو کانپنے سے روک نہیں پائی تھی۔

''پتہ نہیں۔ صرف اتنا پتہ ہے کہ بابا کے دوست ہیں اعظم بیگ انکل کی اکلوتی بیٹی ہے۔ نام کیا ہے؟ کیسی دکھتی ہے؟ کچھ معلوم نہیں؟'' وہ اس کی طرف دیکھے بنا کہہ رہا تھا۔ شامہ کا سر چکرانے لگا۔

''وہ تو نکاح سے بھاگ گئی تھی۔ پھر یہ سب کیا تھا۔''

''ایکچولی میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں۔ مجھے جانا پڑے گا۔'' وہ اسے آندھیوں کی زد میں چھوڑ کے خود لمبے لمبے ڈگ بھرتا اپنی گاڑی کی طرف چلا گیا تھا۔

وہ جن حالوں میں گھر لوٹی تھی۔ صرف وہی جانتی تھی۔ لان کی کرسیوں پہ فاکیہ اور طلعت بانو اسی کے انتظار میں جاگ رہی تھیں۔ وہ دونوں اسے آتا دیکھ پر سکون ہو گئی تھیں۔

''میرے چلے جانے کے بعد اس دن گھر میں کیا کوئی نکاح ہوا تھا۔'' وہ فاکیہ کے سامنے کھڑی پوچھ رہی تھی۔ فاکیہ سمیت طلعت بانو نے بھی چونک کے اسے دیکھا۔

''ہاں ہوا تھا لیکن تم کیوں پوچھ رہی ہو؟''

''کس کا......؟'' وہ فاکیہ کا سوال نظر انداز کر گئی تھی۔

''منوہ کا......'' جواب طلعت بانو نے دیا۔

''منوہ کا......'' وہ ایک قدم پیچھے ہٹی۔ اک آنسو ٹوٹ کے تیزی سے گال پہ پھسلتا چلا گیا۔ وہ اندر کی طرف بھاگی۔

''کیا ہوا ہے؟ بتاؤ تو سہی؟'' فاکیہ اسے پکارتی رہ گئیں تھیں۔

وہ کمرے کا دروازہ لاک کر کے بیڈ پہ ڈھیر ہو گئی تھی۔ صبح وہ کتنی خوش تھی۔ اور کچھ گھنٹے قبل حدثان کے ساتھ ڈنر کرتے اور سی ویو پہ چہل قدمی کرتے بھی وہ ہواؤں میں اڑ رہی تھی۔ اور اب وہ ریزہ ریزہ ہوئی خود کو بکھرتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

منوہ اس کے لیے صرف پھپھو کی بیٹی اور ماموں کی بھانجی کے علاوہ کبھی کچھ نہیں رہی تھی۔ اس کی وجہ سے اعظم بیگ کی توجہ بٹی تھی۔ وہ اپنی محبت میں اسے بھی شامل کر چکے تھے۔ وہ

"محبت" جس پہ صرف اس کا حق تھا۔ اس میں منوہ بھی شامل ہو چکی تھی۔ منوہ سے نفرت کرنے کی اس کے پاس بہت سی وجہیں تھیں۔ اور آج ان وجوہات میں اک اور اضافہ ہو گیا تھا۔ پوری دنیا کو چھوڑ کر اس کا دل جس لڑکے پہ آیا اسے منوہ کا ہوتا دیکھنا اسے ہرگز گوارہ نہ تھا وہ تو اپنی جیسی چیزیں یا کپڑے کبھی بھی اسے استعمال نہیں کرنے دیتی تھی۔ پھر حدثان کو اس کے حوالے کیسے کر دیتی۔

اب تک جو برا ہوا تھا۔ اس میں صرف اچھا یہ تھا کہ حدثان اسے اپنی منکوحہ سمجھ رہا تھا اور اس بات سے کیسے فائدہ اٹھانا تھا یہ وہ بخوبی جانتی تھی۔

✦✦✦

صبح سحری کی ٹیبل پہ جب شامہ بھی آئی تو سب نے خوشگوار حیرت میں گھر کر اسے دیکھا تھا۔ جب سے وہ گھر واپس لوٹی تھی سبھی نے اس میں تبدیلی نوٹ کی تھی۔ اور آج تو سب کا خوشی سے حال ہی جدا لگا نہ تھا۔ خلعت نے "ماشاء اللہ" کہا۔ اور فاکیہ نے آگے بڑھ کے اس کی پیشانی ہی چوم لی۔ اعظم بیگ مسکرا دیئے جبکہ منوہ نے کوئی خاص نوٹس نہ لیا تھا۔

وہ کتنی دیر سے شامہ کی چبھتی نظریں خود پہ گڑھی محسوس کر رہی تھی۔ وہ پہلے تو نظر انداز کرتی رہی لیکن بعد ازاں اسے الجھن سی ہونے لگی تھی۔ وہ جلدی سے سحری کر کے وضو کرنے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

اس کی روٹین تھی کہ وہ فجر ہمیشہ لان میں کھلے آسمان تلے ملگجے اندھیرے میں ادا کرتی تھی۔ اسے اندھیرے میں ڈوبا ٹمٹماتے تاروں سے بھرا آسمان بہت اچھا لگتا پھر جیسے ہی سپیدۂ سحر کی لکیر نمودار ہوتی اور ایک ایک کر کے تارے غائب ہونا شروع ہوتے وہ اٹھ کے تھوڑی دیر چہل قدمی کرتی اور پھر اپنے کمرے میں آ کے قرآن پاک کی تلاوت کر لیتی تھی۔

آج بھی وہ وضو کر کے جائے نماز ہاتھ میں اٹھائے لان میں آئی تو اپنے پیچھے آتی شامہ کو دیکھ کر ٹھٹھک گئی۔

"سنا ہے تمہارا نکاح ہو گیا۔ وہ بھی میرے ایکس منگیتر سے۔ ویسے تو بڑی خودداری کا ڈھونگ رچاتی پھرتی ہو اور میری ہی اترن پہن لی۔" وہ زہر اگلنا شروع ہو چکی تھی۔ منوہ کے اندر غبار سا بھرنے لگا۔

"وہ منگیتر جس سے بچنے کے لئے تم اپنے باپ کی عزت داؤ پہ لگا گئی تھی۔" اس کا اندازہ کھردرا سا تھا۔

"اور ہاں وہ تمہاری اترن ہرگز نہیں تھا۔ اسے میرے اللہ نے میرے لئے چنا تھا۔ پھر وہ تمہارا کس طرح ہو جاتا وہ میرا نصیب تھا اسی لئے تم سے چھین کر کاتب تقدیر نے اسے میرے حوالے کر دیا۔" وہ شامہ کی نفرت کا جواب دیتے جائے نماز بچھانے لگی۔ شامہ نے اسے ناگوار نظروں سے پیشانی پہ بل ڈال کے دیکھا۔

"تمہارا یہ رشتہ زیادہ دیر چل نہیں پائے گا۔ کیونکہ چھینی ہوئی چیزیں آسیب زدہ ہوتی ہیں۔ ان کے ساتھ رہنا نصیب نہیں ہوتا۔" وہ نخوت سے کہہ رہی تھی۔

"چلانا ہے بھی کسے۔ مجھے تو جینا ہے۔ اور آسیب حوصلے کی چٹان سے ٹکرا کے پاش پاش ہو جاتے ہیں۔" وہ آج ہر طرح سے شامہ کو مات دینے پہ تلی بیٹھی تھی۔

"خیر تمہارا کوئی قصور نہیں۔ چھین کے زندگی گزارنے کا فن تو تمہیں وراثت میں ملا ہے۔

ٹھیک کہا نہ میں نے۔'' وہ دل جلاتی مسکان چہرے پہ سجائے تصدیق مانگ رہی تھی۔ اور یہ واحد طعنہ تھا جو منوہ کی ذات کو صفر کر دیتا تھا۔ اس کے پاس جواب نہیں تھا اور شمامہ ٹلنے والی نہیں تھی۔ اس نے دانستہ نماز کی نیت باندھ لی۔

''بہت جلد تم حدشان کی زندگی سے باہر ہو گی، کیونکہ میں طلعت بانو نہیں ہوں۔ جو لوٹ کا مال یونہی رب کی رضا جان کر جانے دے۔ میں شمامہ بیگ ہوں۔ میں سود سمیت سب تم سے واپس لوں گی۔'' وہ شعلہ بار نظروں سے اس کے پاکیزہ چہرے کو دیکھتے اپنی مغرور و متکبر سوچوں سمیت اندر کی طرف بڑھ گئی تھی۔

✧✧✧

نہیں فرصت یقین جانو ہمیں کچھ اور کرنے کی
تیری یادیں، تیری باتیں بہت مصروف رکھتے ہیں

آرٹ گیلری کو لاک کر کے وہ لفٹ میں داخل ہو گئی تھی۔ لفٹ ابھی گراؤنڈ فلور سے دور ہی تھی کہ ایک دو جھٹکے لگے اور لفٹ بند پڑ گئی۔ منوہ نے مارے گھبراہٹ کے کئی بٹن دبائے۔ مگر شاید لفٹ میں کوئی ٹیکنیکل فالٹ ہو گیا تھا۔ حواس باختگی میں اس نے دروازہ پیٹ ڈالا مگر کوئی باہر ہوتا تو سنتا۔ افطار میں کچھ دیر تھی۔ اسی لئے سارا اسٹاف روانہ ہو چکا تھا۔ باہر صرف واچ مین اور گارڈز ہی ہو سکتے تھے لیکن ان تک آواز پہنچانا ناممکن تھا۔ لفٹ میں موبائل سگنل نہیں پکڑ رہا تھا۔ کسی کو فون کرنا یا میسج کرنا بھی ناممکن تھا۔ اس کے اعصاب شل ہونے لگے تھے۔ پسینے سے تر چہرہ لئے وہ گھٹنوں میں سر دے کر رونے لگی تھی۔ روزے کی حالت میں چلانے کی وجہ سے اس کے گلے میں خراشیں پڑ گئی تھیں۔ شدت پیاس سے حلق میں مانو کانٹے اگ آتے تھے۔ وہ دہری اذیت کا شکار تھی۔ لفٹ میں ہیبت طاری کر دینے والا سناٹا طاری تھا۔ وقت کی سنگینی کسی بھاری سل کی طرح اس کے سر پہ مسلط تھی۔

''کیا وہ یہیں اس لفٹ میں دم گھٹنے کی وجہ سے مر جائے گی۔'' خیال رونگٹے کھڑے کر دینے والا تھا۔

''یا اللہ مدد۔'' اس کی لرزتی سسکیاں جیسے دم توڑنے لگیں تھیں جس پل اُس کے حواس نے کام کرنا چھوڑ دیا اور وہ بے ہوش ہو کے ایک جانب کو لڑھک گئی۔ ٹھیک اسی وقت لفٹ کا دروازہ کھلا اور پریشان و تشویش زدہ حدشان پاشا واچ مین کے ساتھ اندر آ کے اس کی طرف بڑھا تھا۔

✧✧✧

حال یہ ہے کہ تیری یاد میں گم ہوں
سب کو میری مجھے تیری پڑی رہتی ہے

اسے آفس میں کچھ خاص کام تو نہیں تھا مگر صرف اسی لئے رکا ہوا تھا کہ منوہ گیلری میں موجود تھی۔ وہ اس کے بعد ہی گھر جانا چاہتا۔ افطار میں جب چند منٹ رہ گئے تو آفس سے نکل کے باہر آ گیا تھا۔ اُس نے جب واچ مین سے منوہ کے بارے میں استفسار کیا تو واچ مین نے نفی میں جواب دیا اور یہ کہا کہ وہ تو لفٹ اور اوپر کے دروازے بھی بند کر چکا ہے۔ اور بس حدشان کا ماتھا ٹھنکا اور وہ ایک پل بھی ضائع کئے بنا اوپر کی طرف دوڑا تھا۔ واچ مین کو بھی کسی گڑبڑ کا احساس ہوا تو اسی لئے چابیاں اٹھا کے وہ بھی اس کے پیچھے ہی لپکا تھا۔ ہر جگہ کی تلاشی کے بجائے وہ سیدھا لفٹ کی طرف بھاگا تھا۔ جیسے کوئی آلہ فٹ تھا اس کے اندر جو اسے بالکل صحیح مقام تک لیکر گیا تھا۔ وہ اسے لفٹ میں ملی تھی بیہوشی کی حالت میں۔ وہ اسے اٹھا کے سیدھا اپنے

کمرے میں لایا تھا۔ وہ خوف کے سبب اور دم گھٹنے کی وجہ سے بیہوش ہوئی تھی۔ حدثان بڑی دقتوں سے اسے ہوش میں لانے میں کامیاب ہوا تھا۔ پھر جیسے ہی اس نے آنکھیں کھولیں وہ جیسے پھر سے جی اٹھا تھا۔

مارے تشکر کے اس کی آنکھ کا کونا نم ہو گیا تھا۔

"حدثان......" اس کی آواز میں بیقراری اور تڑپ رچی بسی تھی۔ حدثان سرعت سے اس کے قریب ہوا تھا۔ منوہ بے ساختہ اس سے لپٹ گئی تھی۔ دونوں کی دھڑکنوں نے طوفان برپا کر دیا تھا۔ وہ دونوں ہر چیز سے بے نیاز یک جان دو قالب ہوئے شدتوں سے ایک دوسرے کو بھینچے ہوتے تھے۔

"اللہ اکبر......" دور کسی مسجد میں مؤذن نے صدا لگائی تو وہ دونوں چونک کے ہوش میں آتے۔

"پانی......" وہ نظریں چرا رہی تھی۔ اپنی بے خودی پہ شرمندہ تھی۔ حدثان کے گلاس اس کی طرف بڑھانے پہ نظریں اٹھائیں اور گلاس تھام کے فوراً جھکا لیں۔ پانی کے چند گھونٹ پیے۔ شرمندگی ایک طرف، روزہ تو افطار کرنا تھا۔

"آپ......" وہ اٹھنے لگا تو وہ بے ساختگی میں کہہ گئی۔ نظریں جب چار ہوئی تو وہ زیادہ دیر تاب نہ لا سکی۔

"آپ کا بھی تو روزہ تھا نا......" اس نے پکارنے کی توجیح پیش کی۔ اسے کمرے میں صرف یہی پانی کا گلاس نظر آیا تھا۔ اسی لئے اس کی فکر میں کہہ گئی تھی۔

حدثان نے اس کے ہاتھ سے گلاس تھاما اور اسے نظروں میں فوکس کئے چند گھونٹ بھرے۔ منوہ نے رخ موڑا۔ وہ گلاس سائیڈ پہ رکھ کے اٹھ کھڑا ہوا۔

"چلیں......" وہ اس کی بے چینی بھانپ گیا تھا اسی لئے اسے اٹھنے کا کہا۔ "میں آپ کو گھر ڈراپ کروں گا، بحث کا موڈ نہیں ہے۔" اسے انکار کے لئے پل تولتا دیکھ حدثان نے وارننگ دی اور اٹھ کے دروازے سے باہر نکل گیا۔ مرتا کیا نہ کرتا کی مصداق وہ بھی اس کے پیچھے ہی باہر نکل گئی۔ گاڑی میں مکمل خاموشی تھی۔ منوہ کا انداز کھویا کھویا سا تھا۔ حدثان ڈرائیونگ کرتا گاہے بگاہے اس پہ بھی نظر ڈال لیتا تھا۔ اس نے کھانے کی آفر نہیں کی تھی۔ جانتا تھا وہ باہر کا کچھ بھی نہیں کھاتی۔ گاڑی ایک سگنل پہ آ کے رکی تو کسی نے حدثان کی طرف کا شیشہ بجایا۔ اس نے شیشہ نیچے کیا تو باہر ایک پندرہ چودہ سال کا لڑکا ہاتھ میں گجرے لیے کھڑا تھا۔

"صاحب! بی بی جی کے لئے لے لو۔"

"کیوں میں اپنے لئے نہیں لے سکتا" اس نے مسکراتے ہوئے بچے کو چھیڑا تھا۔

"آپ کیسے پہن سکتے ہو صاحب یہ تو بی بی لوگ پہنتی ہیں۔"

بچہ جھینپا ہوا کہہ رہا تھا۔ حدثان نے قہقہہ لگایا۔ منوہ کسی گہرے خیال سے جاگی اور اس کے خوبصورت قہقہے میں کھو سی گئی۔

"لاؤ یار سارے دے دو" اس نے والٹ سے پیسے نکال کے بچے کی طرف بڑھائے۔ بچہ حیران ہوا۔

"سارے......؟"

"ہاں یار سارے۔" اس کے دوستانہ انداز میں کہنے پہ بچے نے وہ چھ سات گجرے اس کی طرف بڑھا دیئے۔

"صاحب کھلے نہیں ہیں۔" بچہ نیلا نوٹ دیکھ کر پریشان ہوا۔

"کوئی بات نہیں۔ تم سارے رکھ لو۔" اس

نے فراخدلی سے کہا۔ بچہ پہلے حیران ہوا پھر خوش۔ اسے اور منوہ کو۔ دعائیں دیتا سڑک کی دوسری طرف غائب ہو گیا۔

سگنل کھلا تو اس نے گاڑی آگے بڑھاتے سارے گجرے منوہ کی گود میں ڈال دیئے۔ اس نے بڑبڑا کے حدثان کی طرف دیکھا۔

''دیکھئے میں اس بچے کی مدد کرنا چاہ رہا تھا۔ اگر اسے بھیک چاہیے ہوتی تو وہ یوں پھول بیچ نہ رہا ہوتا۔ اس لئے میں نے یہ خرید لیے۔ اب گھر میں کوئی عورت تو ہے نہیں اسی لئے آپ کو دے دیئے۔'' وہ بڑے مدلل لہجے بول رہا تھا۔ منوہ کی تسلی ہوئی یا نہیں مگر وہ رخ پھیر کے گاڑی سے باہر دیکھنے لگی تھی۔

گاڑی جب منوہ کے بتائے ہوئے پتے پہ آ کر رکی تو اک لمحے کے لئے وہ شاکڈ سا رہ گیا۔

''تو کیا منوہ ہی وہ لڑکی ہے۔''

اس خیال کے آتے ہی دل یکبارگی دھڑکا۔

وہ بھی منوہ کے پیچھے ہی گاڑی سے اترا۔

''آپ اعظم بیگ کی......''

''وہ ماموں ہیں میرے۔'' اس کا جملہ اچکتے وہ پھوٹتی پہلے نمودار ہوتی کرن کو بجھا گئی تھی۔

''تھینکس اینڈ اللہ حافظ۔'' وہ دھیرے سے کہتی اس کی حالت سے بے خبر گیٹ کھول کے اندر چلی گئی تھی۔

وہ پلٹ کے تیزی سے گاڑی میں بیٹھا اور بھگا کے لے گیا۔

اپنے کمرے کی کھڑکی سے یہ منظر دیکھتی شمامہ تیزی سے کھڑکی بند کرتی نیچے آئی تھی۔

✦✦✦

دور آسمان پہ سورج پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ وہ پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے شمامہ سے ایک قدم آگے چل رہا تھا۔ اس کے پیروں کے نشان پہ پیر رکھتی وہ گلابی شرٹ میں کھلی پڑ رہی تھی۔ خلاف معمول آج گلے میں سٹول بھی نظر آ رہا تھا۔

''کبھی ملنا چاہو گے اپنی منکوحہ سے؟''

سوال اتنا غیر متوقع تھا کہ وہ کتنے پل ٹھہر کے دم بخود سا اسے دیکھتا رہا تھا۔

''تمہیں یہ ضرور دیکھنا چاہیے......'' اس کے کنگ انداز پہ شمامہ نے اپنا آئی ڈی کارڈ آگے بڑھایا۔

''شمامہ اعظم بیگ۔'' ایک کرنٹ تھا جو اسے زوردار جھٹکا دے کر گیا تھا۔

''یہ...... یہ کیسا ہے؟...... ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟'' وہ سخت دہشت زدہ سا اٹکتے ہوئے سوال کر رہا تھا۔ شمامہ کے اندر کمینی سی خوشی سر اٹھانے لگی۔ اس کا ہوم ورک مکمل تھا۔ وہ ہر پہلو اور ہر زاویے پر غور کر چکی تھی۔ ایک گھر میں ہی رہتے ہوئے وہ اتنا تو جان ہی چکی تھی کہ منوہ، حدثان کو صرف اپنے باس کے طور پہ جانتی ہے۔ دونوں ہی ایک دوسرے سے لاعلم ہیں اور ان کی لاعلمی کا فائدہ اب شمامہ اٹھا رہی تھی۔

''او مائی گاڈ۔'' اضطراری انداز میں حدثان نے اپنے بال نوچے۔ ''تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟''

''اس دن جب تم نے ڈیڈ کا نام لیا تو اندازہ ہوا۔ ورنہ تمہاری طرح میں بھی لاعلم تھی۔ تم جانتے تو ہو میں نے غصے میں گھر چھوڑ دیا تھا۔ ڈیڈ نے کہا تھا میں تم سے مل لوں۔ مگر تمہاری طرح میں بھی اس نکاح سے خوش نہیں تھی۔ اسی لئے بظاہر ہامی بھرنے کے میں نے ایسی کوئی کوشش نہیں کی۔'' وہ بڑی روانی سے جھوٹ بول رہی تھی۔ حدثان تو چکرا کر ہی رہ گیا تھا۔ (اس نے حدثان سے یہ کہا تھا کہ وہ اپنے نکاح سے

بھاگی ہے۔ کر کے بھاگی ہے یا نہیں۔ اس بات کو دونوں نے ہی ڈسکس نہیں کیا تھا اور آج یہی بات شامہ کے حق میں جا رہی تھی۔)

"تو پھر اب......؟" حدثان کا لہجہ بجھا بجھا تھا۔

"اب کیا۔ میں تو آج بھی اپنی بات پہ قائم ہوں۔"

شامہ نے چال چلی۔

"مطلب......؟"

"میں کل بھی اس نکاح سے خوش نہیں تھی اور آج بھی نہیں ہوں۔ ہم صرف دوست ہیں حدثان!" وہ کافی شاطر کھلاڑی ثابت ہو رہی تھی۔ وہ متحیر رہ گیا۔

وہ پاس رکھے ایک بینچ پر بیٹھ گیا تھا۔

"تم کسی اور کو پسند کرتی ہو؟"۔ وہ گہری نظروں سے اسے دیکھتا پوچھ رہا تھا۔ اس کے قریب بیٹھتے شامہ ایک ادا سے مسکرائی۔

"افکورس...... اس کے علاوہ اور کیا وجہ ہو سکتی ہے۔" وہ بڑے متوازن لب ولہجہ میں کہہ رہی تھی۔ کچھ دیر اس کی لفظوں کی صداقت جانچنے کے بعد حدثان نے گہرا اطمانیت بھرا سانس بھرا۔

"تو اب کیا کرنا ہے؟" وہ ریلیکس ہوتا پوچھ رہا تھا۔

شامہ دل ہی دل میں مسکرائی۔

"ڈائیورس۔" اس نے بڑے اطمینان سے کہا۔

شیطان اپنی چال چل چکا تھا۔ اس کے بنے ہوئے جال میں حدثان بنا کسی حیل وحجت کے آ پھنسا تھا۔ دو زندگیاں حسد کے دائرے میں آ کے داؤ پہ لگ چکی تھیں۔ کیا بھلا ہو کے انسان رب کی رضا میں راضی رہنا سیکھ لے۔ جو مل گیا اس پہ صابر وشاکر ہو جائے۔ کیا وہ ستر ماؤں سے زیادہ چاہنے والا اپنے بندے کے دل کو نہیں جانتا۔ کیا وہ بن مانگے عطا نہیں کرتا۔ کر دیتا ہے۔ انسان کی توقعات سے بھی زیادہ۔ مگر ہم ناشکرے پن میں یہ اس وقت جانتے ہیں جب سب کچھ اپنے ہاتھ گنوا بیٹھتے ہیں۔ پھر سوائے "ہاتھ" ملنے اور واویلا کرنے کے کچھ نہیں بچتا۔

کیا حدثان بھی اپنے ساتھ کچھ ایسا ہی کرنے والا تھا؟

کسے خبر۔ سوائے اس ذات بابرکت کے۔

✧✧✧

عصر سے کچھ پہلے کا وقت تھا۔ حدثان اپنے آفس میں بیٹھا کسی گہری سوچ میں گم تھا۔

"سر آپ کی ایک اہم میٹنگ ہے آپ کو پندرہ منٹ میں نکلنا ہے۔" وہ اسے اک ضروری فائل دینے آئی تھی۔ جاتے جاتے یاددہانی ضروری سمجھی تھی۔ حدثان سر ہلاتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا اس کے پاس سے گزرتے اک پل کو رکا تھا۔ وہ بہت غور سے اس کے دلکش نقوش دیکھ رہا تھا۔

"آپ کی آنکھوں میں کاجل پیارا لگتا ہے۔" وہ کہہ کر رکا نہیں تھا باہر نکل گیا تھا۔ منوہ کو مات جیسے ہی سمجھ آئی اس کی بھنویں تن گئیں۔ وہ تیزی سے پلٹی اور اپنی چیزیں سمیٹنے لگی۔

"سمجھتے کیا ہیں خود کو۔ کچھ بھی کر لیں گے کچھ کہہ دیں گے۔ اور میں چپ رہوں گی۔ اب میں ایک پل نہیں رکوں گی یہاں۔ کرتے ہیں تو کر دیں کیس۔" وہ لب بھینچے تیزی سے اپنی چیزیں سمیٹ رہی تھی۔

"منوہ بیٹے آپ یہاں؟" وہ جو تیزی سے باہر نکل رہی سامنے کھڑی مشل پاشا کو دیکھ کر

ٹھٹھک گئی۔

''انکل آپ یہاں کیسے؟'' وہ تیزی سے ان کے قریب آئی تھی محتشم پاشا سوال کے بدلے سوال سن کے مسکرا دیئے۔ آگے بڑھ کے شفقت سے اس کے سر پہ ہاتھ رکھا۔

''کیوں میں یہاں نہیں آسکتا؟''

''نہیں میرا وہ مطلب نہیں تھا۔ پہلے کبھی آپ کو یہاں نہیں دیکھا تو اس لئے پوچھ لیا۔'' وہ اپنی صفائی دیتے بولی۔

''یہ آپ نے صحیح انداز لگایا۔ ایکچولی ایک مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ بس اسی سلسلے میں چین جانا پڑ گیا۔ آج ہی واپس لوٹا ہوں۔ اس لئے سوچا ایک چکر آفس کا بھی لگالوں دیکھوں تو صاحب زادے ٹھیک طرح سے سب سنبھال بھی رہے ہیں یا نہیں۔ لیکن یہاں آ کے اندازہ ہوا وہ تو بہت کچھ سنبھال چکے ہیں'' وہ اسے تفصیلی جواب سے نوازتے آخر میں شرارت سے کسی اور بات کا حوالہ دے گئے تھے۔ منوہ سمجھ نہیں پائی وہ تو لفظ ''صاحب زادے'' پہ اٹکی ہوئی تھی۔

''حدثان سے ملی ہیں آپ؟'' انہوں نے خود ہی اس کی مشکل آسان کردی۔

''وہ میری باس ہیں۔ ہر روز ہی ملتی ہوں۔ پر آپ کیوں پوچھ رہے ہیں۔''

''وہ اس لئے کہ میرے اکلوتے بیٹے سے میری اکلوتی بہو کا ملنا تو ضروری ہے۔ پر مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے کہ آپ حدثان اور اپنے رشتے سے آگاہ نہیں۔'' وہ زیرک نگاہ تھے۔ معاملا اک پل میں سمجھ گئے تھے۔

منوہ کا ازلی ہونق پن عود کے آیا۔ وہ آنکھیں اور منہ کھولے انہیں ایسے گھور رہی تھی جیسے ان کے سر پہ سنگ اُگ آئے ہوں۔

''یعنی میرا انداز صحیح ہے۔'' وہ اُسے حیرتوں کے سمندر میں غوطہ زن دیکھ اپنے انداز کی پختگی پہ مسکراتے۔

''میں اور وہ...... مطلب سر...... حدثان سر...... نہیں...... ہم دونوں...... افففف۔'' بے ربط بولتی وہ چکرا کے رہ گئی تھی۔

''جب تمہارا یہ حال ہے تو اس کا مطلب ہے کہ ہمارے صاحب زادے بھی ناواقف ہی ہیں۔'' محتشم پاشا کو یہ ساری سچویشن مزہ دے رہی تھی۔ منوہ نے خجالت سے سر جھکا لیا۔

''بہرحال اب اُسے آگاہ تو کرنا پڑے گا۔ خیر یہ حق آپ کو دیا جائیں اور اس احمقوں کے سردار کو بتائیں کہ جس کو اپنی پرسنل سیکرٹری رکھا ہوا ہے۔ دراصل وہی اس کی پرسنل بیوی ہے۔'' وہ شرارتی لب ولہجے میں کہتے اسے متوحش کر گئے تھے۔ نہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ آنے والے وقت کا سوچ کے کان کی لو تک سرخ پڑ گئی تھی۔

اُس نے گھر آ کے سب سے پہلے الماری سے اپنا نکاح نامہ تلاشہ تھا۔ منوہ سے ذرا اوپر لکھا حدثان پاشا پوری آب وتاب کے ساتھ جگمگا رہا تھا۔ وہ اس کے دستخط پہچانتی تھی۔ پل میں آنکھ بادل اشک برسات کا روپ دھار گئے تھے۔ آنسو سیدھے دل کی زمین پہ گرتے نئی شاداب محبت کی ست رنگی کونپلیں کھلا رہے تھے۔ ہر طرف پھول ہی پھول کھل اُٹھے تھے۔ جن کی مسحور کن خوشبو اور نرماہٹ اس ک دل کا سختی سے بند ہر کواڑ اور کھڑکی کھول کے بہت گہرائی تک صرف ایک ہی خاکہ ایک ہی شبیہہ تراش رہے تھے۔ جسے پورا حق اور استحقاق حاصل تھا۔ کیونکہ وہ تو صدیوں س دل کا مکین تھا۔ اوّل بھی وہی تھا۔ آخر بھی وہی ابتداء بھی اس کیلئے تھی اور انتہا بھی آغاز بھی وہی تھا اور انجام

بھی وہی۔

✦✦✦✦

دل ایک دلدلی زمین ہے۔ جہاں ہر روز ہزاروں چہرے محبت کے دھوکے میں لاپتہ ہو جاتے ہیں۔

اگلے دن وہ خوب دل لگا کے تیار ہوئی تھی۔ سبز لان کے سوٹ میں سبز ہی بڑے سے ڈوپٹے کو اسکارف کی طرح اوڑھے وہ بہار کے موسم میں کھلا سب سے خوش رو گلاب کا پھول لگ رہی تھی۔ آنکھوں میں کاجل کی لکیر کھینچتے اس کے کانوں میں حدثان کا جملہ رس گھول گیا تھا۔ اس کے گلابی لپ گلوس میں رنگ کٹاؤ ہونٹ کسی حسین خیال کے تحت مسکرا اٹھے تھے۔ یہ احساس ہی فرحت بخش تھا کہ وہ کسی نامحرم نہیں بلکہ اپنے شرعی محرم کے لئے تیار ہو رہی تھی۔

گھر سے نکلنے سے پہلے اُس نے خود کو ہمیشہ کی طرح بڑی سیاہ چادر میں ڈھانپ لیا تھا۔ مگر اس سب کے باوجود بھی اس کے وجود سے پھوٹتی خوشی و شادمانی کی لہریں شامہ سے چھپی نہیں رہ سکتی تھیں۔ اس کی کاٹ دار طنزیہ اور تمسخر زدہ نظروں نے گیٹ سے باہر نکلنے تک منوہ کا پیچھا کیا تھا۔

وہ آفس پہنچی تو حدثان کسی ضروری کام سے باہر گیا ہوا تھا۔ وہ اپنی چیئر پہ آ کے بیٹھ گئی۔ اس نے آنکھیں بند کیں اور تصور کی نگاہ سے حدثان کے خوبرو چہرے کو مکمل استحقاق سے دیکھنے لگی۔

بعض لمحات بیان سے باہر ہوتے ہیں۔ یوں کہ آپ کے پاس الفاظوں کا ذخیرہ ہوتا ہے۔ مگر آپ چاہ کے بھی انہیں زبان تک لانے سے قاصر ہوتے ہیں۔ کچھ ایسی ہی کیفیات کا شکار ہو کر وہ حدثان کے کمرے کے باہر کھڑی تھی۔ یہ پہلی دفعہ تھا کہ وہ کمرے میں جاتے ہو جھجک کا شکار تھی۔ اس نے ہمت کر کے ناب گھمایا تو دروازہ کھلتا چلا گیا۔ اندر داخل ہونے کی نوبت ہی نہیں آئی تھی وہ اندر گونجتی آواز اس شیریں لب و لہجے کی مالکن سے بخوبی واقف تھا۔ پیون سے اسے حدثان کے واپس آنے کا حکم ہوا تھا مگر اس کے ساتھ کوئی اور بھی تھا وہ لاعلم تھی اور وہ کوئی اور شامہ بیگ ہو گی یہ تو اس کے سان و گمان میں بھی نہیں تھا۔

''بہت ارجنٹلی اپنی دوستی کے واسطے دے کر یہ پیپرز تیار کروائے ہیں۔ تم جانتے ہی ہو آج کل میں عید کی چھٹیاں ہونے والی ہیں۔ اس لئے کسی بھی وکیل کا ملنا اور یہ کام اتنی جلدی کرنا ناممکن تھا۔ تم بھی ایک نظر ان پیپرز کو پڑھ لو۔ میرے خیال سے تو سب ٹھیک ہی ہے۔''

کمرے کے ایک طرف بنے سٹنگ ایریا کے صوفوں پہ وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ حدثان نے اک نظر ''طلاق نامہ'' پہ دوڑائی وہ مطمئن ہوتا ریلیکس ہو کے بیٹھ گیا تھا۔

''تھینک یو ویری مچ شامہ۔ تم نے ایک بہت بڑا بھائی بوجھ میرے سر سے اتار دیا۔ ورنہ میں تو یہ سوچ سوچ کر پریشان ہو رہا تھا کہ جب بیگ انکل اور ڈیڈ کو پتہ چلے گا تو وہ کیسے ری ایکٹ کریں گے۔ خیر جب تم بھی اس نکاح سے راضی نہیں ہو تو انہیں ہماری بات سمجھنی ہی پڑے گی۔'' وہ بڑے مطمئن لب و لہجے میں بول رہا تھا۔

''یس یو آر رائٹ۔ ان دونوں نے بھی ہمارے ساتھ زبردستی کی تھی۔ میں نے بار بار ڈیڈ کو منع کیا تھا۔ مجال ہے جو انہوں نے کان دھرے ہوں۔ اس سب کا حل اب یہ طلاق ہی ہے۔ تمہارے سائن کرتے ہی ہم دونوں آزاد ہو جائیں گے۔ پھر تم بھی کر لینا اپنی من پسند ہستی

سے شادی۔ لیکن یہ تھوڑا مشکل تو ہوگا۔'' وہ ایک سرشاری اک ترنگ میں کہتی آخر میں اسے آنے والے حالات کی سنگینی سے آگاہ کر رہی تھی۔

''یہ تو حقیقت ہے۔ بیگ انکل ہماری ڈائیوورس کے بعد مشکل سے ہی اپنی بھانجی کا ہاتھ مجھے تھمائیں گے۔''

وہ جو ابھی تک ان کی گفتگو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ یکدم سے جیسے طوفان کی زد میں آگئی تھی۔ یہ شامہ کیا کہہ رہی تھی؟ اور کیا کرنے کی کوشش کر رہی تھی؟ منوہ کو پل میں اس کی گھٹیا ذہنیت کا اندازہ ہوا اور حدثان۔ کیا واقعی اتنا بیوتوف تھا جو شامہ کے بچھائے جال میں آپھنسا تھا۔

''خیر تب کی تب دیکھی جائے گی۔ فی الحال جو کرنے بیٹھیں ہیں وہ تو نبٹائیں۔'' اس نے پنسل تھام کے کاغذات ٹیبل پہ دھرے۔ اسے دیکھ کر شامہ کے چہرے پہ بڑی دل آویز مسکان کھلی تھی۔ بس تین پیپرز اور تین سائن اور سارا کھیل ختم۔''

وہ کمال مہارت سے کاغذات تو پہلے ہی بدل چکی تھی۔ جو کاغذات اس وقت حدثان کے سامنے پھیلے تھے۔ ان میں حدثان اور شامہ کا نہیں بلکہ حدثان اور منوہ کا نام تھا۔

منوہ پھرتی سے اندر داخل ہوئی۔ حدثان سمیت شامہ نے بھی چونک کے اسے دیکھا۔

''کیا ہے یہ سب؟'' اس کا اشارہ یہاں چل رہے کھیل کی طرف تھا۔ حدثان تو حدثان، شامہ کو بھی اس کی یہاں آمد اور پھر اس سوال کی توقع نہیں تھی۔ حدثان پھرتی سے اٹھ کے اس کے قریب آیا۔

''منوہ آئی ایکسپلین یو ایوری تھنگ۔ لیکن ... بھی پہلے آئی لو یو...... آئی رئیلی ویری لو

یو۔ یہ جو نکاح ہوا اس میں میری بالکل رضا شامل نہیں تھی۔ میں یہ نکاح بالکل نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یہ سب ڈیڈ کی ضد کا نتیجہ تھا۔ ٹرسٹ می، میں ہر حال میں یہ نکاح ختم کرنا چاہتا تھا۔ میں صرف آپ سے پیار کرتا ہوں۔ آج یہ طلاق ہو جائے گی پھر ہمیشہ کیلئے ایک ہو جائیں گے۔'' وہ اسے شانوں سے تھامے بہت لگاوٹ سے کہتا کنوینس کرتا اپنی شدید محبت کا اظہار کر رہا تھا۔

''یو لومی اور آپ کو لگتا ہے یہ طلاق ہونے کے بعد ہم ایک ہو جائیں گے۔ سریسلی۔'' وہ کاٹ دار لہجے میں بولی۔

''افکورس...... افکورس ہم ایک ہو جائیں گے۔ بیگ انکل کو منانا تھوڑا مشکل ہوگا۔ لیکن اگر آپ میرا ساتھ دیں تو سب آسان ہو جائے گا۔''

''یعنی اس نکاح کے ختم ہونے کا آپ کو ذرا دکھ نہیں ہوگا۔'' وہ نین کٹوروں میں پانی جمع کیے اس سے پوچھ رہی تھی۔

''منوہ بھاڑ میں جھونکیں اس نکاح کو، میں آپ کو چاہتا ہوں۔'' وہ چلا اٹھا تھا۔

''اگر میں آپ کو نہ ملتی تو تب کیا کرتے آپ؟''

''میں تب بھی یہ نکاح ختم کر دیتا۔ میرے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔'' وہ قطعیت سے کہتا انجانے میں بہت کچھ زمین بوس کر گیا تھا۔ منوہ نے زور لگا کے اسے خود سے پرے دھکیلا۔

''اگر آپ کی نظر میں اس نکاح کی کوئی اہمیت نہیں ہے تو پھر میری نظر میں آپ کی محبت کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ مسٹر حدثان پاشا۔'' وہ پہلی بار ضبط کر کے چلائی تھی۔ حدثان متحیر نگاہوں سے اسے تکتا رہ گیا تھا۔ ایک ... ہم

کوئی ہستی مطمئن اور پرسکون تھی تو وہ صرف شامہ تھی۔ کھیل اس کی توقعات سے بھی بڑھ کے مزیدار اور دلچسپ ہو چکا تھا۔

"آپ میرے ساتھ ایسے کیسے کر سکتے ہیں؟" حدثان نے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ وہی ہاتھ جس میں زندگی کا پروانہ تھام کے لائی تھی۔

"کیوں نہیں کر سکتی۔ بالکل کر سکتی ہوں حدثان پاشا۔" وہ قطعی اجنبی انجان لہجے میں بولتی کھینچ کے اپنا ہاتھ چھڑا گئی تھی۔ اک زرد سا کاغذ فری تڑی حالت میں حدثان کے ہاتھ میں رہ گیا تھا۔ وہ اتنا زرد و رنج کا شکار ہوا تھا کہ اس کے پیچھے جانے کے باوجود بھی نہیں بھاگ پایا تھا۔

"انس او کے وجدان۔ یہ اس کا فطری ردعمل ہے۔ ٹھیک ہو جائے گی وہ۔ تم تھوڑا سا ٹائم دو اسے۔" شامہ نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے تسلی دی۔

"نہیں برا لگے گا جانتا تھا۔ وہ اس طرح سے ری ایکٹ کریں گی میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔" وہ شکست خوردہ سا کہہ رہا تھا۔

"میں یہ پیپرز خود تمہیں بھجوا دوں گا۔ اس وقت میں تنہا رہنا چاہتا ہوں۔ آئی ہوپ یو نیور مائنڈ" وہ اس سے نظریں ملائے بنا کہہ رہا تھا۔ شامہ کندھے اچکاتے ہوئے باہر نکل گئی تھی۔ پیچھے اس نے زوردار آواز سے دروازہ بند کر دیا تھا۔ وہ اس کی محبت ٹھکرا گئی تھی۔ حدثان کا ڈر مجسم اس کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔

✦✦✦

اس کے دل پہ بھی کڑی عشق میں گزری ہوگی
نام محبت کا جس نے سزا رکھا ہوگا

وہ جس قدر توڑ پھوڑ کا شکار تھی۔ دور ہی سے محتشم پاشا کو کسی گڑبڑ کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کے اپنے آفس میں لے آئے تھے۔ اسے صوفے پہ بٹھا کے انہوں نے پانی کا گلاس زبردستی اس کے منہ سے لگا دیا تھا۔ چند گھونٹ بھر کے روتے ہوئے وہ جو بولنا شروع ہوئی ان سے سنبھالنا مشکل ہو گیا تھا۔

"شامہ اتنا کیسے گر سکتی ہے" اس کی داستان الم سننے کے بعد وہ بے ساختہ کہہ اٹھے۔

"شامہ نہیں گرا آپ کا صاحب زادہ ہے۔" سوں سوں کرتی وہ انہی کے انداز میں صاحب زادہ بولی تو اس سچویشن میں بھی ان کی ہنسی چھوٹ گئی جسے چھپانے کے لئے انہوں نے ذرا سا رخ موڑ لیا۔

"ابھی کان کھینچتا ہوں اس گدھے کے۔ احمقوں کا سردار نہ ہو تو۔" وہ جتنا رو رہی تھی۔ اسے دیکھ کے ان کا پارہ ہائی ہونے لگا تھا۔ وہ اٹھنے لگے تھے کہ اس نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"وہ اپنی مرضی سے یہ سب کر رہے ہیں۔ اب بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔"

"تم نے بتایا تھا اسے کہ تم ہی وہ لڑکی ہو جس سے نکاح ہوا تھا اس کا۔"

"نہیں اور کبھی بتاؤں گی بھی نہیں" وہ ضدی لہجے میں آنسو پونچھتے بولی۔ پر برسات تھی کہ ساون کے ضدی بادل کی طرح برسے جا رہی تھی۔

"اس طرح سے تو مسئلے حل نہیں ہوتے۔" وہ جھلا اٹھے تھے۔ اس کا جذبات اور ہٹیلا پن دیکھ کے۔ یہ نکاح انہیں اپنی زندگی کی سب سے بڑی بیوقوفی لگنے لگی تھی۔

"ان کی نظر میں اس رشتے کی کوئی اہمیت ہی نہیں۔ مجھے طلاق دے کر مجھ سے ہی شادی کریں گے" اس نے سسکاری بھری۔

"الو ہے۔ وہ بھی پڑھا لکھا۔" انہیں حدثان پہ تپ چڑھی۔ منوہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''کہہ دیجئے گا انہیں۔ بھیج دیں طلاق۔ مر نہیں جاؤں گی میں۔'' وہ اتنی سی بات کے دوران جس قدر ہچکیاں اور سسکیاں بھر رہی تھیں وہ سمجھ گئے تھے کہ کیسے جیے گی وہ۔ اس کے نکلتے ہی وہ کچھ سوچتے ہوئے حدثان کے کمرے کی طرف چل پڑے۔

✧✧✧

وہ کتنی دیر سے کمرے میں لٹو کی مانند چکرا رہا تھا۔ اسے منوہ کے اتنے شدید ری ایکشن کی وجہ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ جب شمامہ کو کوئی اعتراض نہیں تھا تو وہ کیوں شور مچا رہی تھی؟

''ساری خرابیوں کی جڑ یہ نکاح ہی ہے۔'' اس نے ایک ہاتھ کا مکا میز پہ مارا۔

''میں اسے ہی ختم کر دوں گا'' اس نے حتمی سوچ اپناتے صوفے پہ کاغذات پیپرز سیدھے کیے۔ پین اٹھانے کے لئے جونہی سیدھا ہاتھ بڑھایا ہاتھ میں کسی چیز کی موجودگی کا پہلی بار احساس ہوا۔ مٹھی کھول کے اس نے وہ مڑا تڑا کاغذ ٹیبل پہ رکھا۔ کتنی ہی دیر اسے ناقدرانہ نظروں سے گھورنے کے بعد پین اٹھا کے سائن کرنے چاہے۔ پھر کسی خیال کے آتے پین واپس رکھا اور کاغذ اٹھا کے اسے سیدھا کیا۔

اففف...... کاغذ کیا سیدھا ہوا اس کا دماغ اُلٹ گیا۔ وہ کبھی ڈرائیورس پیپرز اور کبھی اس کاغذ (جو کہ نکاح نامہ تھا) کو دیکھتے سنکی معلوم ہو رہا تھا۔ بات جب اس کے سمجھ میں آئی تو وہ اُٹھ کے دھمال ڈالنے لگا۔ کمرے میں آتے محمش پاشا کی آنکھیں اپنے حلقوں سے ابلنے والی ہو گئیں۔

''شاباشے میرے لال۔ ادھر وہ بچی رو رو کے ہلکان ہو رہی ہے اور تو شدائیوں کی طرح دھمال ڈال رہا ہے۔'' وہ گہرے طنزیہ لہجے میں بول رہے تھے۔

''ڈیڈ...... منوہ وہی لڑکی ہے جو بس ٹرمینل پہ ملی تھی اور دیکھیں ہمارا نکاح نامہ''۔ وہ خوشی سے جھومتا ہوا انہیں بتا رہا تھا۔

''اور یہ بھی تو کہو کہ یہ وہی لڑکی ہے جسے کچھ دیر پہلے تم طلاق دینے والے تھے۔''

''دینے والا تھا۔ دی تو نہیں۔''

''وہ جن حالوں میں گھر گئی ہے نہ تو یقین مانو اعظم کان پکڑے خود ہی طلاق کروائے گا۔''

''ڈرائیں تو نہیں۔'' حدثان نے سخت برا مانا۔

''ساری غلطی میری ہے۔ مجھے پہلے ہی تمہیں منوہ کے بارے میں بتا دینا چاہیے تھا۔'' انہوں نے تاسف سے کہا۔

''آپ نے کونسا اسے پہلے دیکھا تھا۔ اس لئے خود کو قصور وار نہ ٹھہرائیں۔'' حدثان نے انہیں اس گلٹ سے باہر نکالنا چاہا۔

''وہ جو اتنی بڑی تصویر بنا کے باکس میں چھپا رکھی تھی۔ دیکھ چکا تھا اُسے میں'' انہوں نے اپنی چوری کا اعتراف کیا۔

''ڈیڈ......'' حدثان نے خفا نظروں سے انہیں گھورا۔

''صاحب زادے مجھے بعد میں گھور لینا پہلے جا کے منوہ کو مناؤ۔''

''لیکن ڈیڈ یہ سب ہوا کیسے؟ میرا مطلب ہے میرا نکاح تو شمامہ سے طے تھا۔'' حدثان نے گاڑی کی چابیاں اٹھاتے ذہن میں اٹکے سوال کو زبان دی۔ جواباً محمش پاشا نے تفصیل سے اسے ہر ایک بات سے آگاہ کر دیا۔

''او آئی سی۔'' حدثان کے لبوں سے بے ساختہ نکلا۔

''پتر جی آئی سی لیکن آپ کی گھٹیا باتیں سن

کے واپس بھی گئی۔" محمش پاشا مزاحیہ لب و لہجے میں بولے۔ دروازے کے پاس جاتے حدثان اور خود انہوں نے بلند آہنگ قہقہہ لگایا۔

"وہ اس لیے کہ بینڈ باجے کے ساتھ آئے گی۔" اس نے یقین سے پر لہجے میں کہا۔

"فی الحال تو بینڈ تیرا بجنے والا ہے۔" انہوں نے ڈرایا۔ وہ بھی سنجیدہ ہوا۔

"آپ دعا کریں میرے لیے۔"

"ہاں...... اب دعا ہی کام آسکتی ہے تیرے۔" وہ ان کے لہجے کی شوخی کو سمجھتا ہوا باہر نکل گیا۔

✧✧✧

منوہ کا گھر میں پہلا ٹاکرہ شامہ سے ہی ہوا تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر وہ تمسخر سے قہقہہ لگا بیٹھی تھی۔ منوہ کے جی میں تو آئی کہ اس کا منہ نوچ لے لیکن اس سے کچھ حاصل نہیں تھا۔ سو خود پہ ضبط کے پہرے بٹھاتی وہ اس کی سائیڈ سے گزرنے لگی تو وہ اس نے راستہ روک لیا۔

"یاد ہے تمہیں بچپن میں تم نے سیم میرے جیسی گڑیا لے لی تھی ار میں نے ان دونوں کو آگ لگا دی تھی۔ حالانکہ مجھے اپنی گڑیا بے حد عزیز تھی۔ غلطی تمہاری نہیں ہے۔ بس میں اس دفعہ جو تمہارا تھا وہ مجھے پسند آگیا۔ حدثان میرا نہیں ہو سکتا تو تمہارا بھی کیسے رہ سکتا تھا۔" وہ کلف زدہ لہجے میں بولتی غرور و تکبر کی دیوی لگ رہی تھی۔ منوہ نے افسوس سے سر ہلایا۔

"تمہیں گڑیا ار جیتے جاگتے انسان میں فرق کرنا آنا چاہئے تھا۔ شامہ۔ وہ گڑیا تھی۔ تم نے جلائی اور میں نے جلنے دی۔ لیکن وہ میرا شوہر ہے۔ تم دغا بازی سے ہمیں جدا کرو گی اور میں ایسا ہونے دوں گی۔ اگر تم نے ایسا سوچا تو قصور تمہارا نہیں ہے۔ تم جیسی چھوٹی سوچ والی لڑکی ایسا ہی سوچ سکتی ہے۔"

"مطلب کیا ہے تمہارا۔" شامہ کو اس کا انداز کھٹکنے لگا تھا۔ تبھی باہر گاڑی کا ہارن بجا۔

"باہر جا کے دیکھو ہر مطلب سمجھ میں آجائے گا۔ اور ہاں میں ماموں کو تمہارے کرتوت نہیں بتانے والی۔ بہتر ہے تم بھی ذکر نہ کرنا۔ میں یہ سب تمہارے نہیں بلکہ ماموں کے لیے کہہ رہی ہوں۔ وہ کسی بھی وجہ سے شرمندہ ہوں۔ مجھے یہ منظور نہیں۔"

"او کے......" وہ اس کے گال تھپتھپا کے اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔ کسی گہری سوچ میں گم شامہ نے جب حدثان کو اندر لاؤنج میں آتے دیکھا تو وہ تیزی سے پلر کے پیچھے جا چھپی تھی۔ حدثان ملازم کے ہمراہ سیدھا منوہ کے کمرے کی طرف گیا تھا۔ اپنی ہر چال کے الٹ جانے پہ وہ بڑے شکستہ قدموں سے اپنے کمرے کی طرف چلی گئی تھی۔

منوہ نے دروازہ نہیں کھولا تھا۔ وہ طلعت بانو کے پاس بیٹھ کے ایک لاحاصل انتظار کر کے واپس چلا گیا تھا۔

✧✧✧

عید کا چاند نظر آگیا تھا۔ منوہ عشاء کی نماز ادا کر کے کپڑے استری کر رہی تھی۔ حدثان ہر روز ہی چلا آتا تھا۔ اسے دیکھتے ہی وہ کسی کونے میں جا چھپتی تھی۔ وہ جب تک مایوس ہو کے اٹھ نہ جاتا منوہ باہر نہیں نکلتی تھی۔ آج بھی اس نے چاندرات پہ اسے باہر لیجانے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ منوہ نے سر درد کا بہانہ کر کے ٹال دیا تھا۔

"نہیں کہیں سر درد کی ٹیبلٹ اور دودھ پی کے آرام کریں۔ باہر ہم پھر کبھی چلے جائیں گے۔" اس نے اپنے کمرے میں کھڑے ہو کے

حدثان کا جواب سنا تھا۔ وہ طلعت بانو کو اس کا خیال رکھنے کے لئے کہہ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا۔ منوہ نے بہانہ بنایا ہے۔ مگر وہ پھر بھی اس کے لئے پریشان ہو رہا تھا۔ نجانے کس احساس کے تحت اس کا دل بھر آیا۔

"یہ حدثان دے کے گیا ہے۔" طلعت بانو نے ایک پرچی اس کی طرف بڑھائی۔

"تم ناراض ہو اس سے۔" وہ جاتے ہوئے پلٹ کے کسی خدشے کے تحت بولی تھیں۔ انہیں حدثان کے ساتھ منوہ کا رویہ کھٹک رہا تھا۔

"نہیں تو آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔" منوہ نے نظریں چرائیں۔

"ہو سکتا ہے۔ خیر تمہارے ماموں رخصتی کا کہہ رہے تھے، عید کے تیسرے دن۔ تمہارا جو بھی ارادہ ہو وہ پوچھیں تو آگاہ کر دینا۔" وہ اس کا ماتھا چومتے محبت سے کہتی اٹھ کے چلی گئیں۔

ان کے جانے کے بعد منوہ نے پرچی کو کھولا۔ اس پہ خوبصورت ہینڈ رائٹنگ میں غزل لکھی ہوئی تھی۔ منوہ کی ہتھیلیاں بھیگنے لگیں۔

چہرے پہ میرے زلف کو بکھراؤ کسی دن
کیا روز گرجتے ہو برس جاؤ کسی دن
خوشبو کی طرح گزرو میرے دل کی گلی سے
پھولوں کی طرح مجھ پہ بکھر جاؤ کسی دن
گزریں جو میرے گھر سے تو رک جائیں ستارے
اس طرح میرے رات کو چمکاؤ کسی دن
میں اپنی ہر ایک سانس اسی رات کو دے دوں
سر رکھ کے میرے سینے پہ سو جاؤ کسی دن

وہ جیسے جیسے پڑھتی جا رہی تھی۔ شرم و حیا سے سرخ پڑتی جا رہی تھی۔ نہ کوئی معافی نہ معذرت۔ سیدھا سیدھا دل پہ وار کیا تھا۔ اگر وہ

صد شکر اس نے لکھ کر بھیجا تھا۔ اگر وہ سامنے کھڑا ہو کے بولتا تو مارے حجاب کے وہ شاید مر ہی جاتی۔

منوہ نے اس محبت نامے کو چوم کے سینے سے لگا لیا تھا۔

صبح روایتی ہڑبونگ لئے ہوئے بیدار ہوئی تھی۔ منوہ کھیر بنا کے رات ہی ٹھنڈی ہونے کے لئے رکھ چکی تھی۔

صبح تیار ہو کے وہ سب سے پہلے طلعت بانو سے عید ملی تھی۔ ان سے دعائیں لے کر وہ ماموں اور ممانی سے ملی تھی۔ شمامہ بھی وہیں تھی۔ شاید اپنی ہار تسلیم کر چکی تھی۔ منوہ نے آگے بڑھ کے اسے گلے لگا لیا تھا۔ تبھی محمش پاشا اور حدثان اندر داخل ہوئے تھے۔

"میں کھیر لاتی ہوں۔" وہ محمش پاشا سے مل کے کچن کی طرف چلی گئی تھی۔ حدثان کو سرے سے نظر انداز کر دیا تھا۔

"عید کا دن ہے۔ گلے ہم کو لگا کر چلیے۔" وہ ٹرے سیٹ کر رہی تھی تبھی عقب سے حدثان کی آواز سن کے اچھل پڑی۔ ٹرے ہاتھ سے چھوٹ کے زمین بوس ہونے لگی تھی کہ بروقت حدثان نے تھام لیا۔

"میں معذرت نہیں کرتا" اس نے ٹرے کاؤنٹر پہ رکھتے ہوئے کہا۔

"پچھلی ملاقات سے جانتی ہوں اور کچھ" وہ اس کی کچن میں موجودگی سے از حد کنفیوزڈ ہوتی جھلا کے کہہ رہی تھی۔

"اس لئے بتا رہا ہوں کہ عادت ڈال لیں۔ میری عادت مستقل میں بھی بدلنے نہیں والی" وہ اس کی بے بسی سے خط اٹھاتا محویت سے سرخ سوٹ میں اس کے گلابی چہرے کو سرخ پڑتا دیکھ رہا تھا۔

''بنا ایکسکیوز کے میں معاف نہیں کرتی۔ نوٹ کرلیں۔'' وہ بھی تنک کے اسی کے انداز میں بولی تھی۔

''لیکن میں ہر جانے کے طور پہ پھول پھینک کے معافی مانگنے والے کو نہ صرف فراخدلی سے معاف بھی کر دیتا ہوں بلکہ تاعمر کے لئے دل میں بھی بسالیتا ہوں۔''

''مطلب۔'' اس نے نظریں اٹھا کے سفید شلوار سوٹ زیب تن کئے حدثان کو دیکھا۔ ظالم بلا کا ہینڈسم تھا۔ اوپر سے یہ سوٹ بہت سوٹ کر رہا تھا۔ منوہ دیکھتی ہی رہ گئی۔

''آپ کو یہ شکایت تھی نہ کہ میں نے آفس میں آپ کو پسند کیا اور ہمارے نکاح کو کوئی اہمیت نہ دی۔ آپ صحیح ہو مگر مکمل طور پر نہیں۔ میں نے آپ کو پہلی نظر میں پسند کیا تھا۔ مگر بس ٹرمینل پر، آپ مجھ سے ٹکرائی تھی اور میں سڑک پہ گر گیا تھا۔ آپ نے معافی کے طور پر گلاب کی کلی میری طرف پھینکی تھی۔'' حدثان نے سوکھی ہوئی کلی منوہ کی طرف بڑھائی۔ جسے تھام کے وہ بڑے غور سے جانچتی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ چند سال پہلے ہوا حادثہ اسے پوری جزئیات کے ساتھ یاد تھا۔ یہ ان دنوں کی بات تھی جب وہ اپنی ماں اور باپ کے ساتھ حیدر آباد میں مقیم تھی۔ اور پھر چند دنوں بعد ہی اس کے بابا دوسری شادی کر کے سب کچھ سمیٹ کے جدہ بھاگ گئے تھے۔ وہ اور طلعت بانو روتی دھوتی یہاں لاہور میں اعظم بیگ کے پاس آگئیں تھیں۔

''کیا اب بھی عید ملنے کی اجازت نہیں؟''

وہ اس کے قریب ہوتا پوچھ رہا تھا۔ منوہ کی دھڑکنیں پل میں منتشر ہوئیں۔

''پھر کیا خیال ہے۔'' وہ تھوڑا اور قریب ہوا۔

''کس بارے میں۔''

''یہی۔ عید کا دن ہے۔ گلے ہم کو لگا کر ملیے۔'' وہ اس کے کان کے پاس جھکا کہہ رہا تھا۔ منوہ نے گھبرا کے اسے دور دھکیلنا چاہا۔ لیکن حدثان نے ہاتھ تھام لئے۔ فرار کی کوئی راہ نہ پا کے وہ ڈھیلی پڑ گئی۔ حدثان نے مکمل استحقاق سے اس کی تابندہ روشن پیشانی چومی اور پورے حق کے ساتھ اسے خود میں سمیٹ لیا تھا۔

اس عید بچھڑے مل گئے تھے۔ یا پھر عید کے بچھڑے عید کو ہی مل گئے تھے۔ میٹھی عید میٹھی خوشیاں لاتی تھیں۔ موقع دیکھتے ہی ثمامہ نے حدثان اور منوہ سے معذرت کر لی تھی۔ دونوں نے ہی فراخدلی کا مظاہرہ کرتے اسے معاف کر دیا تھا۔

سب بہت خوش تھے۔ اور منوہ بیٹھی سوچ رہی تھی کہ بعض اوقات اپنی زندگی کو سہل بنانے کے لئے داؤ کھیلنا پڑتا ہے۔ اس نے بھی کھیلا تھا۔ حدثان کے ہاتھ میں نکاح نامہ تھما کے۔

ایک طرف بیٹھا حدثان بھی خوش تھا کہ اس کی معصوم سی پری ہمیشہ اس کیلئے کوئی نہ کوئی تحفہ چھوڑ کے جاتی تھی۔ آخری دفعہ وہ نکاح نامہ چھوڑ گئی تھی۔ جس نے اس کی بھنور میں پھنسی کشتی کو کنارے لگا دیا تھا۔

اور پریاں یونہی تو جادو کی چھڑی گھما کے سب صحیح کر دیتی ہیں۔

سو یہاں بھی سب صحیح ہو گیا اور سب ہنسی خوشی دینے لگے۔

✦✦✦



شادی کے تین سال بعد وہ وطن لوٹی تھی۔ وطن واپسی پر وہ بہت خوش تھی اسے اپنا ملک، اپنا شہر، اور خاص کر اپنا کمرہ بہت یاد آتا تھا۔ زندگی کی اٹھائیس بہاریں اس نے اسی کمرے میں گزاری تھیں۔

سب سے مل کر کھانا کھا کر وہ سب کے ساتھ باتیں کرتی رہی۔ جب بہت دیر گزر گئی تو امی نے کہا:

''مائرہ بیٹی اتنا لمبا سفر کر کے آئی ہو تھک گئی ہو گی۔ اب کچھ دیر آرام کرلو۔ باتیں اٹھنے کے بعد کریں گے ابھی تو تم یہیں ہو۔ کچھ اپنے دل کی کہیں گے کچھ تمہاری سنیں گے۔ تین سال کے بعد وطن لوٹی ہو۔''

''جی امی واقعی ہی بہت تھک گئی ہوں۔ میں بھی لمبی تان کر سونا چاہتی ہوں۔ بہت گہری نیند۔'' مائرہ نے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے جمائی لی۔

''ماہم بیٹا...... پھوپھو کو کمرے میں لے جاؤ۔'' دادی نے ماہم کو آواز دی۔

''ارے اماں میرا گھر ہے میں چلی جاؤں گی آپ کیوں پریشان ہو رہی ہیں۔''

''ہاں بیٹا تمہارا گھر ہے۔ لیکن تین سال میں بہت سی تبدیلیاں آگئی ہیں اس لئے ہی کہہ رہی تھی۔'' اتنے میں ماہم آگئی اور بولی۔

''جی دادی کوئی کام تھا آپ کو۔''

''ہاں یہ کہہ رہی تھی مائرہ کو کمرے میں لے جاؤ آرام کرلو تھوڑی بہت دیر۔''

''اچھا...... آیئے پھوپھو......'' وہ مائرہ سے بولی اور کمرے سے نکل گئی اور مائرہ اس کے پیچھے۔ ماہم اس کے کمرے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ مائرہ کے دل میں خوشی کا احساس ہوا۔ اس کی خواہش پوری ہو گئی وہ اپنے کمرے میں آرام کرنا چاہتی تھی۔

''آجایئے پھوپھو اور دیکھئے یہ آپ کا کمرہ ہے یا......؟''

''کمرہ تو میرا ہے لیکن...... یہ سب کیا...... یہ کمرہ میرا تو نہیں......''

مائرہ نے حیرانگی سے اپنے کمرے کو دیکھتے ہوئے ہونٹوں کو سکوڑا۔ تھکان ایکدم اس کے اندر اتر آئی تھی۔

''تو کس نے کہا یہ آپ کا کمرہ ہے پھوپھو۔ کبھی تھا آپ کا کمرہ لیکن اب تو میرا ہے۔'' ماہم نے ''میرا'' پہ زور دیتے ہوئے کہا۔

''کیا......'' مائرہ نے بھینچی بھینچی آواز میں کہا۔

''دیکھئے پھوپھو میرا کمرہ کیسا لگ رہا ہے۔ کتنا اچھا ڈیکوریٹ کیا ہے۔''

''ہاں، ہاں بہت خوبصورت......'' مائرہ نے آنسوؤں کا پھندا حلق میں اتارتے ہوئے دھیرے سے کہا۔ الفاظ بمشکل اس کے لبوں سے ادا ہوئے تھے۔

''آپ کے کمرے کو دیکھ کر ایکدم گھٹن کا احساس ہوتا تھا۔ لگتا تھا کوئی بوڑھی روح سمائی ہوئی تھی آپ میں۔ میں نے آپ کے کمرے کی ساری پرانی چیزیں کباڑیے کو دے دیں۔ اب بھلا آپ کے دور میں کون پسند کرتا ہے۔ دیواروں کے رنگ مختلف رنگوں میں کتنا جچ رہے ہیں۔ اور یہ پردوں کا کلر دیکھئے کتنا سوٹ کر رہا ہے۔ آپ کے کمرے کا تو وہ گہرے کلر بھرا پڑا تھا۔ کمرے کو دیکھ کر کسی بوڑھی روح کا احساس ہوتا تھا۔''

''میری اور آپ کی پسند میں کتنا فرق ہے نا پھوپھو؟''

ماہم پھوپھو کی کیفیت سے بے خبر بولے

چلی گئی۔ اس نے پھوپھو کے چہرے کی بدلتی رنگت کو دیکھا نہ اس کی آنکھوں میں تیرتے آنسوؤں کو۔ اس نے تو یہ بھی محسوس نہ کیا۔ پھوپھو نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ ایکدم سے خاموش کیوں ہیں!

مائرہ نے صرف سر ہلانے پر اکتفا کیا تھا۔ لفظ لبوں پر ہی دم توڑ گئے تھے۔

"وہ کتابیں...... پینٹنگز...... کدھر گئیں......؟" مائرہ کی آواز گہری کھائی ابھری تھی جیسے ساری ادب سے متعلق کتابیں۔ ایکدم بورنگ، مجھے ان ادبی کتابوں سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ اس لئے ردی والے کو دے دیں۔ وہ پینٹنگز اوپر چھت پر پڑی ہیں اور وہ مٹی کی صراحی جس میں آپ تازہ گلاب رکھا کرتی تھیں وہ پھینک دی۔ اس کی جگہ یہ مصنوعی درخت کمرے کے کونے میں رکھا کتنا حسین دکھائی دے رہا ہے۔ آنکھوں کو تراوٹ بخشتا ہوا۔ اور آل سب کچھ چینج ہو چکا ہے۔ کتنا اچھا لگا رہا ہے۔ یہ کشادہ سا کمرہ وہ اب......؟"

مائرہ کی آنکھوں میں برسات اتر آئی تھی۔ اس نے ہاتھ کی پشت سے آنکھیں صاف کیں۔

"چلیے اب آپ آرام کریں۔ باقی باتیں رات میں ہوں گی۔ وہ کہتی ہوئی کمرے سے نکل گئیں۔

وہ بیڈ پر گر سی گئی۔ تھکن ایکدم وجود میں اتر آئی تھی۔ جس کی خوشبو تین سال تک اس کی روح میں سمائی رہی تھی وہ اب لمحوں میں ہوا ہو گئی تھی۔

مائرہ کے پاس ادب سے متعلق نئی اور پرانی بہت ساری کتابیں تھیں اور کچھ دنیا ادب کی عمدہ کتابیں جو اس کی روح، اس کی سانسوں کو تازہ گلاب کے پھولوں کی مہک دیتی تھیں۔ اب ان کی جگہ غیر ادبی کتابیں موجود تھیں۔ کمرے کے درودیوار نے بھی اسے اپنی باہوں میں پناہ نہیں دی تھی۔ یہ کمرہ وہ نہیں جس کے نقوش آج بھی اس کے ذہن میں تھے اور تین سال تک ذہن میں جوں کے توں رہے تھے۔

"میں نہیں جانتی باپ کے گھر سے جا کر بھی اس گھر کے ساتھ کوئی اتنا گہرا تعلق رہتا ہے کہ نہیں۔ اگر رہتا تو میرا اپنے اس کمرے کے ساتھ ضرور رہتا۔

یہ مصنوعی درخت کمرے کے ایک کونے میں رکھا کتنا حسین دکھائی دے رہا ہے۔ آنکھوں کو تراوٹ بخشتا ہوا، اور آل سب کچھ چینج ہو چکا ہے۔ کتنا اچھا لگ رہا ہے نہ کشادہ کشادہ سا کمرہ اب......؟"

مائرہ کی آنکھوں میں برسات اتر آئی تھی۔ اس نے ہاتھ کی پشت سے آنکھیں صاف کیں۔

اس نے کھڑکی سے جھانک کر آسمان دیکھا۔ تو اس کا رنگ اور بہت نیلا لگا، مزید چوڑا اور دور لگا۔ بالکل اس طرح جیسے یہ "گھر اور کمرہ"۔ وہ اس گھر سے آسمان پر ٹمٹماتے تارے کی طرح جو دھیرے دھیرے غائب ہو جاتا ہے وہ بھی اس کی طرح معدوم ہو گئی تھی۔

اس کے دل میں یہ بات کسی تیر کی طرح چبھ گئی تھی کہ "اب یہ کمرہ آپ کا نہیں میرا ہے۔"

اپنے کمرے کی وہ خوشبو اب اسے نصیب نہ ہو سکے گی۔ اس کے کمرے کے ساتھ لیموں اور مہندی کے پودے تھے۔ ان کی بھینی بھینی خوشبو ہوا کے ساتھ پورے گھر میں پھیل جاتی۔ وہ ان کے پتے توڑ کر ہتھیلی پر رگڑتی اور آنکھیں بند کر کے ناک کے قریب لے جا کر سونگھتی اور بھینی بھینی خوشبو شام کے اس ماحول کو اتنا خوب صورت بنا دیتی تھی کہ سارا دن وہ اس پل کا

انتظار کرتی تھی۔ وہ تین سال تک بدیس میں اس خوشبو کے ساتھ چلتی رہی تھی۔ اب یہ یاد دل میں گدی گدی کرتے ہوئے درد کا سبب بن رہی تھی۔ وہ جو اس گھر کے اس ماحول کو سوچتی آئی تھی وہ سب بدل گیا تھا۔ وہ وقت ویسا رہ اتھا نہ حالات۔ تین سالوں میں جلدی بہت ساری تبدیلیاں رونما ہوئی تھیں۔

بھائی بھابھیوں نے گھر کے ماحول کو اپنے مزاج کے مطابق ڈھال لیا تھا۔ امی جو کہتی تھی تو نے پرائے گھر جانا ہے تو واقعی ہی وہ تو پرائی ہوئی ہی۔ لیکن اس کا گھر بھی پرایا ہو گیا تھا۔ وہ خود کو یہاں مہمان محسوس کر رہی تھی۔ اس کی دلی کیفیات بہت عجیب سی ہو رہی تھیں۔ وہ خود کو پانی سے نکلی مچھلی کی طرح محسوس کر رہی تھی۔

گھر میں مائرہ کی سب سے پسندیدہ جگہ اس کا کمرہ تھا۔ وہ اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑی ہو کر گھر میں چلتی پھرتی دوڑتی زندگی کو دیکھ لیتی تھی۔ اپنے گھر کی زندگی ہمیشہ اسے چلتے پانی کی روانی جیسی لگتی تھی۔ بہن بھائیوں کے قہقہے گونجتے، امی ابو ڈانٹتے، ہنستے۔ وہ بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹی تھی اور پورے گھر میں اس کی چلتی تھی کسی حکمران کی طرح۔ اور اب اسے اس گھر کی زندگی ٹھہرے پانی جیسی گئی۔ وہ کمرہ اس کا ضرور تھا لیکن اب اس پر مائرہ کا کوئی اختیار نہ رہا تھا۔ اس کے کمرے میں ایک ٹھہراؤ تھا۔ سکون تھا، اس میں زندگی دھڑکتی نظر آئی تھی۔ لیک اب یہ کمرہ ابتری کا شکار تھا۔ جسے ماہم کہہ رہی تھی کہ بدل کر رکھ دیا۔ کبھی اس کمرے میں ہر چیز اس کی مرضی اور خواہش کے مطابق رکھی جاتی تھی وہ اس وقت کو مٹھی میں قید کر لینا چاہتی تھی لیکن وقت بہت بے رحم شے ہے جو کبھی کسی کا ہوا ہے نہ ہوگا۔ وقت کے یہ لمحے اس کی مٹھی سے نکلے جا رہے تھے۔ اس کمرے میں جو ایک لڑکی رہتی تھی۔ دھیمے ٹھہرے ہوئے مزاج والی اب وہ لڑکی اس گھر، اس کمرے سے بے دخل ہو گئی تھی۔ اس کی جگہ نئی لڑکی نے لے لی تھی۔ لیکن وہ بھی اس کی طرح مہمان تھی۔ اسے بھی پرائے گھر جانا تھا۔ اسے بھی اس کمرے سے محبت ہو گئی لیکن ...... جس طرح میں اپنے کمرے کی در دیوار کو یاد کرتی تھی کیا کل کو یہ بھی یوں ہی یاد کرے گی......؟

اسے بدیس میں رہتے ہوئے اسے اپنے گھر، اپنے کمرے کی در و دیوار یاد آتے تھے۔ اس کا دل بے قرار ہو جاتا تھا۔ وہ ابھی تک اس گھر سے مانوس نہ ہوئی تھی۔ وہ گھر اسے بیگانہ لگتا تھا۔ وہ اپنے گھر کو یاد کر کے رو دیتی تھی۔ اس گھر میں گزرا وقت ایک خواب کی طرح نظروں کے سامنے سے گزر گیا۔ جس گھر میں اس نے زندگی کی اٹھائیس بہاریں بتائی تھیں۔ وہ دکھی دل اور بھیگی نگاہوں کے ساتھ ماہم کو دیکھ رہی تھی۔ کل وہ بھی اس کمرے کو چھوڑ کر چلی جائے گی۔ یہ کمرہ اس کے لئے بھی پرایا ہو جائے گا۔ کمرہ وہی رہے گا مگر مکین بدل جائے گا۔" مائرہ کو یہ سوچ ہی بہت تکلیف دے رہی تھی۔ یہ احساس ہی اس کے لئے سوہان روح تھا۔

"اب آپ آرام کریں پھوپھو۔ باقی باتیں رات میں ہوں گی۔" وہ مائرہ کے جذبات سے بے خبر کہتی ہوئی کمرے سے نکل گئی! اس کے لبوں سے ٹھنڈی آہ نکلی۔

وہ بیڈ پر گر سی گئی! تھکن ایک دم وجود میں اتر آئی تھی۔ جس کی خوشبو تین سال تک اس کی روح میں سمائی رہی تھی۔ وہ اب لمحوں میں ہوا ہو گئی تھی۔ مائرہ کے پاس ادب سے متعلق نئی اور پرانی بہت سی کتابیں تھیں اور کچھ دنیا ادب کی

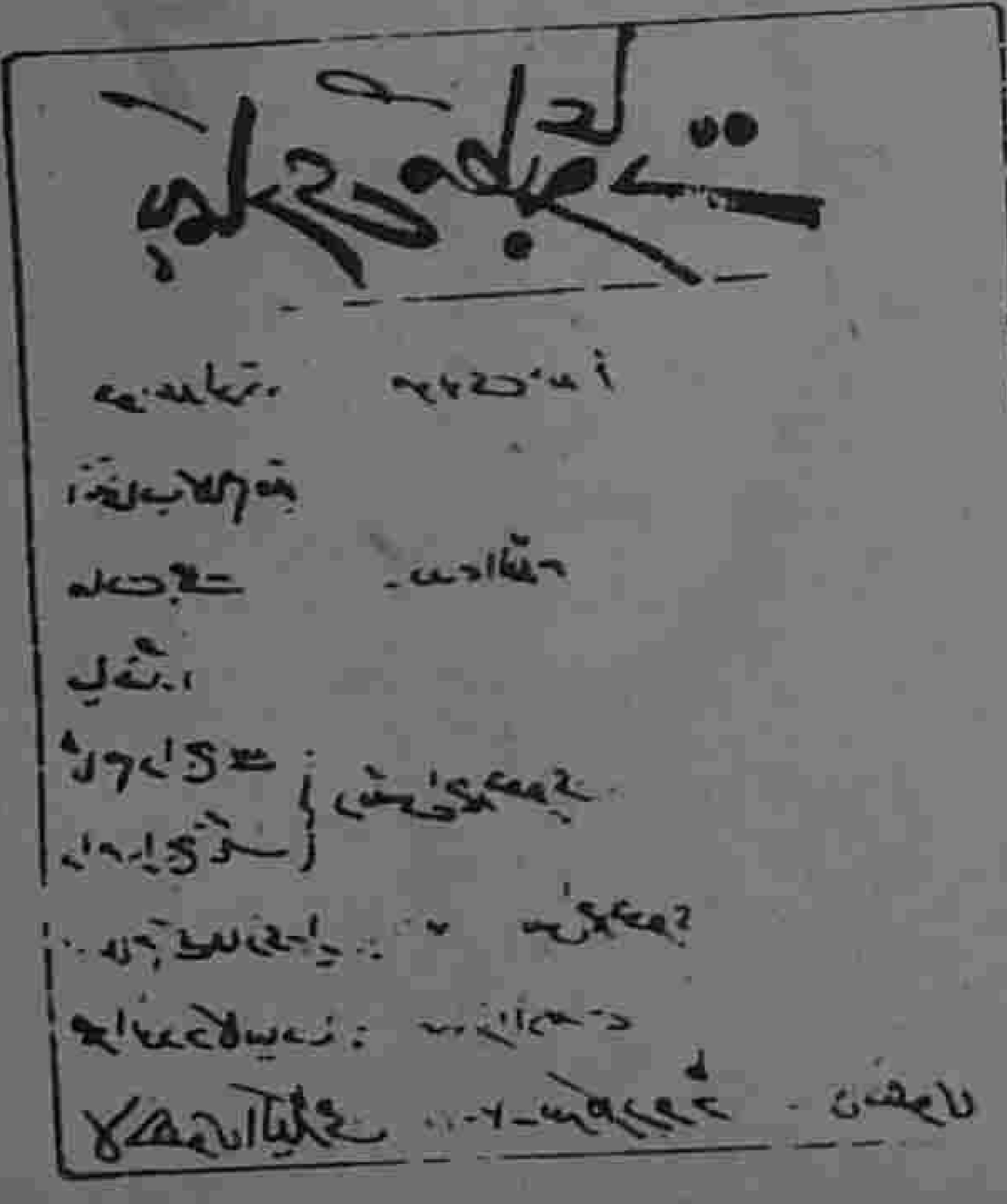
عمدہ کتابیں جو اس کی، اس کی سانسوں کو تازہ گلاب کے پھولوں کی سی مہک دیتی تھیں۔ اب ان کی جگہ غیر ادبی کتابیں موجود تھیں۔ کمرے کے در و دیوار نے بھی اسے اپنی بانہوں میں پناہ نہیں دی تھی۔ یہ کمرہ وہ نہیں جس کے نقوش آج بھی اس کے دل و دماغ میں تھے۔ اور تین سال تک ذہن میں یوں کے توں رہے تھے۔

"میں نہیں جانتی باپ کے گھر سے جا کر بھی اس گھر سے اس کا اتنا گہرا تعلق رہتا ہے کہ نہیں۔ اگر رہتا تو میرا اپنے اس کمرے کے ساتھ ضرور رہتا۔ میری سوچ میرے ذہن کے پسِ منظر میں میرا کمرہ بار بار ابھر رہا ہے۔ میں اپنے کمرے کے اس نقش کو دل سے نہیں نکال سکتی۔ جیسے میں نے بڑے پیار، لگن اور شوق سے سجایا تھا۔ نیا اور پرانا کمرہ بہت شدت کے ساتھ ابھر رہے ہیں۔ میرا کمرہ میری سلطنت تھا۔ جس پر میری بادشاہت تھی۔ یہ گھر، یہ کمرہ دونوں میرے لئے اجنبی ہو چکے ہیں۔" وہ کمرے کو دیکھتی ہوئی روئے جا رہی تھی۔ اس گھر میں گزرا وقت آنکھ مچولی کرتا ہوا نظروں کے سامنے سے گزر گیا تھا۔ مائرہ نے اس گھر، اس کمرے میں گزرے وقت کی یادوں کی پوٹلی باندھ کر دل کے نہاں خانوں میں دفن کر دی۔ اس کے دل میں درد کی ایک شدید لہر اٹھی، اتنی شدید کہ اس کا دل چاہا کہ وہ حلق پھاڑ کر روئے، چیخے چلائے، اس بچے کی طرح جو مار پڑنے پر بلک لک کر روتا ہے۔

بیٹیاں جب باپ کی دہلیز سے پیا دیس سدھار جاتی ہیں تو میکے میں ان کی حیثیت ایک مہمان کی سی ہو جاتی ہے اور وہ بھی والدین کی زندگی میں۔ ان کے بعد تو کبھی کبھار کا مہمان بھی اور بن بلایا مہمان بن جاتی ہیں۔ اس لئے جب وہ اپنے گھر جائیں تو اس گھر میں ہی دل لگا کر رہیں کیونکہ وہ ہی ان کا اصلی گھر ہوتا ہے۔ دستور دنیا یہ ہی ہے کہ جانے والوں کی جگہ نئے لوگ لے لیتے ہیں۔ نسل در نسل یہ ہی سلسلہ چلتا رہتا ہے۔

جس کمرے میں مائرہ پورے مکان اور استحقاق کے ساتھ رہتی تھی وہاں اب اس کی بھتیجی انہی احساسات کے ساتھ رہی تھی مکین بدلہ تھا لیکن احساسات نہ ہی تھے۔ دستور دنیا یہ ہی ہے کہ جانے والوں کی جگہ نئے لوگ لے لیتے ہیں۔ نسل در نسل یہ ہی سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ اپنے سے جڑے رشتوں کو قائم رکھنے کے لئے دل کشادہ کرتے ہوئے اس تبدیلی کو قبول کرنا چاہئے۔ مثبت سوچ، محبت، خلوص، رشتوں کو مضبوط اور پائیدار بناتی ہے۔

✦✦✦



قربت ہجر میں محبت

ندا حسنین

"خیریت ملک فیاض... ایسی کیا صورت پیش آئی کہ آپ لوگوں کو حویلی کا رخ کرنا پڑا...؟" ڈرائنگ روم میں وہ سب ایک ساتھ بیٹھے تھے۔ ملک فیاض اور جمیل کے جز بز ہوتے چہرے کو بغور دیکھ کر نجم النساء نے سوالیہ انداز میں گفتگو کا آغاز کیا۔

"نجم النساء بیگم بات دراصل یہ ہے کہ ہم لوگ ایک مثبت سوچ اور ایک خاص پیغام کے ساتھ یہاں آئے ہیں۔ اس امید کے ساتھ کہ ہماری بات و ہماری نیک نیتی سے تعبیر کیا جائے گا اور اس میں سے کوئی منفی پہلو نہ نکالا جائے گا۔" ملک فیاض نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں تمہید باندھتے ہوئے گفتگو کا آغاز کیا۔

"آپ جس مقصد سے آئے ہیں اس بات کا آغاز کریں ملک صاحب۔ ہمارا جواب کیا ہوگا یہ تو آپ کی غرض جان کر ہی بتایا جا سکتا ہے۔"

"اماں ٹھیک کہہ رہی ہیں ملک فیاض صاحب۔ جو بھی بات آپ نے کہنی ہے وہ کھل

ناولٹ



کہیں۔" نجم النساء کے جواب پر آفاق الدین بھی متفق ہوتے ہوئے کہنے لگے۔ ملک فیاض نے ملک جمیل کی جانب دیکھا ان کی نگاہوں میں سوال تھا کہ جو بات وہ کہنے آئے ہیں اس کا آغاز کریں یا نہ کریں۔ ملک جمیل نے انہیں اپنا مدعا پیش کرنے کا اشارہ کیا۔

"دراصل ہم آپ کی حویلی میں سوالی بن کر آئے ہیں...!!" ملک فیاض نے اتنا ہی کہا تھا، عین اسی پل حذیفہ اور عالیان آگے پیچھے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے اور نشست سنبھال کر بیٹھ گئے۔ ان دونوں کی آمد پر وہاں موجود تمام افراد چونک کر انہیں دیکھنے لگے۔

"جمیل پتر... ایک بار پھر سوچ لے۔ سامنے آفاق الدین کا لڑکا آبیٹھا ہے۔ اس کے

اٹھارویں قسط کا خلاصہ



سامنے اس کی منگیتر کے رشتے کی بات کرنا منا سب ہوگا یا نہیں۔۔۔۔؟؟" ملک فیاض حذیفہ کے سپاٹ و سنجیدہ شکل دیکھ کر سرگوشی کے سے انداز میں پہلو میں بیٹھے ملک جمیل سے گویا ہوئے۔

"فکر نہ کریں ابا جی۔۔۔ ہم جس مقصد سے آئے ہیں آپ وہ کام کریں۔" ملک جمیل نے سامنے بیٹھے حذیفہ پر ایک نظر ڈالتے ہوئے آہستگی سے جواب دیا۔

"اب کہہ بھی دیجئے ملک فیاض صاحب۔۔۔۔ ہم سب آپ کی بات سننے کے انتظار میں ہیں۔" شافع الدین قدرے بے زاری سے بولے۔

"بات یہ ہے شافع الدین کہ ہم اپنے پوتے ملک شاہ ویز کا رشتہ' تمہاری بیٹی شمع کیلئے لے کر آئے ہیں۔" ملک فیاض نے ہمت کر کے بالا آخر اپنا مدعا بیان کر ہی ڈالا۔ مگر ان کی بات کے ردعمل کے طور پر وہاں موجود تمام افراد شاکڈ کی سی کیفیت میں ملک فیاض اور ملک جمیل کو دیکھنے لگے۔ عالیان نے بے اختیار حذیفہ کی جانب دیکھا۔ اس کا چہرہ شدید غصے کے عالم میں تمتما رہا تھا۔

"ہوش میں ہیں آپ لوگ۔۔۔۔۔۔؟؟ میرے سامنے' میری منگیتر کے رشتے کی بات کرنے کی ہمت کیسے ہوئی آپ کی۔۔۔۔؟؟" حسب توقع حذیفہ ضبط کھوتے ہوئے غصے سے کہہ اٹھا۔

"مگر تم تو یہ رشتہ برقرار رکھنے کیلئے راضی ہی نہیں ہو۔۔۔؟؟" ملک جمیل بے ساختہ کہہ اٹھے۔ حذیفہ ان کی بات پر ایکدم سے چپ ہو اٹھا۔

"یہ تم سے کس نے کہا ملک جمیل۔۔۔۔؟؟" نجم النساء نے حذیفہ کو ایک نظر دیکھ کر ملک جمیل سے نا گواری سے سوال کیا۔

"یہ بات تو سارا فیض پور جانتا ہے۔" ملک جمیل نے بھی فوراً بولے۔

"تم کہنا چاہتے ہو کہ حویلی کی باتیں اب سر عام فیض پور میں گردش کر رہی ہیں۔۔۔۔؟؟" نجم النساء نے تنک کر جواباً سوال کیا۔

"شیشوں کے گھروں میں رہنے والوں کے حالات و واقعات زمانے سے مخفی نہیں رہ سکتے۔ ہم اور آپ شیشوں کے محل کے مکین ہیں۔ لوگوں سے چھپ کر نہیں رہ سکتے ہم لوگ۔۔۔۔!!" ملک جمیل نے متانت سے جواب دیا۔ عالیان نے چونک کر ملک جمیل کی جانب دیکھا۔ یہاں جو بھی گفتگو ہو رہی تھی وہ توقع کے برخلاف تھیں۔

"نجم النساء بیگم ہم یہاں نیک نیتی سے آپ کی پوتی کا رشتہ لے کر آئے ہیں۔ قبول کرنا یا نہ کرنا آپ لوگوں کا اختیار ہے۔ مگر کوئی بھی جواب دینے سے پہلے آپ شمع بیٹی سے بھی اس کی مرضی دریافت کر لیجئے گا۔" ملک فیاض نے اصل مدعے پر واپس آتے ہوئے کہا۔ مگر شمع کے حوالے سے کی گئی بات پر وہاں موجود تمام نفوس بری طرح چونک اٹھے۔

"شمع سے مرضی جان لینے سے کیا مراد ہے آپ کا۔۔۔ کہنا کیا چاہتے ہیں آپ۔۔۔؟؟" شافع الدین شدید نا گواری کے زیر اثر بولے۔ حذیفہ کے چہرے پر بھی الجھن بھرے تاثرات بھرپور انداز میں نمایاں ہوئے۔ ملک فیاض کے اس ایک جملے کے پیچھے کئی معنی مخفی تھے۔

"دیکھو شافع الدین۔۔۔ اس دن جو کچھ بھی ہوا۔۔۔ اس میں قصور تو شمع بیٹی کا نہ تھا مگر میرے بیٹے کی ایک غلط حرکت سے جس طرح تمہاری بیٹی نے رسوائی جھیلی ہے۔ شاید اس کے بعد یہی بہتر ہے کہ ان دونوں بچوں کی آپس میں

شادی کردی جائے۔" ملک جمیل نے بات سنبھالتے ہوئے ڈھکے چھپے انداز میں سمجھانا چاہا۔

"تم یہ بات بھول رہے ہو کہ شمع کا رشتہ میرے بیٹے حذیفہ سے طے ہے۔ منگیتر ہے وہ اس کی۔۔۔ تمہارے بیٹے نے ایک سنگین غلطی کی مگر تم بھی اس طرح کی بات کرو گے۔۔۔۔ تم سے مجھے یہ امید نہ تھی۔" آفاق الدین اس گفتگو میں پہلی مرتبہ شامل ہوئے مگر ان کے لہجے سے جھلکتی خفگی صاف عیاں تھی۔

"کیا تمہارا بیٹا اب بھی راضی ہے شمع سے شادی کیلئے۔۔۔۔۔ ؟؟" ملک جمیل نے حذیفہ کو دیکھ کر چبھتے ہوئے لہجے میں آفاق الدین سے سوال کیا۔

"یہ ہمارے گھر کا ذاتی معاملہ ہے ملک جمیل۔ ہمیں اپنے بچوں کا رشتہ کب اور کہاں کرنا ہے یہ فیصلہ ہم خود کریں گے۔ مشورے کیلئے ہمیں باہر والوں کی ضرورت نہیں ہے۔" نجم النساء نے کھردرے لہجے میں دوٹوک جواب دے کر قصہ کرنا چاہا۔

"میں پھر سے کہوں گا کہ ایک بار شمع سے پوچھ لیں۔ ممکن ہے وہ شاہ ویز سے رشتے پر راضی ہو۔" ملک جمیل ایک بار پھر کوشش کرتے ہوئے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے بولے۔

"شمع، ملک شاہ ویز سے کسی بھی طرز کا کوئی بھی تعلق نہیں رکھنا چاہتی۔" بڑا ہی اسٹریٹ فارورڈ جواب تھا جو عالیان کی جانب سے آیا تھا۔ وہ سب چونک کر عالیان کی جانب متوجہ ہوئے۔

"اتنا دعوے سے کیسے کہہ سکتے ہو تم۔۔؟؟" ملک جمیل نے ناپسندیدگی سے عالیان کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیونکہ بہت اچھی طرح جانتا ہوں کہ شمع آپ کے بیٹے سے کتنی نفرت کرتی ہے۔ جس شخص کی وجہ سے اس کا کردار داغدار ہوا، جس کی وجہ سے اس کی ماں نے ذہنی اذیتیں سہیں، اس کا باپ کئی صعوبتوں میں مبتلا رہا۔ اس شخص سے شادی تو در کنار وہ اس کی شکل دیکھنے کی بھی روادار نہیں۔" عالیان نے مستحکم لہجے میں جواب دیا۔

"میرے بیٹے سے غلطی ہوئی ہے اور وہ شرمندہ بھی ہے۔ شمع کیلئے اچھے جذبات رکھتا ہے۔ شمع کے ساتھ جو کچھ بھی زیادتی ہوتی رہی وہ اس پر دکھ کا شکار ہے اور اپنی غلطی کا مداوا کرنا چاہتا ہے۔" ملک جمیل بے اختیار بیٹے کی دفاع میں کہہ اٹھے۔

"مداوا نہیں کر رہا، بلکہ بلیک میل کر رہا ہے آپ کا بیٹا شمع کو۔۔۔ جاننا چاہیں گے کیوں۔۔؟؟" عالیان نے اصل قصے سے پردہ اٹھاتے ہوئے کہا۔ اُس کے اس بیان پر ملک جمیل کے ساتھ نجم النساء، آفاق، شافع، سلطان ہی نہیں حذیفہ نے بھی ٹھٹھک کر عالیان کو دیکھا۔

"شاہ ویز، شمع کو بلیک میل کر رہا ہے۔۔۔ یہ کس طرح کی الزام تراشی کر رہے ہو تم میرے بیٹے پر۔۔۔؟؟" ملک جمیل نے درشتی سے اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"تم کہنا کیا چاہتے ہو عالیان۔۔۔ ایسا کیا کیا ہے شمع بیٹی نے جو ملک شاہ ویز اسے بلیک میل کرے گا۔۔۔۔۔؟ عالیان کی بات نے سلطان الدین کا بھی ماتھا ٹھنکا۔

"ایک غلطی سرزد ہوئی ہے شمع سے، بس اسی کا خمیازہ بھگت رہی ہے شمع۔۔۔۔۔!! عالیان نے اس سب کی جانب بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا غلطی کر بیٹھی ہے شمع۔۔۔۔۔؟؟" شافع الدین بھی حیران و پریشان سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"پہیلیاں مت بجھاؤ۔۔۔ سیدھے بتاؤ کہ معاملہ کیا ہے۔۔۔؟؟" نجم النساء بھی صورتحال کو بدلتا دیکھ کر کر خفگی سے سوال کرنے لگیں۔

"شافع انکل جب حوالات میں قید تھے تب سفینہ آنٹی کی حالت بہت بگڑ گئی تھی۔ اور آپ سب جانتے ہیں کہ اس وقت شمع کس قدر اکیلی تھی۔ کوئی بھی تو نہیں تھا اس کے ساتھ۔۔ سب نے تو ساتھ چھوڑ ڈالا تھا اس کا۔ نہیں دیکھ سکی وہ کھڑے کھڑے اپنی دنیا لٹتی۔۔۔ گھبرا گئی تھی وہ اپنے ماں باپ کو دور ہوتا دیکھ کر اور تب ہی اس نے ملک شاہ ویز سے درخواست کی تھی کہ وہ شافع انکل پر دائر مقدمہ واپس لے لے۔ ملک شاہ ویز نے اس پل اپنے ظلم پر شرمندہ ہو کر مقدمہ واپس لیا تھا نہ ہی آپ لوگوں کی درخواست پر۔ اُس نے شمع کی لاچارگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے شافع انکل پر سے اپنا کیا گیا کیس واپس لیا ہے۔" عالیان نے سارا قصہ مکمل تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہوئے کہا۔ اس کی بات سن کر ڈرائنگ روم میں خاموشی سی چھا گئی۔

"تم کیسے جانتے ہو یہ سب۔۔۔؟؟" حذیفہ نے مشکوک نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے دریافت کیا۔

"میں نے ملک شاہ ویز کو شمع کو دھمکی دیتے ہوئے سنا تھا۔" عالیان نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے جواب دیا۔

"مجھے یقین نہیں آ رہا۔۔۔ میں نے اپنے بیٹے کے چہرے پر پچھتاوہ دیکھا' ملال دیکھا۔ وہ شرمندہ ہے اپنے کیے پر۔۔۔ اور اپنی غلطی کی بھرپائی کرنا چاہتا ہے۔ اسی لیے اُس نے ہمیں یہاں بھیجا ہے۔" ملک جمیل بیٹے کی وضاحت دیتے ہوئے احتجاجاً بولے۔

"شرمندگی یا پچھتاوہ نہیں ہے اُسے ملک جمیل صاحب۔۔۔ وہ صرف انتقام لینا چاہتا ہے۔" عالیان نے ٹوکتے ہوئے چیخ کر جواب دیا۔ وہاں موجود تمام نفوس پر سناٹا طاری ہو گیا۔

"انتقام کیسا انتقام۔۔۔؟" ملک جمیل کا ماتھا ٹھنکا۔ ملک فیاض بھی جزبز ہوتے پہلو بدل گئے۔ کہیں نہ کہیں انہیں ادراک ہو چکا تھا کہ عالیان کس انتقام کی بات کر رہا تھا۔

"بتاؤ حذیفہ کہ شاہ ویز کس بات کا انتقام لینا چاہتا تھا۔ کیا ساری تفصیلات میں ہی سناؤں ان لوگوں کو۔" عالیان بے اختیار حذیفہ کی طرف گھومتے ہوئے چیختے ہوئے لہجے میں بولا۔

"میں۔۔۔۔۔۔!!" حذیفہ اس اچانک غیر متوقع سوال پر بری طرح بوکھلا اٹھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اس راز پر سے یوں اچانک پردہ اٹھنے کو بے قابو ہوگا۔ وہ بھی عالیان کے ہاتھوں۔۔۔

"ہاں تم۔۔۔ بتاؤ سب کو کہ کس بات کا جھگڑا ہے تمہارے اور شاہ ویز کے درمیان۔۔۔؟؟" عالیان نے حذیفہ کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

"اسے پتا کیسے چلا۔۔۔ وہ کیسے جانتا ہے کہ ملک شاہ ویز مجھ سے انتقام لینا چاہتا ہے۔" حذیفہ حیران و پریشان سا سوچنے لگا۔

"بتاؤ حذیفہ۔۔۔ خاموش کیوں ہو۔ سچ سچ بتاؤ کہ حقیقت کیا ہے۔ ملک شاہ ویز کس بات کا انتقام لینا چاہتا تھا تم سے۔۔۔؟؟" لمحہ بہ لمحہ گھمبیر ہوتی صورتحال پر نجم النساء شش و پنج میں مبتلا سوال کرنے لگیں۔ مگر حذیفہ جزبز سا کھڑا رہا۔ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ بیٹن کا معاملہ کیسے

سب کے سامنے گوش وگزار کرے۔

"شاید تم ہمت نہیں جٹا پا رہے۔ میں ہی تمہاری مشکل آسان کر دیتا ہوں۔ میں ہی سب کو حقیقت بتا ڈالتا ہوں۔" عالیان نے فیصلہ کن لہجے میں کہا اور سب کی جانب متوجہ ہو گیا۔

"بات دراصل یہ ہے کہ ملک شاہ ویز اور سبین کے درمیان تعلقات تھے۔ حذیفہ کو پتا چل گیا تھا اور شاید اسی بات کو لے کر دونوں کے درمیان جھگڑا ہوا تھا جس کا بدلہ شاہ ویز نے حذیفہ پر حملہ کر کے اور شمع کو اغواء کر کے لیا تھا۔" عالیان، حذیفہ اور سبین کی باتوں سے جو نتیجہ اخذ کر پایا تھا وہ ان سب کے سامنے کہہ سنایا۔ عالیان کی بات سن کر وہ سب شاکڈ سی کیفیت میں حذیفہ کی جانب دیکھتے چلے گئے۔ ان سب کی نگاہوں میں سوال ہی سوال تھے۔ حذیفہ ان سب کی سوالیہ نگاہوں کو اپنے چہرے پر محسوس کر کے خاموشی سے لب بھینچے بیٹھا رہا۔

✧✧✧

"مجھے یقین نہیں آرہا سلطان کے بیٹے کی بات پر۔۔۔ وہ لڑکا ساری زندگی ملک سے باہر زندگی گزارتا آیا ہے اور یہاں محض چند دنوں میں وہ اتنا باخبر ہو گیا کہ ہمارے گھر کی باتیں وہ بھری محل میں اچھال گیا۔" حویلی سے واپسی کے سفر میں ملک جمیل غصے سے کہنے لگے۔ ان کے لہجے سے عالیان کیلئے واضح طور پر ناپسندیدگی جھلک رہی تھی۔ مگر ملک فیاض ان کی بات پر چپ سادھے بیٹھے رہے۔ ان کی مسلسل خاموشی پر ملک جمیل نے گردن موڑ کر انہیں دیکھا۔

"آپ چپ کیوں ہیں ابا جی۔۔۔ کچھ کہتے کیوں نہیں ہیں آپ۔۔۔؟" ملک جمیل نے باپ کی خاموشی پر جھنجھلاتے ہوئے استفسار کیا۔

"او پتر سلطان کا بیٹا ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ اپنا شاہ ویز اس لڑکی کے ساتھ دل لگی کرتا پھر رہا تھا۔ تم یہاں نہیں تھے، کافی تماشے کھڑے کیے تھے اس نے۔۔۔" ملک فیاض نے ناگواری بھرے لہجے میں بیٹے کو حقیقت سے آگاہ کیا۔

"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ ابا جی۔۔۔؟؟" ملک جمیل حق دق سے باپ کو دیکھنے لگے۔

"صحیح کہہ رہا ہوں پتر۔۔۔ اور تو کیا جانتا نہیں اپنی اولاد کو جو اتنا حیران ہو رہا ہے۔" اس بار ملک فیاض بھی جھنجھلاتے ہوئے ملک جمیل کو گھورنے لگے۔

"مگر ابا جی آپ جب یہ سب جانتے تھے تو آپ نے مجھے کچھ بتایا کیوں نہیں۔۔۔" ملک جمیل باپ کی جھڑکی نظر انداز کرتے ہوئے بولے۔

"اس میں تمہیں بتانے لائق آخر تھا ہی کیا پتر۔۔۔ شاہ ویز تو آئے روز کوئی نہ کوئی گل کھلائے رکھتا ہے۔ اور تمہارا یہ بوڑھا باپ بڑی مشکلوں سے اس کے کھلائے گلوں کو زمانے کی تیز نظروں سے چھپانے میں کامیاب ہوا ہے۔" ملک فیاض نے خفگی بھری نظروں سے ملک جمیل کو دیکھ کر جتایا۔ ملک جمیل باپ کی بیان کردہ حقائق جان کر لب بھینچے غصے سے گاڑی ڈرائیو کرنے لگے۔

"اور حویلی والوں کی وہ لڑکی کیا نام ہے اس کا۔۔۔ ہاں سبین۔۔۔! اس کے ساتھ تو بڑا ہی مسئلہ آن کھڑا ہوا تھا۔ تمہارا بیٹا اس لڑکی کو بھلا پھسلا کر فارم ہاؤس لے گیا تھا۔ اور اکیلا بھی نہیں تھا، اس کے آوارہ دوستوں کا ٹولہ بھی اس کے ہمراہ تھا۔ وہ تو اچھا ہوا جمیل پتر کہ بروقت حذیفہ وہاں پہنچ گیا۔ اور اس لڑکی کو شاہ ویز کے چنگل سے بچا لیا۔ بڑا ہی مسئلہ کھڑا ہو گیا تھا اُن

دنوں۔۔۔وہ حویلی والوں کی اپنی لڑکی کی غلطی تھی تب ہی حذیفہ معاملہ چھپا گیا۔۔۔۔۔مجھے بھی شاہ ویز اور اس کے آوارہ دوستوں کو بچانے کیلئے بڑے پاپڑ بیلنے پڑے۔کم بخت کوئی ایک بھی پولیس کے آگے زبان کھول دیتا تو لینے کے دینے پڑ جاتے۔بڑی مشکل سے معاملہ رفع دفع کیا تھا میں نے لیکن یہ شاہ ویز اپنی بے عزتی نہ بھلا سکا۔اسی بات کا بدلہ شاہ ویز نے حذیفہ کو مار پیٹ کر اور اس کی منگیتر کو اٹھا کر لیا تھا۔" ملک فیاض آہستہ آہستہ ملک جمیل کو ساری روداد سنا گئے۔

"جب آپ سب کچھ جانتے تھے تو مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا ابا جی۔۔۔۔۔۔؟؟" سارا قصہ جان کر ملک جمیل کا دل چاہا کہ اپنا سر پیٹ لیں۔

"میں ان تمام باتوں سے بے خبر ہو کر شاہ ویز کی باتوں میں آکر سفینہ کی بیٹی کا رشتہ مانگنے چلا گیا۔انجانے میں اُس لڑکی کیلئے مزید مشکلات کھڑی کر گیا۔" ملک جمیل افسوس بھرے لہجے میں گویا ہوئے۔

"سمجھانا تو چاہا تھا میں نے لیکن تم نے ملک شاہ ویز کی باتوں میں آکر شمع کیلئے رشتہ لے کر جانے کا ارادہ باندھ لیا تھا۔میں نے تجھے بار بار اشارہ دیا تھا کہ اچھی طرح سوچ لے سمجھ لے۔۔۔مگر تم نے میری بات کے مقصد کو نہ جانا۔۔۔" ملک فیاض نے بے چارگی سے کہا۔

"میرا اپنا خون ہے شاہ ویز مگر کتنا مختلف ہے مجھ سے۔۔۔اپنے انتقام' اپنے مقاصد کے خاطر اس نے اپنے باپ کو استعمال کرنے سے بھی گریز نہیں کیا۔" ملک جمیل دکھی لہجے میں ہولے سے بڑبڑائے۔

"پتر جوان خون ہے۔۔نوجوانی میں ایسی غلطیاں ہو جاتی ہیں۔تُو بھی اس کی باتوں کو زیادہ دل پر نہ لے۔وقت کے ساتھ ٹھیک ہو جائے گا۔" ملک فیاض نے بیٹے کا غم دور کرنے کی غرض سے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"جوان خون ہونے کا یہ مطلب نہیں ابا جی کہ وہ جوانی کے زعم میں مبتلا ہو کر اپنے باپ کی پگڑی اُچھالنا شروع کر ڈالے۔لوگوں کی عزت سے کھیلنا شروع کر دے۔" ملک جمیل ایک دم سے بھڑک کر بولے۔ملک فیاض نے بیٹے کو غصے میں دیکھ کر خاموشی میں عافیت سمجھی۔

"اسے اب اپنی روش بدلنی ہو گی ابا جی۔۔۔۔شاہ ویز کو اب خود کو بدلنا ہوگا۔اور اُس نے جو جو زیادتیاں لوگوں کے ساتھ کر رکھی ہیں۔اس کا ازالہ بھی اسے کرنا ہوگا۔" ملک جمیل نے مستحکم و فیصلہ کن انداز میں بات ختم کرتے ہوئے کہا۔ ملک فیاض بیٹے کی بات سے کسی حد تک متفق ہوتے ہوئے اثبات میں سر ہلا گئے۔

✧✧✧

"کیوں آئے تھے یہ لوگ یہاں۔۔۔؟؟ کیا باتیں ہوئیں ہیں آپ لوگوں کے درمیان۔۔۔آپ لوگ بتاتے کیوں نہیں۔۔۔؟؟" لاؤنج میں نجم النساء ہونٹوں پر چپ کی مہر لگائے خاموشی سے بیٹھی تھیں۔ان کے چہرے پر اس دم بلا کی سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔ان کے دونوں جانب انکے دونوں بیٹے بھی لب بھینچے سپاٹ چہروں کے ساتھ براجمان تھے۔

حذیفہ کی خشمگین نگاہیں عالیان کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔عالیان ان نگاہوں کا ارتعاش خود پر محسوس کرتے ہوئے حذیفہ کو نظر انداز کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔وہ خود بھی جان چکا تھا کہ حذیفہ اس راز کے یوں فاش ہونے پر خوش نہیں ہے۔اور اس سے سخت ناراض ہے۔

مگر اس نے جو کچھ بھی کہا اس پر مطمئن تھا۔ ان چند دنوں میں وہ یہ بہت اچھی طرح جان چکا تھا کہ ہر کوئی اپنی غرض اور مفاد کے خاطر ان دونوں ماں بیٹی کے ساتھ بے دردی سے ناانصافی کیئے جا رہا تھا۔ حقائق سے آگہی کے بعد کم از کم اب کوئی شمع کو بدکردار کہہ کر اس کی ذات کے پرخچے نہیں اڑا سکتا۔

"کھلایا ہوگا تمہاری بیٹی نے پھر کوئی نیا گل۔۔۔ جب سے اس شاہ ویز کے ہاتھوں اغواء ہوئی ہے تب سے اس کے تعلقات ہی ختم نہیں ہو رہے ان ملکوں سے۔۔" سفینہ کی بات کے جواب میں انیسہ طنزیہ لہجے میں بڑبڑائیں۔

"میری بیٹی ایسی نہیں ہے انیسہ بھابھی۔ نہ ہی ان لوگوں سے میری بچی کے کوئی تعلقات ہیں۔" سفینہ ناگواری سے ٹوکتے ہوئے بولیں۔

"کاش کہ ایسا ہوتا مگر پورا فیض پور جانتا ہے کہ۔۔۔" انیسہ کی زہر آلود زبان ایک بار پھر زہر اگلنے کو تیار تھی۔ مگر عالیان سے اب برداشت نہ ہو سکا اور وہ ناگواری سے اٹھ کر چلا گیا۔ اس کو وہاں سے جاتا دیکھ کر سلطان نے بھی وہاں قیام کرنا زیادہ مناسب نہیں جانا اور اس کے پیچھے اٹھ کر چلے گئے۔

"اپنی فساد بھری زبان بند رکھو انیسہ اور اپنی بھانجی کو بلا کر لاؤ۔" آفاق الدین نے چھوٹے بھائی اور بھتیجے کو وہاں سے جاتا دیکھ کر، درشتگی سے انیسہ کو جھڑکتے ہوئے حکم صادر کیا۔

"کیوں بلا لاؤں سبین کو یہاں۔۔۔ اس معصوم کا بھلا ان چکروں میں کیا کام۔۔۔؟" شوہر کے یوں ٹوکنے پر انیسہ ناگواری سے باز پرس کرنے لگیں۔

"بحث نہیں کرو انیسہ۔۔۔ سبین کو بلواؤ۔۔۔!!" انیسہ کی زبان درازی پر نجم النساء نے اُسے ناگواری سے گھورتے ہوئے بحث سے روکا۔ انیسہ کو نجم النساء کے لہجے میں چھپے غیر معمولی پن نے چونکا ڈالا۔ انہوں نے وہاں موجود سب ہی لوگوں کے چہرے کو باری باری دیکھا۔ ان سب کے چہرے پر نمودار ہوتے تاثرات کچھ ایسے غضبناک تھے کہ انیسہ کے دل کو کھٹکا سا محسوس ہوا۔ بہرحال حالات کی سنگینی محسوس کر کے انہوں نے ملازمہ سے سبین کو بلوا ڈالا۔

"جی خالہ۔۔۔ آپ نے بلوایا۔۔؟؟"

سبین نے وہاں ماحول میں چھائی، پراسراری سی خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے سوال کیا۔

"تمہاری خالہ نے نہیں، ہم نے بلوایا ہے تمہیں۔۔" جواب انیسہ کے بجائے نجم النساء نے دیا تھا۔ ان کے کرخت لہجے میں کچھ تو ایسا تھا جس نے سبین کے ساتھ ساتھ انیسہ کو بھی چونکا ڈالا تھا۔

"یہ بتاؤ کہ تم ملکوں کے لڑکے شاہ ویز کو کب سے جانتی ہو۔۔۔؟؟" آفاق الدین نے سبین کو گھورتے ہوئے سوال کیا۔

"یہ کس طرح کے سوال کر رہے ہیں آپ سبین سے۔۔۔؟ اس کا بھلا کیا تعلق اس لفنگے لڑکے سے۔۔۔ اگر یہ سوال پوچھنا ہے تو اپنی بھتیجی شمع سے پوچھیں۔" ان کے سوال پہ انیسہ بری طرح بدک اٹھیں۔

"شمع کا نام بھی مت لینا اس معاملے میں۔۔۔ اور میرے سوالات کے بیچ میں مت آؤ تم انیسہ۔۔۔" آفاق الدین، انیسہ کو جھڑکتے ہوئے بولے۔

"ہاں تم بتاؤ۔۔۔ کب سے جانتی ہو ملک شاہ ویز کو۔۔۔؟" بیوی کو ایک طرف کر کے وہ ایک بار پھر سبین کی جانب متوجہ ہوئے۔ اس

بار کیا گیا سوال مزید تلخ تھا۔

”مم۔۔۔۔میں۔۔۔نہیں جانتی ملک شاہ ویز کو۔۔۔!!“ سبین اس سوال پر بے اختیار گھبر اٹھی۔ گھبراہٹ کے عالم میں بامشکل ہکلاتے ہوئے اس نے جواب دیا۔

”جب جانتی نہ تھیں تو اس سے تعلق کیوں جوڑ رکھا تھا۔۔۔؟؟“ سبین کے جھوٹ پر نجم النساء نے غصیلے لہجے میں سوال کیا۔

”میرا کوئی تعلق نہیں تھا اس کے ساتھ۔۔ میں نہیں جانتی اسے۔۔“ سبین کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

”یہ آپ لوگ کس طرح کے سوالات کر رہے ہیں میری بھانجی سے۔ کیوں اسے زبردستی کٹہرے میں کھڑا کر کے مجرموں کی طرح تفتیش کر رہے ہیں۔“ انیسہ سے ضبط نہ ہو سکا۔ وہ بے چین سی کہہ اٹھی۔

”کیونکہ اس کی وجہ سے یہ سارا فساد کھڑا ہوا ہے۔ اس کے تعلقات تھے اس لوفر سے۔۔۔ اس کے چکر میں آ کر یہ لڑکی اپنا نقصان کرنے جا رہی تھی۔ وہ تو بروقت حذیفہ پہنچ گیا اور اِسے اُس شیطان سے بچا لیا۔ شاہ ویز نے اسی بات کا بدلہ حذیفہ پر حملہ اور شمع کو اغواء کر کے لیا ہے۔“ انیسہ کے احتجاج پر نجم النساء چیختے ہوئے لہجے میں سارا قصہ کہہ سنایا۔

انیسہ حق دق سی رہ گئی۔

”یہ کیا کہہ رہی ہیں اماں۔۔۔ سبین انہیں بتاؤ کہ یہ سب کچھ جھوٹ ہے۔ تم پر بے بنیاد الزام ہے۔“ انیسہ بے یقینی سے نجم النساء اور پھر سبین کو دیکھتے ہوئے کہنے لگیں۔

”اس سے کیا پوچھتی ہو۔ پوچھنا ہے تو اپنے بیٹے سے پوچھو۔ جو راز کی طرح یہ بات دل میں دبائے بیٹھا ہے۔“ نجم النساء نے حذیفہ کو گھورتے ہوئے دیکھا۔ حذیفہ بے ساختہ نظریں چرا گیا۔

”تمہاری دادی کیا کہہ رہی ہیں۔۔ جواب دو حذیفہ۔۔ بتاؤ حقیقت کیا ہے۔۔۔؟؟“ انیسہ نے کڑے تیوروں سے بیٹے کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”دادی صحیح کہہ رہی ہیں۔۔ سبین کے ملک شاہ ویز کے ساتھ تعلقات تھے۔ اور سبین کو بچانے کی وجہ سے ہی شاہ ویز نے مجھ پر حملہ کر کے دشمنی نکالی تھی۔“ حذیفہ نے ایک نظر سبین کے زرد پڑتے چہرے کو دیکھا اور پست لہجے میں جواب دیا۔

”سبین۔۔۔۔!!“ انیسہ بیٹے کی گواہی کو جھٹلا نہ سکیں۔ وہ بے یقین نظروں سے سامنے کھڑی بھانجی کو دیکھتی رہ گئیں۔

”تم سب جانتے تھے۔ مگر پھر بھی انجان بن کر میری بیٹی پر ظلم کے پہاڑ توڑتے رہے حذیفہ۔۔۔ اس کی عزت بچاتے بچاتے تم نے میری بیٹی کی عزت داؤ پر لگا ڈالی۔ یہ بھی نہیں سوچا کہ شمع تمہاری منگیتر ہے، تمہیں اس کے ساتھ اپنی زندگی گزارنی ہے۔“ شافع الدین حذیفہ کے اعتراف پر بری طرح پھٹ پڑے۔

حذیفہ لب بھینچے سر جھکائے بیٹھا رہا۔

”میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گا حذیفہ۔۔۔ تم نے میری شمع کے ساتھ بہت زیادتی کی۔ اس کا ساتھ دینے کے بجائے مگر اسی کے خلاف ہو گئے۔ جبکہ جو کچھ بھی ہوا اس کے ذمہ دار بھی تم تھے۔“ شافع الدین نے اسے نفرت سے موردِ الزام ٹھہراتے ہوئے کہا۔

”شافع الدین اب تو سچائی سب کے سامنے آ گئی ہے۔ حذیفہ نے ساری بات جان کر ہم سب سے چھپا کر واقعی بہت برا کیا۔ دیکھو

میں تم سے حذیفہ کی طرف سے معافی مانگتا ہوں۔ مگر اب اس معاملے کو ختم کرو۔ سارے شکوے' شکایتیں خاک میں ڈالو۔ ہم پھر سے آغاز کرتے ہیں۔ اب ساری باتوں کو بھلا کر بچوں کی شادی کی تیاری کرتے ہیں۔" آفاق الدین اپنے چھوٹے بھائی کو مناتے ہوئے انہیں پھر سے راضی کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ ان کی بات پر انیسہ ناگواری سے پہلو بدل کر رہ گئیں۔ ان کی خشمگین نگاہیں ہنوز سبین کے چہرے پر جمی ہوئی تھی۔

"اب نئی شروعات کیلئے کچھ نہیں بچا آفاق بھائی۔۔۔ حذیفہ نے ثابت کر ڈالا ہے کہ وہ میری بیٹی کے قابل نہیں۔ وہ اس کی حفاظت نہیں کر سکا' مشکل وقت میں اس کا ساتھ نہ دے سکا بلکہ دوسروں کے ساتھ مل کر میری بچی پر اپنے تُرش لفظوں سے سنگباری کرتا رہا۔ میری پھول سی بچی مرجھا کر رہ گئی' میری بیوی موت کے دہانے پر جا پہنچی صرف اس کی وجہ سے' اور اسے احساس تک نہیں۔۔۔ حقائق پر پردہ ڈالے بیٹھا رہا' سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ ثابت کرتا رہا۔ اور آپ کہتے ہیں کہ یہ سب میں بھول جاؤں۔۔۔ کیا اتنا آسان لگتا ہے آپ کو یہ سب بھلانا۔۔؟؟" شافع الدین بری طرح چیخ پڑے۔ حذیفہ نے انہیں بے حد تکلیف پہنچائی تھی اور اپنے رنج والم کا اظہار کیے بناء وہ رہ نہ سکے۔ ان کی نگاہیں سامنے صوفے پر بیٹھیں سفینہ پر جا ٹھہریں۔ پراشک' پرنم آنکھیں۔۔۔ ان کا دل تڑپا گئیں۔

"میں اپنی بیٹی کا ہاتھ ایسے شخص کو نہیں سونپ سکتا جو اس کے ساتھ مخلص نہ ہو۔ میں آج حذیفہ سے شمع کا رشتہ ختم کرتا ہوں۔" شافع الدین نے وہاں موجود تمام نفوس کو باری باری دیکھا اور اپنا فیصلہ سنا گئے۔

"شافع الدین۔۔۔۔۔۔!!" نجم النساء نے بے اختیار انہیں ٹوکا۔

"میں اپنا فیصلہ سنا چکا ہوں اماں۔۔ اور اس میں ردو بدل کی ایک فیصد بھی گنجائش نہیں۔۔!" وہ دوٹوک لہجے میں ماں کو جواب دے کر سفینہ کی جانب متوجہ ہوئے۔

"چلو سفینہ۔۔۔!!" سفینہ کا ہاتھ نرمی سے تھام کر وہ انہیں سہارا دے کر اٹھانے لگے۔

"آج اور اسی وقت اپنی بھانجی کو اس کے گھر بھیجو۔" ان دونوں میاں بیوی کے جانے کے بعد' آفاق الدین شدید غصے کے عالم میں انیسہ کی جانب متوجہ ہو کر گرجے۔ انیسہ غصے سے گھور کر رہ گئیں۔ سبین نے انہیں اس قابل نہ چھوڑا تھا کہ کسی سے بھی وہ کچھ کہہ پاتیں۔

"اور تم جاؤ۔۔ جا کر مٹھائیاں بانٹو۔۔۔ خوشی کے شادیانے بجاؤ کہ جو چاہتے تھے' وہ ہو گیا۔ بدقسمت انسان ہیرا جیسی لڑکی تم نے اپنے ہاتھوں سے گنوا ڈالی۔" آفاق الدین نے غصے کے عالم میں حذیفہ کو گھورتے ہوئے کوسا۔ اور لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے وہاں سے چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی حذیفہ بھی اپنی جگہ سے اٹھ کر تن فن کرتا وہاں سے چلا گیا۔

"یہ سب جھوٹ ہے۔۔۔ بکواس ہے۔ الزام ہے یہ میری بھانجی پر۔۔۔۔۔ یہ سب اس گھنی میسنی شمع کا کیا دھرا ہے۔ اسی نے کان بھرے ہیں ان سب کے۔" شوہر اور بیٹے کے جاتے ہی انیسہ غصے سے بڑبڑاتے ہوئے شمع کو کوسنے لگیں۔

"بس کرو انیسہ۔۔۔ آئندہ میری پوتی کا نام اپنی زبان پر اس کردفر اور نفرت سے مت لانا۔ یہ سب تمہاری اس بھانجی کا کیا دھرا ہے۔

جب سے آئی ہے تب سے ان ملکوں نے ہمارے گھر کا راستہ دیکھ لیا ہے۔'' نجم النساء نے تیز لہجے میں انیسہ کو گھر کتے ہوئے تلخی سے جواب دیا اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''ہونہہ۔۔۔بدذات لڑکی۔۔۔!!'' نگاہ سامنے کھڑی سبین پر جا ٹھہری تو بے ساختہ اسے کوس بیٹھیں۔ سبین اس تذلیل پر دہل کر رہ گئی۔

''تم کیوں منہ میں گھنگھیاں ڈالے کھڑی ہو۔ بتا کیوں نہیں رہیں تھیں کہ یہ ساری باتیں بکواس ہیں جھوٹ ہیں۔۔۔؟؟'' نجم النساء کے جاتے ہی انیسہ غصے سے پیچ و تاب کھاتی ہوئیں اس کے پاس چلی آئیں۔ ان کے سوال پر سبین نے ایک نظر ان کے غضبناک ہوتے چہرے کو دیکھا اور بے اختیار نظریں چرا گئی۔

''بتاؤ سبین سچائی کیا ہے؟ حقیقت کیا ہے۔۔۔؟ ان سب کو جھٹلاؤ' ثابت کرو کہ یہ سب جھوٹ ہے۔'' سبین کی جامد خاموشی پر انیسہ سخت جھنجھلائے ہوئے انداز میں بھڑکیں۔ مگر وہ بت بنی کھڑی رہی۔

''ارے چپ کیوں ہو۔۔۔ کچھ بتاتی کیوں نہیں ہو۔۔؟؟'' انیسہ کا ماتھا بری طرح ٹھنکا۔ انہونی کے احساس نے انہیں یکلخت اپنے حصار میں جکڑ لیا۔ اسی احساس کے زیر اثر وہ سبین کا بازو بری طرح جھنجھوڑ گئیں۔

''آپ حذیفہ سے پوچھ لیں۔۔۔ وہ حقیقت جانتا ہے۔'' سبین اس بری طرح جھنجھوڑے جانے پر بامشکل انتہائی پست لہجے میں جواب دیا۔ اس کے جواب پر انیسہ مضطرب سی کیفیت میں اسے گھور کر چلی گئیں۔

''یہ سب کیا ہوگیا۔۔۔ کیسے پتا چل گیا ان سب کو۔۔۔'' سبین انیسہ کو حذیفہ کے کمرے کی جانب بڑھتا دیکھ کر بے چینی سے لب کچلتے ہوئے بڑبڑائی۔

✦✦✦

''آج حقیقت سامنے آہی گئی۔۔۔ حذیفہ اپنی خالہ زاد کو بچانے کی خاطر ہماری بیٹی کو اس اندھے کنویں میں دھکیل گیا۔'' سفینہ بے یقین و دکھی لہجے میں بولیں۔

''یقین نہیں آرہا کہ حذیفہ یہ سب کچھ کرسکتا ہے۔ شمع اس کی چچازاد ہی نہیں منگیتر بھی تھی۔ مگر اس نے اس بات کی بھی پرواہ نہ کی۔ سب کچھ جانتے ہوئے بھی مجرمانہ خاموشی اپنائے رکھی۔ میری بچی اپنی عزت و بقاء کیلئے لڑتی رہی مگر وہ خاموش تماشائی بنا رہا۔'' شافع الدین کمرے میں اضطرابی کیفیت میں ٹہلتے ہوئے دکھ و غصے کی ملی جلی کیفیت میں گرفتار بولے۔

''میری بچی کا ساتھ نہ دیا اور اس کی ماں نے مجھ پر' میری بچی پر الزامات کی بوچھاڑ کر ڈالی۔ اس رات انیسہ بھابھی نے اتنے گھٹیا الزامات میری بچی پر لگائے تھے کہ ان باتوں کو سوچ کر میرا دل آج بھی کانپ جاتا ہے۔'' سفینہ وہ رات یاد کرتے ہوئے روہانسی لہجے میں بولیں۔ شافع الدین نے بے اختیار ان کے کمزور جسم کو تھرتھراتے ہوئے دیکھا تو بے قراری سے آگے بڑھے۔

''مت سوچو ان باتوں کو۔۔۔۔ اب حقیقت واضح ہو چکی ہے۔ کوئی بھی اب میری بیٹی پر الزام نہیں لگا سکتا۔'' شافع الدین ان کا ہاتھ نرمی سے تھام کر تسلی دیتے ہوئے بولے۔

''آپ صحیح کہہ رہے ہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ سچائی سامنے آگئی ہے۔ میری بیٹی کے دامن پر لگے داغ اب دھل جائیں گے۔'' سفینہ ان کی بات سے متفق ہوتے ہوئے آنسو صاف کرتی اثبات میں سر ہلاتے بولیں۔

"میں نے اب یہ قصہ ہی ختم کرڈالا ہے۔ حذیفہ نے آج سب کے سامنے ثابت کرڈالا کہ وہ میری بیٹی کے قابل نہیں۔ وہ اس کی حفاظت کرنے کا اہل نہیں' وہ اس کا بہترین محافظ نہیں بن سکتا۔" شافع الدین پرسوچ فیصلہ کن لہجے میں بولے۔

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔۔۔ جو شوہر اپنی بیوی کی عزت' وقار اس کی حرمت کی حفاظت کرنے کی قابلیت نہیں رکھتا وہ اپنی بیوی کے دامن میں بھی رسوائی بھرتا ہے اور خود کو بھی رسوا کرڈالتا ہے۔" شافع الدین کی بات کے جواب میں سفینہ کسی گہری سوچ میں کھوئیں بے اختیار کہہ گئیں۔ ان کی بات مکمل ہونے پر شافع الدین شرمندگی سے انہیں دیکھنے لگے۔

"میں بھی تو تمہارے لئے ایسا ہی شوہر ثابت ہوا سفینہ۔۔۔ نہ تمہاری حفاظت کرسکا نہ تمہاری قدر کرسکا۔ اپنی نادانیوں میں اپنے ساتھ ساتھ تمہاری اور شمع کی زندگی بھی جہنم بنا ڈلا۔" وہ شدید ندامت کے زیراثر بولے۔

"جو ہوچکا اسے بھول جائیں۔۔۔ آنے والے وقت کا سوچیں۔ حذیفہ سے رشتہ تو ختم کر ڈالا مگر اب ہماری شمع کا ہاتھ کون تھامے گا۔ کہاں ڈھونڈیں گے ہم ایسا رشتہ ہے جو ہماری بیٹی کی بدنامیوں کو نظرانداز کرکے اسے پرخلوص دل کے ساتھ اپنائے۔" سفینہ آگے کی سوچتے ہوئے پرتشویش لہجے میں بولیں۔

"کوئی نہ کوئی راستہ اللہ ضرور نکالے گا سفینہ۔۔۔ ایک در بند ہوتا ہے تو وہ اپنے بندے پر کئی در کھول دیتا ہے۔" شافع الدین کچھ سوچتے ہوئے پرامید لہجے میں بولے۔

"اللہ کرے ایسا ہی ہو۔ میری بیٹی کے نصیب میں اب آسانی ہو۔" سفینہ دعائیہ انداز میں ہاتھ اٹھاتے ہوئے ممتا بھرے لہجے میں بولیں۔

"آمین۔۔۔!" شافع الدین نے جذب کے عالم میں کہا۔

✦✦✦

"اوہ میرے خدا۔۔۔ اتنا سب کچھ میرے ناک کے نیچے چلتا رہا اور مجھے کچھ خبر نہ ہوئی۔" انیسہ' حذیفہ کے کمرے میں' اس کے روبرو بیٹھی، سرپیٹنے کے انداز میں بولیں۔ وہ کچھ دیر پہلے ہی اس کے کمرے میں آموجود ہوئیں تھیں۔ اور جو کچھ ہوا اس کی حقیقت جاننے پر زور دینے لگیں۔ جب بلی تھیلے سے باہر آہی چکی تھی تو حذیفہ نے بھی مزید اس معاملے کو چھپانا مناسب نہ سمجھا اور تمام حقائق انیسہ کے آگے گوش گزار کرڈالے۔ انیسہ' سبین اور ملک شاہ ویز کے درمیان تعلقات کی نوعیت جان کر دنگ رہ گئیں تھیں۔

"تو آپ کیا چاہتی تھیں۔ پوری حویلی میں آپ کی بھانجی کے کرتوتوں کا ڈھنڈورا پیٹتا۔۔۔؟؟ جانتی ہیں پھر کیا ہوتا۔۔۔؟؟" حذیفہ ان کے مسلسل واویلے اور سوالات کی بوچھاڑ سے جھنجلاتا ہوا چیخ پڑا۔ اس کے یوں چیخنے پر انیسہ ایکدم سے چپ کرگئیں۔

"جانتی ہیں پھر کیا ہوتا۔۔۔ حویلی میں صرف سبین ہی تذلیل کی حقدار نہیں ٹھہرتی' بلکہ آپ کے دامن میں بھی رسوائی بھردی جاتی۔ سبین کو میں نے بہت سمجھایا تھا کہ ملک شاہ ویز سے دور رہے مگر اس نے میری ایک نہ سنی۔۔۔ کرتی گئی اپنی مرضی۔۔۔ آخر پھنس گئی ناں اس کی چنگل میں۔ اسے بچانے کی خاطر میری دشمنی ملک شاہ ویز سے ہوئی اور اسی بات کا انتقام اس نے مجھ پر اور میری عزت

پر حملہ کر کے لیا۔ یہ سب کچھ اس سبین کی وجہ سے ہوا ہے۔" حذیفہ اپنے دل میں دبی بھڑاس نکال کر بولتا چلا گیا۔ انیسہ کو سبین پر بے حد غصہ آیا۔ وہ ان کے ناک کے نیچے انہیں دھوکہ دیتی رہی، سچ چھپا کر انہیں اندھیرے میں رکھا۔ اور نوبت یہاں تک آ چکی کہ حویلی میں سبین کی وجہ سے ان کی اپنی عزت خطرے میں پڑتی محسوس ہونے لگی۔

"سب کچھ اس سبین کا کیا دھرا ہے۔ اس کی وجہ سے میری زندگی عذاب بن کر رہ گئی ہے۔" حذیفہ کا غصہ کسی صورت کم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ وہ بدستور سبین کو کوستے ہوئے بڑبڑائے جا رہا تھا۔

"اگر تم سارے حقائق سے واقف تھے اور جانتے تھے کہ شمع بے قصور ہے پھر اس سے اتنے بدظن کیوں ہوئے تھے۔۔۔؟؟" انیسہ ذہن میں کلبلاتا ہوا سوال پوچھے بنا نہ رہ سکیں۔

"کیونکہ سبین کا حال میں دیکھ چکا تھا۔ اچھی طرح جانتا تھا کہ ملک شاہ ویز انسان کے نام پر شیطان کا روپ ہے۔ اور شمع کو وہ میرے انتقام کی آگ میں جھلس کر اٹھا لے گیا تھا۔ یہ سوچ مجھے اذیت میں مبتلا کر رہی تھی کہ شمع اس کے قبضے میں تھی اور میں چاہ کر بھی اسے بچا نہیں سکتا۔ وہ واپس لوٹ آئی۔ اور دعویٰ کرنے لگی کہ وہ اس شیطان کے ظلم سے محفوظ رہی تو میں یقین نہیں کر سکا۔ اس لئے نہیں کہ میں شمع کو جھوٹا یا قصوروار سمجھ رہا تھا۔ اس لئے کہ میں ملک شاہ ویز کی خصلت سے بہت اچھی طرح واقف تھا اور اس کی اصلیت بہت قریب سے دیکھ چکا تھا۔" حذیفہ بنا رکے، جھجکے اپنی بات کہتا چلا گیا۔

اور انیسہ کا دل چاہا کہ اپنا سر پیٹ ڈالیں۔ اتنا یقین اور اعتماد کیا انہوں نے سبین پر اور وہ کیا نکلی۔۔۔ مگر غصہ انہیں حذیفہ پر بھی تھا۔ جب اتنے عرصے تک اس نے یہ بات چھپائے رکھی تو اب کیا ضرورت تھی یوں سرعام بیچ چوراہے پر ہنڈیا پھوڑنے کی۔

"ٹھیک ہے سمجھ گئی میں کہ سبین قصوروار ہے مگر تمہیں بھی کس نے کہا تھا کہ سر محفل یہ قصہ سب کے سامنے گوش وگزار کر کے اپنی ماں کے سر پر خاک ڈلواؤ۔"

"یہ آپ سے کس نے کہا کہ یہ ساری روداد گھر والوں کو میں نے سنائی ہے۔۔۔؟ اتنا پاگل سمجھ رہی ہیں آپ مجھے۔۔۔؟؟" حذیفہ کے لہجے سے ناگواری جھلک رہی تھی۔

"اگر تم نے نہیں بتائی تو اور کون ہے جو اس سب سے آگاہ تھا۔۔۔؟؟" انیسہ پریشان ہوئیں۔

"عالیان۔۔۔ عالیان جانتا تھا سب کچھ۔۔۔ اسی نے سب کو بتایا ہے۔" حذیفہ کے چہرے پر عالیان کیلئے ایکدم سے نفرت آن ٹھہری۔

"عالیان۔۔۔ اسے کیسے پتا چلا یہ سب۔۔۔؟" انیسہ شاکڈ سی رہ گئیں۔

"نہیں جانتا۔۔۔ مگر اسے ہر بات کی خبر تھی اور اس نے بڑے موقع سے یہ بات صرف ہمارے ہی نہیں ملکوں کے علم میں بھی لائی ہے۔" حذیفہ ناگواری سے جتاتے ہوئے بولا۔

"بیڑہ غرق ہو اس عالیان کا۔۔۔ اس کے ارادے ٹھیک نہیں لگ رہے مجھے۔ جب سے آیا ہے کوئی نہ کوئی گل کھلائے جا رہا ہے۔ اس کا کچھ نہ کچھ تو کرنا پڑے گا۔" انیسہ عالیان کو کوستے ہوئے ایکدم سے سوچ میں پڑ گئیں۔

حذیفہ نے انہیں ایک نظر دیکھا اور سر جھٹک کر باہر نکل گیا۔

✦✦✦

"عالیان بیٹا۔۔۔!!" سلطان' کمرے میں داخل ہوئے تو عالیان کو موبائل میں مصروف پا کر دھیرے سے مخاطب کرتے ہوئے بولے۔

"جی بابا۔۔۔!!" میسج ٹائپ کرتے' کرتے وہ بے ساختہ چونکا۔

"بیٹا مصروف تھے۔۔۔؟؟" وہ سوالیہ نظروں سے موبائل کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھے۔

"جی بابا۔۔۔ نویرا سے بات کر رہا تھا۔ کافی دن ہو گئے تھے اس سے بات نہیں ہوئی تھی۔' وہ ہلکے سے مسکراتے ہوئے بولا۔

"اچھا' اچھا۔۔۔!" سلطان سر ہلاتے ہوئے بولے۔

"آپ کو کوئی بات کرنی تھی بابا۔۔۔؟؟" عالیان نے ان کے جزبز ہوتے چہرے کو بغور دیکھا۔

"ہاں بات تو کرنی تھی۔۔۔ مگر تم۔۔۔" وہ رک رک کر' موبائل کو دیکھتے ہوئے بولے۔

"میں نویرا سے بعد میں بات کرلوں گا۔ آپ کہیں کیا بات ہے۔۔۔؟" وہ ان کی بات سمجھتے ہوئے موبائل ایک طرف رکھتے ہوئے بولا۔

"بیٹا تم نے جو کچھ بھی سبین اور ملک شاہ ویز کے بارے میں کہا وہ سب کیسے جانتے تھے۔۔۔؟؟" سلطان الدین نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے دریافت کیا۔

"بابا میں نے اتفاقاً سبین اور حذیفہ کی باتیں سن لیں تھیں۔ تب ہی اس حقیقت کا علم ہوا تھا۔" اس نے آہستگی سے جواب دیا۔

"لیکن بیٹا تمہیں اس طرح سب کے سامنے یہ بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔ تم مجھے یا آفاق بھائی کو اکیلے میں بھی بتا سکتے تھے۔" سلطان الدین نے عالیان کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"بابا۔۔۔ مجھے ایک دن پہلے ہی یہ باتیں معلوم ہوئیں تھیں۔ اور میرا ارادہ بھی نہیں تھا یوں سب کے سامنے حقائق سامنے لانے کا مگر اس دن جو کچھ بھی ہوا اور جس طرح سے ان سب لوگوں نے شمع کو پھر سے نشانہ بنانا شروع کر ڈالا تو مجھ سے برداشت نہیں ہوا اور جو کچھ میرے علم تھا وہ میں نے سب کو بتا ڈالا۔" عالیان نے وضاحت دیتے ہوئے جواب دیا۔

"ہونہہ۔۔۔ مگر پھر بھی بیٹا۔ تمہیں خیال رکھنا چاہیے۔ یہ حقائق بڑے تلخ تھے۔ معاملہ صرف شمع اور حذیفہ کا نہیں تھا' بلکہ انیسہ بھابھی اور ان کی بھانجی کا بھی تھا۔ تم نے جو کچھ بھی بتایا اس سے انیسہ بھابھی کو ضرور برا لگے گا۔" سلطان الدین نے پرتشویش لہجے میں بیٹے کو سمجھانا چاہا۔

"میں سمجھ رہا ہوں بابا۔ اسی لئے کہہ رہا ہوں کہ ہم اب چلتے ہیں یہاں سے۔ اس حویلی میں ہونے والے معاملات اور زیادتیاں مجھ سے برداشت نہیں ہوتیں۔ سچ کہوں بابا ہم شاید اس حویلی کے ماحول میں رچ بس نہیں سکتے۔ اور مجھے لگتا ہے کہ میرے یہاں رہنے سے معاملات مزید خراب ہوں گے۔ بابا اب ہمیں واپس چلنا چاہیے۔" عالیان نے باپ کی پریشانی سمجھتے ہوئے کہا۔

"تم صحیح کہہ رہے ہو بیٹا۔۔۔ اس سے پہلے کے معاملات مزید خراب ہوں ہمیں یہاں سے چلے جانا چاہیے۔ اماں نے تو میرے لئے اپنا دل اتنا سخت کر ڈالا ہے کہ شاید اب پگھلنے کی کوئی امید باقی نہیں۔ بس دل میں ایک کسک سی رہ جائے گی کہ ماں نے معاف نہیں کیا۔" سلطان الدین بجھے دل سے بولے۔

"آپ نے مما سے شادی کر کے کوئی گناہ کیا تھا بابا جس کی معافی مانگے بناء اب کوئی چارہ نہیں ۔۔۔۔" عالیان کو باپ کے لہجے میں چھائی یاسیت نا امیدی نہیں بھائی تھی۔ تب ہی ناپسندیدگی جتاتے ہوئے کہہ گیا۔

"ایسی بات نہیں بیٹا۔۔۔۔ لیکن اماں کی ناراضگی مجھے اب کافی بے چین رکھنے لگی ہے ۔خیر چھوڑو ان باتوں کو۔۔۔۔ میں آفاق بھائی سے بات کرتا ہوں۔ پھر واپسی کی تیاری کرتے ہیں۔" وہ اتنا کہہ کر کمرے سے باہر چلے گئے۔ عالیان ان کی بات سے مطمئن ہو کر نویرا کو اپنی جلد واپسی کی نوید سنانے لگا۔

✧✧✧

"کیا تم واقعی شمع سے شادی اس لئے کرنا چاہتے ہو کیونکہ تمہیں اپنی غلطی پر پچھتاوہ ہے۔۔۔؟" گھر لوٹتے ہی ملک جمیل نے ملک شاہ ویز کو اپنے کمرے میں بلا کر باز پرس شروع کر ڈالا۔

"ابا جی۔۔۔ ملال ہے مجھے اپنی حرکت پر تب ہی تو حویلی رشتہ بھیجا ہے۔" ملک شاہ ویز باپ کی کڑی نگاہوں سے الجھتے ہوئے بولا۔

"ہونہہ۔۔۔۔ تو شمع سے شادی اس لئے کرنا چاہتے ہو کیونکہ تمہیں اپنے کئے پر ملال ہے۔" ملک جمیل نے بیٹے کا چہرہ بغور دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔

"جی ابا جی۔۔۔۔۔!" ملک شاہ ویز نے ہلکے سے سر ہلایا۔

"اور سبین سے کیا تعلق ہے تمہارا۔۔۔؟" اگلا سوال انہوں نے سپاٹ لہجے میں کیا۔

"کون سبین ابا جی۔۔۔۔؟" ملک شاہ ویز بے اختیار بوکھلا اٹھا۔ نگاہ باپ کے پہلو میں بیٹھے ملک فیاض پر جا ٹھہری۔ مگر ان کے چہرے پر بھی گہری سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔

"کچھ تو گڑ بڑ ہے۔۔۔!!" وہ دل ہی دل میں بڑبڑایا۔

"وہی سبین جس کے عشق میں دیوانگی کی داستانیں تم پورے فیض پور میں رقم کرتے پھر رہے تھے۔" ملک جمیل نے بیٹے کی سماعتوں میں دھماکہ کرتے ہوئے کہا۔ ملک شاہ ویز بری طرح سٹپٹا کر ملک فیاض کو دیکھنے لگا۔

"وہی سبین جس کی جدائی کی آگ میں جھلستے ہوئے تم نے حذیفہ پر حملہ کیا۔ اورر انتقامی طور پر اس کی منگیتر کو فارم ہاؤس اٹھا لے گئے۔" ملک شاہ ویز کے چہرے پر چھائی بد حواسی ملک جمیل کو مزید طیش دلا گئی۔

"اب بتاؤ۔۔۔ یاد آئی سبین یا مزید کچھ یاد دلاؤں۔۔۔۔؟؟" ملک جمیل سیخ پا ہوتے ہوئے بولے۔

"ابا جی۔۔۔ وہ تو بس۔۔۔۔!!" باپ کو غضبناک دیکھ کر ملک شاہ ویز گھگیاتے ہوئے کہنے لگا مگر اگلے ہی پل ملک جمیل کا زناٹے دار تھپڑ اس کے چودہ طبق روشن کر گیا۔

"زمانے کو بیوقوف بناتے بناتے اب باپ کے ساتھ بھی ہاتھ کرنے چلے تھے تم۔" تھپڑ رسید کر کے وہ غصے سے گرجے۔ ملک شاہ ویز اس غیر متوقع ردعمل پر بھونچکا رہ گیا۔

"ایک لڑکی کی زندگی برباد کر کے دوسری کی زندگی تباہ کرنے چلے تھے تم۔۔۔!!" ملک جمیل مزید اشتعال میں آ گئے۔

"دادا جی۔۔۔۔ ابا جی کو سمجھائیں۔۔۔ بتائیں کہ یہ سب کچھ جھوٹ ہے۔" ملک شاہ ویز نے باپ کے بے تحاشہ بھڑکنے پر مدد طلب نگاہوں سے ملک فیاض کی جانب دیکھا۔

"او پتر تیرا باپ سچ جان چکا ہے۔ اب

جھٹلانے کا کوئی فائدہ نہیں۔" ملک فیاض نے بھی نظریں پھیر کر لٹھ مار انداز میں جواب دیا۔ ملک شاہ ویز ہکا بکا سا پہلے انہیں اور پھر اپنے باپ کو دیکھنے لگا۔

"تم اپنے ساتھ ساتھ اپنے خاندان کے نام کو بھی داغدار بنا چکے ہو۔ جتنی آوارگی، بے راہ روی تم نے اختیار کرنی تھی کر چکے۔۔۔۔۔ لیکن اب وہ ہوگا جو میں فیصلہ کروں گا۔" ملک جمیل نے سخت نظروں سے بیٹے کو گھورتے ہوئے کہا۔

"تمہاری شادی اب سبین سے ہی ہوگی شاہ ویز۔۔۔ میں کل ہی حویلی جا کر اس رشتے کی بات کروں گا۔" وہ مستحکم لہجے میں اپنا فیصلہ سنا گئے۔

"لیکن ابا جی میں سبین سے نہیں، شمع سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔۔۔۔" ملک شاہ ویز بے اختیار انکاری لہجے میں بولا۔

"اس معصوم لڑکی کا نام اب دوبارہ اپنی زبان پر مت لانا شاہ ویز۔۔۔۔ تمہاری نادانیوں، من مانیوں اور بے لگام حرکتوں کے باعث وہ بچی پہلے ہی بہت دکھ سہہ چکی ہے اب مزید اس کی پریشانیوں میں اضافہ نہ کرو تو تمہارے حق میں بہتر ہے۔" ملک جمیل اسے انگلی اٹھا کر سخت لہجے میں تنبیہ کر گئے۔

"ابا جی یہ تو زیادتی ہے۔۔۔ میری شادی میری مرضی کے خلاف نہیں ہو سکتی۔" ملک شاہ ویز منہ بنا کر احتجاجاً بول پڑا۔

"فیصلہ ہو چکا ہے شاہ ویز۔۔۔ تمہاری شادی وہیں ہوگی جہاں میں رشتہ طے کروں گا۔ اور اگر تمہیں یہ فیصلہ منظور نہیں تو پھر میں تمہیں اپنی وراثت سے عاق کر ڈالوں گا۔" ملک جمیل نے دھمکاتے ہوئے ملک شاہ ویز کے ہوش اڑا ڈالے۔ وہ حق دق سا باپ کو دیکھے گیا۔

"سوچ لے پتر اچھی طرح۔۔۔ یا تو خود کو سدھار لے یا پھر گھر سے سدھار جا۔۔۔!!" ملک فیاض نے پوتے کو بغور دیکھتے ہوئے جتایا۔ ملک شاہ ویز لب بھینچے باپ اور دادا کو دیکھ کر رہ گیا۔

✦✦✦

"میں کل صبح واپسی کیلئے نکل رہا ہوں آفاق بھائی۔۔۔" رات کھانے کی میز پر سلطان الدین نے آفاق الدین اور شافع الدین کو اپنی واپسی کے فیصلے سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔ ان کے پہلو میں بیٹھے عالیان نے متوجہ ہو کر ان سب کے چہرے کی جانب دیکھا۔

"اماں کو منائے بغیر ہی جا رہے ہو سلطان۔۔۔؟؟" آفاق الدین نے بے ساختہ سوال اٹھایا۔ ڈائننگ ایریا کی طرف بڑھتے نجم النساء کے قدم یہ سنتے ہی رک پڑے۔

"اماں کے دل میں اب میرے لئے کوئی گنجائش نہیں۔۔۔ شاید وہ مجھے کبھی بھی معاف نہ کریں۔" سلطان الدین رنجیدگی سے بولے۔ نجم النساء کے چہرے پر سنجیدگی سمٹ آئی۔

"مایوس کیوں ہو رہے ہو سلطان۔۔۔ ماں کا دل ہے کبھی بھی پسیج سکتا ہے۔" آفاق الدین نے انہیں حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

"ہماری ماں کا دل پتھر کا ہے۔ ہمارے دکھوں پر نہیں پسیجتا۔۔۔!" شافع الدین، پہلی بار گویا ہوئے مگر ان کے لہجے میں ماں کیلئے بلا کی بدگمانی تھی۔ نجم النساء ان کی بات سن کر متذبذب ہو اٹھیں۔ ان کا سخت گیر تاثر ان کے بیٹوں کی ان سے بدگمانیوں کا باعث بنتا جا رہا تھا۔ اور حال ہی میں حقائق سامنے آنے پر ان کا دل انیسہ اور اس کی بھانجی سبین سے بھی متنفر ہو چکا تھا۔ ان دونوں کے چکر میں وہ اپنی دل عزیز

پوتی سے بھی کچھ حد تک بدگمان ہو چکی تھیں۔ اور یہی وجہ تھی کہ شافع الدین ان سے اس حد تک بدگمان ہو چکا تھا کہ ان سے اب کوئی خیر کی امید رکھتا تھا نہ ہی ان کی کسی بات پر یقین کرتا تھا۔

''بات یہ ہے کہ ہمارا مزید یہاں قیام مناسب نہیں۔۔۔ یہاں کا ماحول شاید ہمارے لئے سازگار بھی نہیں۔ اور کل جو کچھ بھی ہوا اس کے بعد میں نہیں چاہتا کہ آپ لوگوں کے معاملات ہماری وجہ سے مزید الجھیں۔۔۔!'' سلطان الدین نے اپنی بات کی مزید وضاحت دیتے ہوئے کہا۔

''لیکن کل جو کچھ بھی ہوا ہے' اس نے تو ہمارے الجھے ہوئے معاملات کو سلجھا ڈالا ہے۔ تمہارے بیٹے نے ہر چیز شیشے کی طرح صاف شفاف کر ڈالا ہے۔ جو غلطیاں ہم سے سرزد ہونے جارہی تھیں' ہم ان سے رُک گئے۔۔۔'' نجم النساء ڈائننگ ایریا میں داخل ہوتے ہوئے بولیں۔ وہ ساری بات سن چکی تھیں۔ اور اپنے ہاتھ سے نکلے معاملات کو ایک بار پھر اپنے کنٹرول میں کرنے کی غرض سے وہ دونوں بیٹوں کے سامنے سلطان سے مخاطب ہو گئیں۔

''اماں آپ۔۔۔!!'' ماں کو اچانک سامنے موجود پا کر سلطان ٹھٹھک اٹھے۔

''میں پتھر دل نہیں ہوں سلطان۔۔۔ لیکن تم نے میرا دل دکھایا تھا۔ میں یہ بات کبھی بھلا نہیں سکتی کہ تم نے اپنی چاہت کے خاطر اپنی ماں سے منہ موڑ لیا۔ یہ بات مجھے ہر وقت تڑپاتی رہتی تھی۔ میں کبھی بھول نہیں سکی تمہارا چھوڑ کر جانا۔'' نجم النساء' سلطان کے سامنے بیٹھتے ہوئے گلوگیر لہجے میں کہتی چلی گئیں۔ سلطان کا سر ماں کے شکوے کو سن کر بے اختیار جھکتا چلا گیا۔ مگر عالیان نے بے ساختہ سر اٹھا کر نجم النساء کو دیکھا تھا۔

''لیکن تم جب سے لوٹ کر آئے ہو۔ تب سے میرا دل اپنی اذیتوں کو بھلا کر اپنی ممتا سے مجبور ہو کر تمہاری جانب ہمکنے لگا ہے۔ مگر میں جبر کرتی رہی۔ مگر کل تمہارے بیٹے نے جس طرح حویلی کے ماتھے پر لگے داغ کو دھویا ہے' میرا دل تم سے مزید ناراض نہ رہ سکا سلطان۔ تمہاری ماں اب مزید تم سے دوری برداشت نہیں کر سکتی سلطان۔'' نجم النساء نے روہانسی ہوتے ہوئے سلطان کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

''اماں میں شرمندہ ہوں کہ میری وجہ سے آپ کو اتنی اذیتوں سے زرنا پ ا۔ میں اپنے کئے کی آپ سے معافی مانگنا چاہتا ہوں۔'' سلان' نجم النساء کے ہاتھوں کو چومتے ہوئے ندامت سے بولے۔ عالیان نے باپ کا آنسوؤں سے تر چہرہ دیکھا۔ اس کے چہرے پر ہری سوچ کی پرچھائیاں تھیں۔ باپ کا نادم اور آنسوؤں سے بھیگا چہرہ اسے اپنی ماں سے محبت پر پچھتاوہ محسوس ہو رہا تھا۔

''میں تمہیں معاف کرتی ہوں سلن۔۔۔ مگر ایک خواہش ہے میری سلان۔۔۔ اگر تم پورا کر سکو تو اس حویلی کے دروازے صرتم پر ہی نہیں تمہاری بیوی اور بی ے پر بھی کھلے ہوں گے۔'' نجم النساء کی بات پر عالیان کے ساتھ ساتھ آفاق اور شافع الدین بھی چونک کر انہیں دیکھنے لگے۔

''آپ کی کیا خواہش ہے اماں۔۔۔؟؟'' سلطان الدین نے جذب کے عالم میں ماں سے استفسار کیا۔

''میری خواہش ہے کہ تمہارے بیٹے عالیان اور شافع کی بیٹی شمع کا رشتہ جڑ جائے' ان کی آپس میں شادی ہو جائے۔'' نجم النساء نے

ب ی لگاؤ کے ساتھ سلطان الدین اور عالیان کی سماعتوں پر م پھوا۔ عالیان ہکابکا سا نجم النساء اور پھر اپنے باپ کو دیکھنے لگا۔ البتہ شاع الدین کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا تھا۔ شاع الدین کے چہرے کی خوشی اور عالیان کی بے چین کیف ت نجم النساء کی جہاندیدہ نگاہیں بہت اچھی طرح دیکھ چکی تھیں۔ تیر نشانے پر لگا تھا۔

"بیٹا میں چاہتی ہوں کہ تم بھائیوں کے رشتے مزید مضبوط ہو جائیں۔ اور سچ کہوں تو عالیان جیسا سمجھدار، ذمہ دار اور باہمت بچہ ہی ہمارے خاندان کی شان کہلانے کے قابل ہے۔ میری شمع جیسی معصوم، باحیاء اور شریف لڑکی کیلئے تمہارے بیٹے سے اچھا لڑکا مل نہیں سکتا۔ اگر یہ رشتہ ہو جائے تو سلان تمہاری ساری غلطیاں معاف۔۔۔ میں تمہاری بیوی کا اس حویلی میں والہانہ استقبال کروں گی۔ اسے خود آگے ب ھ کر سینے سے لگاؤں گی۔۔۔ بس اتنی سی خواہش ہے میری۔۔۔" نجم النساء آنکھوں میں آنسو بھرے اپنی خواہش بیان کرتے ہوئے سلطان اور عالیان کو ایک ک ی آزمائش میں مبتلا کر گئیں۔ عالیان کے چہرے پر اضطراب پھیلتا چلا گیا۔ اس نے ن راٹھا کر سامنے براجمان شاع الدین کو دیکھا۔ ان کے چہرے سے جھلکتی مسرت اسے اندر ہی اندر پریشان کر گئی۔

"اگ ایسا ہو جائے تو کیا ہی بات ہے۔ سلطان میرے دل کی بھی یہی خواہش ہے کہ تمہارے بیٹے عالیان اور میری شمع کا رشتہ ہو جائے۔" بالا آخر شاع الدین بھی اپنے دل کی بات کہہ ہی اٹھے۔ آق الدین اس ساری صورتحال پر الجھن کا شکار ن رآنے لگے۔ یہاں جو کچھ بھی بات ہو رہی تھی ان کے گمان سے بالا تھی۔ وہ نجم النساء کو بہ اچھی طرح جانتے تھے۔ اتنی جلدی وہ جھکنے والوں میں سے نہ تھی۔ جس عورت کی شکل وہ زندگی ھر دیکھنے کو روادار نہ تھیں، اچانک اسے قبول کرنے اور سینے سے لگانے کیلئے بھی تیار ہو بیٹھیں۔ یہ باان کا ذہن ماننے کو یار نہ تھا۔

"تم خاموش کیوں ہو گئے ہو سلطان۔۔۔ کیا تمہاری ماں اور ھائی نے ایک بار پھر تم سے کچھ زیادہ مانگ لیا ہے۔۔۔ ؟؟؟" سلان الدین کی مسلسل خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے نجم النساء جذباتی انداز میں انہیں بلیک میل کرتے ہوئے بولیں۔

"نہیں اماں ایسی بات نہیں ہے۔۔۔ آپ نے جو کچھ بھی کہا اس پر سوچنے کیلئے مجھے کچھ وقت چاہئے۔۔۔" سلطان الدین ساتھ بیٹھے عالیان سے ن ریں چُراتے ہوئے دھیمے سے ولے۔ ان کے جوا پر عالیان شاکڈ کی سی کی یت میں انہیں دیکھنے لگا۔

"سلان یصلہ کرنے کا اختیا ربلا شبہ تمہیں حاصل ہے بس ایک بات کا خیال رکھنا۔۔۔ تمہارا یہ مجبور بھائی ب ی آس لگائے تمہاری جانب دیکھ رہا ہے۔" شاع الدین آس بھری ن روں سے انہیں دیکھتے ہوئے بولے۔

"بس سلطان اس حویلی کی خوشیاں اب تمہارے یصلے کی محتاج ہیں۔" نجم النساء نے ممتا بھری ن روں سے مسکاتے دیکھا۔ اور وہاں سے اٹھ کر چلی گئیں۔ عالیان کو اس پل نجم النساء کی مسکراہ میں مکاری کا شائبہ محسوس ہوا۔

باقی اگلے ماہ

قربت ہجر میں محبت

ندا حسنین

تمہاری بیوی کہاں ہے؟

میرا نے خاور کے سامنے روٹی کا چنگیر رکھتے ہوئے پوچھا

اللہ جانے میں جب گھر سے نکلا تھا اندر کمرے میں سو رہی تھی

خاور کی بات سنتے ہی میرا کو جیسے پتنگے لگ گئے۔

ایسا لگتا ہے جیسے اس کی ماں نے ہمیں لوری دے کر سلانے کے لئے اپنی بیٹی دی ہے بہت برداشت کرلیا میں نے ابھی صغرہ کو فون کر کے اس سے دو دو ہاتھ کرتی ہوں جس نے ہمیں یہاں پھنسا دیا۔

ناک منہ چڑھاتی میرا نے خاور کے کمرہ کی سمت منہ کر کے آواز لگائی۔

"باسمہ او باسمہ منحوس کہاں مرگئی ہو۔"

میرا کی کڑک دار آواز سن کر کمرہ میں موجود باسمہ لرز گئی اس نے چاہا جلدی سے اٹھ کر کھڑی ہو جائے مگر اسی وقت اجنبے کہاں سے وہ اس کے

ناولٹ

سامنے آن کھڑا ہوا۔

"ڈرو مت بیٹھ جاؤ۔"

باسمہ کو پیار سے تھامے وہ اس کے قریب ہوا۔ اسے باہر سے میرا کی چلاتی آواز سنائی دے رہی تھی مگر وہ چاہ کر بھی جواب نہ دے سکی اپنے دیوتا کے سامنے اس کی زبان گونگی ہو گئی تھی۔ وہ مدہوش ہو کر اس کی بانہوں میں جھول گئی۔ اسی دم میرا نے اس کے کمرہ کا دروازہ کھولا سامنے بیڈ پر باسمہ آڑھی ترچھی پڑی تھی۔



"لو جی یہ تو ابھی تک منہ کھولے سو رہی ہے عجیب تماشا لڑکی ہے سارا وقت یہاں وہاں جھولتی رہتی ہے۔"

"اماں تمہیں ہی شوق تھا مجھے باہر بھیجنے کا اب بھگتو میں نے پہلے ہی کہا تھا خالہ صغرا سے

چوتھی قسط



سماوا کا رشتہ مانگ لو مگر تم پر لالچ کا بھوت سوار تھا۔"

میرا کے پیچھے خاور کمرہ میں داخل ہوا۔

کون سا برا کیا کچھ نہ سہی جہیز کے نام پر رقم نہ ملی ہے نہ۔ اب اسی رقم سے تمہاری دوسری شادی کروں گی دھوم دھام سے سماوا کے ساتھ یہ اتنا آسان نہیں ہے اماں جتنا تم نے سمجھا ہوا ہے پہلے اس پاگل سے میری جان چھڑاؤ گی تو آگے کام کروگی۔

"میں نے مسفرہ سے کہہ دیا ہے اگر خاور ایک ماہ تک ہانگ کانگ جاتا ہے تو ٹھیک ہے ورنہ اپنی پاگل لڑکی واپس لے جاؤ۔"

باسمہ کو مدہوش پڑا دیکھ کر برے برے منہ بناتی میرا کمرہ سے باہر نکل گئی۔

✧✧✧

عبدالکریم کو دل کا دورہ پڑا تھا وہ وہاں کے مقامی ہسپتال میں داخل تھا جس کی اطلاع اس کے دوست نے فون کے ذریعے حریم کو دی۔

"میرا خیال ہے عبدالکریم کو اب پاکستان واپس آکر کوئی کاروبار شروع کرنا چاہتے تاکہ اپنی بچیوں کے ساتھ مل بیٹھ کر زندگی کے باقی دن سکھ سے گزارے ساری عمر پردیس نہیں کاٹا جاتا۔"

بیٹے کی محبت میں چور بی بی جان اس وقت دکھ کی کیفیت میں بول رہی تھیں مگر ان کی یہ ہمدردی حریم کو آگ لگا گئی وہ برا مانتے ہوئے بولی اپنا خیال اپنے پاس رکھیں بی بی جان پتہ نہیں آپ کیوں چاہتی ہیں کریم اس عمر میں بیمار اور معذور ہو کر اس گھر کی دہلیز پر ان پڑے اور ہم بھی عبدالرحمن اور اس کے خاندان کی طرح سسک سسک کر زندگی گزاریں۔

"میں نے ایسا کیا کہہ دیا بہو جو تم ایک دم بے مروتی کی بلندیوں پر جا چڑھیں۔"

بی بی جان خفگی سے بولیں

اس کے بعد کیا کہنے کو رہ گیا ہے۔ خیر سے کریم کا علاج سرکاری خرچ پر ہو رہا ہے پھر ریٹائرمنٹ کے بعد کمپنی اسے ایک معقول رقم اولڈ بینیفٹ کے نام پر ہر ماہ دے گی حکومت بے روزگاری الاؤنس بھی دے گی۔ یہاں کیا ہے سارا دن کے دھکے اور خواری کے بعد حاصل ہونے والے چند ہزار روپے جو روز بروز بڑھتی مہنگائی کے ہاتھوں بے بس دکھائی دیتے ہیں مسئلہ یہ ہے اللہ تعالیٰ نے آپ کو بیٹی دی نہیں اس لیے آپ کو کیا پتہ بیٹیوں کا کتنا خرچہ ہوتا ہے۔ یہاں تین تین بیٹیاں ہیں جن کے تعلیمی اخراجات پر خرچ الگ اور پھر ان کی شادیاں۔ سمجھو عمر بھر کی کمائی تو یہیں لٹ گئی۔

بی بی جان چاہ کر بھی حریم کو کرارا سا جواب نہ دے سکیں جس کی وجہ وہ سہولیات تھیں جو انہیں حریم کے گھر میسر تھیں جو بھی تھا اب وہ کسی طور گاڑی اور اے سی جیسی عیاشی چھوڑ کر مسفرہ کے گرم ترین فلور پر زندگی گزارنے کا تصور نہیں کرسکتی تھیں اس لئے حریم کو جواب دیئے بنا ہاتھ میں پکڑی تسبیح کے دانے گراتی وہ خاموشی سے اپنے کمرے میں چلی گئیں حریم فون پر کسی ٹریول ایجنسی کا نمبر ملانے لگی تاکہ ہانگ کانگ کے لئے اپنی سیٹ بک کروا سکے۔

✧✧✧

وہ اکیڈمی سے گھر آرہی تھی جب اللہ والا چورنگی کا سگنل کراس کرتے ہی اس کی نظر سائٹش پر پڑی جس کے ساتھ موجود لڑکی کو وہ پہلی نظر میں لڑکا سمجھی تھی چھوٹے چھوٹے بال جگہ جگہ سے پھٹی جینز پر مردانہ شرٹ پہنے موٹر سائیکل چلاتی لڑکی کسی طور پر صنف نازک میں شمار ہوتی نظر نہ آ

رہی تھی جبکہ اس کے پیچھے بیٹھی ستائش نے اپنی دونوں ٹانگیں یہاں وہاں کی ہوئی تھیں وہ اسکول یونیفارم میں ملبوس تھی سوہا نے اپنی گھڑی میں وقت دیکھا ابھی چھٹی ہونے میں آدھا گھنٹہ باقی تھا جس کا مطلب یہ ہوا ستائش آج اسکول نہیں گئی وہ صبح سے یوں ہی سڑکوں پر آوارہ گردی کر رہی تھی ایک دم ہی سوہا کی نظر ستائش کے ہاتھ میں موجود سگریٹ پر پڑی جو سلگ رہا تھا سوہا نے گھبرا کر ڈرائیور کی جانب دیکھا جو سامنے نظر کیے اپنے دھیان میں گاڑی چلا رہا تھا اس نے ستائش کو نہیں دیکھا تھا اسے حیرت ہوئی اپنے علاج میں تمام تر تعاون کے باوجود ستائش اسموکنگ کر رہی تھی اس نے سوچا ڈاکٹر نے ٹھیک کہا تھا ستائش کو علیحدہ رکھنا ضروری تھا مگر کیسے؟؟ یہ سوچتی سوہا نے ستائش کا پیچھا کرنے کا ارادہ ترک کر دیا لیکن اس نے دل میں پختہ ارادہ کرلیا تھا کہ آج ہی ستائش سے اس کی ان سرگرمیوں کے متعلق ضرور پوچھ گچھ کرے گی تا کہ اسے علم ہو کہ سوہا اس پر نظر رکھتی ہے شام میں جب وہ سو کر اٹھی تو ستائش اکیڈمی جا چکی تھی اور جب وہ رات میں واپس آئی تو اپنے اسائمنٹ کی تیاری میں مصروف سوہا اس واقعہ کو فراموش کر چکی تھی۔

✦✦✦

رات تین بجے حریم کی فلائٹ تھی جس کی تیاری مکمل کر کے وہ کھانا کھانے بیٹھی ہی تھی کہ اچانک باہر کا دروازہ بجا۔

”یہ اس وقت کون آ گیا۔“

سوہا نے آگے بڑھ کر بیرونی دروازہ کھولا سامنے ہی باسمہ اور خاور کھڑے تھے۔ دونوں خاموشی سے اندر آ گئے سوہا نے دیکھا باسمہ کا منہ اور آنکھ بری طرح سوجے ہوئے ہیں وہ گھبرا گئی

قبل اس کے کہ وہ خاور سے کوئی سوال کرتی بی بی جان ان دونوں کے پاس آن کھڑی ہوئی۔

”اسے کیا ہوا ہے؟“

سوہا نے محسوس کیا بی بی جان کا لہجہ سختی لیے ہوئے تھا۔

”ہونا کیا ہے جی موٹر سائیکل پر بیٹھی سو گئی تھی اور نیند کی حالت میں خود بخود نیچے گر گئی اسی لئے آپ لوگوں سے کہا تھا مجھے نہ سہی اپنی بیٹی کو گاڑی اور ڈرائیور کی سہولت ہی دے دیں تا کہ دوران سفر آسانی ہو یہ جب اور جتنا دل چاہے سوتی رہے کوئی خطرہ تو نہ ہوگا کہ کہیں گر گرا کر چوٹ لگ جائے گی مگر آپ لوگوں نے تو میری بات کو کوئی اہمیت ہی نہ دی۔

صوفے پر اطمینان سے بیٹھا خاور اپنی ساس کی جانب دیکھ کر بول رہا تھا۔

”تمہارے گھر میں گاڑی کھڑی کرنے کی جگہ کہاں ہے؟“

سونے کی چوڑیوں سے بھرے ہاتھ لہراتی حریم نے نخوت سے داماد کی جانب دیکھ کر سوال کیا۔

”تمہاری گلیاں اس قدر تنگ و تاریک ہیں ایک موٹر سائیکل نہ گزر پائے اور تم ہو کہ گاڑی کے خواب دیکھ رہے ہو اب پلیز یہ مت کہہ دینا کہ تمہیں گاڑی کھڑی کرنے کے لئے ایک بنگلہ بھی لے دوں۔“

بات کے اختتام پر وہ تمسخرانہ انداز میں ہنس دی۔

”میں نے رشتہ دیتے وقت تم سے گھر اور گاڑی کا کوئی وعدہ نہیں کیا تھا۔“

”جو وعدہ آپ نے کیا تھا وہ کب پورا کیا؟؟“

خاور چمک کر بولا۔

''سب وعدہ پورے ہو جائیں گے بیٹا ہتھیلی پر سرسوں مت جماؤ۔ ٹھنڈا کر کے کھانے کی کوشش کرو اس میں ہی تمہیں فائدہ ہوگا گرما گرم کھانا زبان جلا دیتا ہے تم ماں بیٹا تو پہلے دن سے ہی اتنے اتاولے ہوئے جا رہے ہو کہ اپنے سارے راستے خود ہی بند کر رہے ہو سب سے پہلے تو تم لوگوں کی اوچھی حرکتوں نے میرا اعتماد ہی ختم کر دیا۔ پھر بھی کوشش تو میں کر ہی رہی ہوں لیکن تمہاری قسمت کہ ابھی تک ویزہ نہیں لگا البتہ میری بیٹی سے تمہاری اولاد ہو جائے تو تمہیں بھی آسانی سے ویزا مل جائے گا۔''

حریم کی نئی شرط سن کر خاور کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ حریم اس سے اتنی چالاکی کرے گی کہ اس کی زندگی کے مزید کئی سال اپنی پاگل لڑکی کے ساتھ گزارنے پر مشروط کر دے گی یہ خیال ہی اس قدر خوف زدہ کر دینے والا تھا کہ وہ کوئی جواب دیئے بنا خاموشی سے اٹھ کر اپنے گھر آ گیا جب کہ باسمہ کو وہ وہیں چھوڑ آیا۔

✧✧✧

نوفل بہت دنوں سے چاہ رہا تھا سوہا کو اپنا حال دل سنا دے تاکہ معلوم ہو سکے کہ اس کے دل میں نوفل کے لئے کیا ہے تاکہ جب وہ تائی سے رشتہ کی بات کرے تو کوئی مسئلہ نہ ہو مگر جب بھی وہ کوشش کرتا۔ آواز حلق میں ہی کہیں پھنس جاتی اور وہ چاہ کر بھی اب تک سوہا کو اپنا حال دل نہ سنا سکا آج بھی سوہا سے بات کرنے کے ارادہ سے وہ سیڑھیاں اتر کر ان کے پورشن کی طرف آ گیا نوفل نے دیکھا صحن میں موجود شیشہ کا بڑا سا دروازہ باہر کی جانب کھلا ہوا تھا جس کے باعث اندر سے آتی سوہا اور ان کی گفتگو نے مگر اگلے ہی پل اس نے اپنا خیال ترک کر کے ایک قدم آگے بڑھایا ہی تھا جب اس دم دروازے کے عین سامنے کھڑی سوہا کی نظر اس پر پڑی وہ فوراً خاموش ہو گئی۔

''مجھے پیسے دو سوہا پلیز پھر دوبارہ نہیں مانگوں گی۔''

اندر داخل ہوتے سمے ستائش کی ملتجی آواز نوفل کے کانوں سے ٹکرائی۔

''فی الحال تم اپنے کمرے میں جاؤ میرے پاس پیسے نہیں ہیں میں نوفل کے ساتھ بینک جا رہی ہوں واپس آ کر دیتی ہوں۔''

''جھوٹ مت بولو۔''

ستائش نے بے چینی سے اسے دیکھا۔

''کتنے پیسے چاہئیں۔''

نوفل کوئی بات نہ جانتا تھا اس لیے اس نے دونوں بہنوں کی گفتگو میں دخل اندازی کرتے ہوئے اپنی جیب میں موجود بجلی کے بل کی رقم سے پانچ سو کا نوٹ نکال کر ستائش کی جانب بڑھایا جو نوٹ تھامتے ہی تیزی سے گھر کے باہر نکل گئی۔

''مجھ سے پوچھے بنا تمہیں ستائش کو رقم نہیں دینا چاہیے تھی۔''

سوہا کا لہجہ سخت تھا جو یہ ظاہر کر رہا تھا کہ اسے نوفل کی حرکت پسند نہیں آئی۔

''قرض دیا ہے تم لوٹا دینا''

نوفل کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ اتنے غصے میں کیوں ہے اس لئے مسکراتا ہوا بولا جب سوہا نے خاموشی سے قریب موجود پرس میں سے پانچ سو کا نوٹ نکال کر نوفل کے ہاتھ پر رکھ دیا وہ حیران ہوا اگر سوہا کے پاس پیسے تھے تو اس نے ستائش کو انکار کیوں کیا مگر سوہا کی سنجیدگی دیکھ کر وہ یہ سوال نہ کر سکا اس لئے خاموشی سے اسے کام

کرتا دیکھتا رہا جس نے جلدی جلدی ٹیبل سے برتن سمیٹ کر کچن میں رکھے اور گلاس میں پانی ڈال کر نوفل کی جانب بڑھایا وہ کچھ جلدی میں تھی ایسے میں نوفل کی سمجھ میں نہیں آیا وہ بات کہاں سے شروع کرے جب اسے بغور دیکھتی سوہا اچانک بولی۔

"تمہیں کچھ کہنا ہے؟"

شاید وہ نوفل کی مشکل بھانپ گئی تھی۔

"ہاں!"

نوفل نے اپنا گلہ کھنکارا جب اس پل اس کی نظر باسمہ پر پڑی جو صوفے پر بیٹھی اپنے ٹیب پر کوئی گیم کھیل رہی تھی۔

"باسمہ ابھی تک گئی نہیں۔"

"نہیں"

"کیوں خاور بھائی اسے لینے نہیں آئے۔"

"نہیں جب ممی واپس آئیں گی تو چلی جائے گی بس یا کچھ اور بھی پوچھنا ہے۔"

سوہا سوالیہ انداز سے اسے دیکھ رہی تھی نوفل گڑبڑا گیا۔

"نہیں چلتا ہوں ویسے ہی پوچھنے آیا تھا تمہیں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے۔"

"تمہارا شکریہ۔"

نوفل نے محسوس کیا آج سوہا کا انداز بہت روکھا سا تھا اس نے ایک گہرا سانس لیا اور لاؤنج کا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا اس کی آج بھی ہمت نہ ہوئی کہ وہ سوہا سے کوئی بات کرتا۔

✦✦✦

"تمہاری ساس کا کوئی فون نہیں آیا" میرا نے خاور کی جانب دیکھ کر پوچھا۔

"ایک ماہ سے زیادہ ہوگیا تم اس کی بیٹی کو اس کے گھر چھوڑ کر آئے ہو میں تو سمجھ رہی تھی وہ اگلے ہی دن ویزا اور ٹکٹ لے کر میرے دروازے پر آن پہنچے گی لیکن بھائی وہ تو بڑی شاطر عورت ہے گھر بیٹھی بیٹی کی بھی کوئی فکر نہیں۔"

"بتایا تو تھا اماں وہ ہانگ کانگ گئی ہے واپس تو آلینے دو پھر دیکھتے ہیں۔"

"اے بیٹا! اس نے واپس آکر کونسا یہاں جھنڈے گاڑ جانے میں ویسے بھی فون ہانگ کانگ سے بھی پاکستان ہو جاتا ہے تمہاری خیر خیریت ہی پوچھ لیتی ایک سر ہے تمہارا تو اسے پتہ ہی نہیں کہ بیٹی دی ہے جس آدمی کو اس کا حال چال بھی پوچھا جاتا ہے۔"

"میرا جلے دل کے پھپھولے پھوڑ رہی تھی۔"

"کوئی بات نہیں ہے اماں ایک دو ماہ اور دیکھ لے اگر کام نہ بنا تو میں نے سوچ لیا ہے اسے طلاق دے کر دوسری کرلوں گا۔"

خاور فیصلہ کن انداز میں بولا۔

"اچھا طلاق دینے کے بعد حق مہر کا لاکھوں روپیہ کہاں سے ادا کرے گا تو جانتا نہیں حریم کو حلق میں انگلی ڈال کر سارا روپیہ وصول کرے گی نہ صرف حق مہر کا روپیہ بلکہ جہیز کے نام پر دی جانے والی رقم بھی جو تمہارے اکاؤنٹ میں ہے وہ بھی واپس کرنا پڑے گی یہ سب سوچ لینا پھر کوئی قدم اٹھانا۔" میرا نے بیٹے کو تمام سچائی بتاتے ہوئے خبردار کیا۔

"جو بھی ہے اماں یہ طے ہے اگر میں باہر نہ گیا تو اس پاگل کو زیادہ عرصہ برداشت نہیں کروں گا کچھ نہ ہوا تو جان سے مار کر کہیں پھینک دوں گا لیکن اس لڑکی کے ساتھ نہیں رہوں گا۔"

غصہ میں بولتا خاور پاؤں میں چپل پہن کر گھر سے باہر نکل گیا۔

✦✦✦

"پتہ نہیں کیوں مجھے لگتا ہے باسمہ اس دن موٹر سائیکل سے گری نہیں تھی۔"

صوفے پر لیٹی باسمہ پر ایک سرسری سی نظر ڈالتی بی بی جان نے سوہا کو مخاطب کیا۔

"میرا خیال ہے آپ بھی وہی سوچ رہی ہیں جو میں نے پوچھا تھا۔"

سوہا نے دادی کو دیکھا۔

"ہاں مجھے یقین ہے خاور باسمہ پر تشدد کرتا ہے۔"

"سوہا کا خیال درست نکلا بی بی جان بھی وہی سوچ رہی تھیں جو خیال کئی دنوں سے اس کے دماغ میں کلبلا رہا تھا۔"

"پھر بتائیں بی بی جان اس صورت میں اب ہمیں کیا کرنا چاہیے۔"

"فی الحال تو کچھ بھی نہیں۔"

بی بی جان کا جواب خلاف توقع تھا۔

"جب تک عبدالکریم کی طبیعت ٹھیک نہیں ہو جاتی ہم کسی سے کوئی بات نہیں کر سکتے تمہاری ماں نے اُسے آج تک باسمہ کے شوہر اور سسرال کے متعلق کچھ نہیں بتایا ایسے میں ہماری طرف سے ملنے والی کوئی بھی اچانک خبر کسی نقصان کا باعث بن سکتی ہے۔"

بی بی جان کا جواز درست تھا۔

"اس کا مطلب یہ ہوا یہ اس وقت تک اس جہنم میں ہی زندگی گزارے گی۔"

"جب تک پاپا ٹھیک نہ ہوں۔"

سوہا نے باسمہ کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"فی الحال اپنے گھر میں سکون سے ہے ہم اسے جہنم میں واپس نہیں بھیج رہے جب تک تم ہماری ماں واپس آ کر خاور کے گھر والوں سے اس کے متعلق بات نہیں کرتی یہ وہاں نہیں جائے گی۔"

"مجھے اب وہاں نہیں جانا"۔

بظاہر لاپرواہ دکھائی دیتی باسمہ ان دونوں کی باتیں سنتی اچانک ہی بول اٹھی سوہا نے چونک کر اسے دیکھا۔

"وہ لوگ اچھے نہیں ہیں مجھے مارتے ہیں۔"

سوہا نے ایک دم بی بی جان کی شکل دیکھی جو اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

ہمارے باپ کو جلد شفایاب کرے تاکہ ہماری ماں واپس آئے پھر اس کے سسرال والوں سے بات کرتے ہیں"۔

بی بی جان کا لہجہ پریشان کن تھا۔

"اسی لیے میں چاہ رہی ہوں تمہارا رشتہ نوفل سے ہو جائے گھر کا بچہ ہے کم از کم ایسی پریشانیاں تو نہ ہوں گی"۔

دل کی بات سوہا تک پہنچاتی بی بی جان اپنے کمرہ کی جانب بڑھ گئیں مگر سوہا کو سوچ کا ایک نیا سرا تھما گئیں۔

✦✦✦

میکائیل گھر میں قدم رکھتے ہی ایک خوشگوار سی حیرت میں گھر گیا اس نے دیکھا سامنے دیوار پر لگی کراس غائب تھی وہ کراس جو اس نے ہوش سنبھالتے ہی ہمیشہ اپنے گھر کی دیوار پر دیکھی آج اس کی غیر موجودگی نے میکائیل کو حیران کر دیا۔ وہ اپنے کمرہ کی جانب بڑھا تو نظر ماں پر پڑی جو آرام کرسی پر نیم دراز کچھ پڑھ رہی تھی عائشہ نے بھی اسے دیکھ لیا تھا اس لئے جلدی سے کرسی سے اٹھ کر اس کے پیچھے ہی کمرہ میں آ گئی۔

"تمہاری جب بھی سوہا سے بات ہوا سے بتانا ہم نے اپنے گھر سے کراس ہٹا دیا"۔

میکائیل نے چونک کر ماں کی جانب دیکھا۔
"سوہا بہت اچھی لڑکی ہے۔"
سوہا کے ذکر کے ساتھ عائشہ کے چہرہ پر نرمی سی بکھر گئی۔
"میں نے اس دن محسوس کیا تھا سوہا کو گھر میں لگی یہ کراس پسند نہ آئی تھی۔"
میکائیل کو حیرت ہوئی لیکن وہ کچھ نہ بولا خاموشی سے اپنی ماں کا چہرہ دیکھے گیا۔
"وہ واپس آئے تو تم دونوں شادی کرلو۔"
اپنی بات ختم کر کے وہ واپس پلٹی جب میکائیل نے اُسے کندھوں سے تھام کر روک لیا۔
"تھینک یو مما...... آئی لو یو"
ماں کے لیے محبت کا یہ احساس اس کے دل میں نیا جاگا تھا جس میں کوئی غرض نہ تھی۔ عائشہ مسکرا دی۔
"آپ دعا کیا کریں سوہا کے دل میں میری محبت پیدا ہو۔"
"وہ تم سے محبت کرتی ہے۔"
عائشہ کا یقین پختہ تھا۔
"اسے کچھ وقت دو وہ اپنی محبت کا اظہار خود کرے گی۔"
عائشہ کے اس ایک جملے نے میکائیل کے دل میں ٹمٹماتے امید کے دیئے کی لو کو تیز کر دیا۔
✧✧✧
پاکستان واپس آتے ہی گھر میں موجود باسمہ، حریم کو کھٹکنے لگی ایک ہفتہ بعد ہی وہ بی بی جان کے پاس جا پہنچی
"خاور اب تک باسمہ کو لینے نہیں آیا میرا خیال ہے کہ میں اور مسفرہ جا کر اسے واپس چھوڑ آتے ہیں۔"

"بہو ابھی تک تو کسی نے وہاں سے پلٹ کر نہیں پوچھا کہ بچی کس حال میں ہے تو کیا ضرورت ہے تمہیں خود چھوڑ کر آنے کی فی الحال خاموشی سے بیٹھو اور بچی کو بھی سکون لینے دو۔ سکون اپنے گھر میں ہی ملتا ہے بی بی جان
بی بی جان نے حریم کو دیکھا۔
"وہاں کہاں سکون اللہ جانے بچی کے ساتھ کیا ظلم کرتے رہے ہماری بھولی بھالی بچی پاگل ہوگئی ہے دن بھر سوجے منہ کو لے یا تو سوئی رہتی ہے یا خلا میں ہاتھ چلا چلا کر کسی سے باتیں کرتی ہے خدا پوچھے خاور جیسے ظالم مردوں کو۔"
بی بی جان کے کوسنے سن کر حریم کا دل چاہا انہیں سچ بتا دے۔ آپ کی پوتی تو تھی ہی پاگل اس میں خاور کا کوئی قصور نہیں ہے۔
مگر مصلحتاً خاموش رہی بی بی جان کا بس چلتا تو حریم کو بھی خوب باتیں سناتیں مگر اس کی ناراضی کے ڈر سے ان کے کوسنوں کا محور خاور کی ذات رہی کیونکہ حریم کی مثال ایک ایسی ریاست کے حکمران جیسی تھی جو معاشی طور پر مضبوط ہونے کے سبب اپنے سے نیچے والوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہو اور نیچے والے اس کی طاقت سے خوفزدہ ہوں۔
"ویسے میرا خیال ہے کہ مجھے خاور کو فون کر کے پوچھنا تو چاہئے جہیز کے نام پر اتنی رقم میں نے اس کے اکاؤنٹ میں ڈالی ہے پھر کیسے وہ باسمہ کو یہاں چھوڑ گیا۔" اس بار بی بی جان خاموشی سے تسبیح پڑھتی رہیں انہوں نے حریم کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ حریم نے خاور کا نمبر ملایا بیل جا رہی تھی مگر اس نے فون ریسیو نہ کیا اس کے بعد حریم نے کئی بار کال کی۔ مسلسل بیل جا رہی تھی لیکن دوسری طرف کسی نے اس کا فون ریسیو نہ کیا وہ سمجھ گئے خاور اس سے بات نہیں کرنا

چاہتا اس نے میرا کا نمبر ملایا جو بند تھا یا شاید اس نے اپنا نمبر تبدیل کر لیا تھا یہ سوچ کر اسے انتہا درجہ کا غصہ آیا اب ضروری تھا وہ اس سلسلہ میں مسفرہ سے بات کرے کیونکہ یہ رشتہ اسی کے توسط سے ہوا تھا میرا اس کی دور کی خالہ تھی اگر مسفرہ بیچ میں نہ ہوتی تو وہ کبھی بھی یاسمہ کا رشتہ یہاں نہیں کرتی وہ تو خاور کو جانتی بھی نہ تھی۔

"خاور کی بات کرنے میں مسفرہ کی طرف جا رہی ہوں"

بی بی جان کو اطلاع دے کر اس نے ڈریسنگ کے آئینہ میں اپنا اچھی طرح جائزہ لیتے ہوئے قریب رکھی سرخ لپ اسٹک سے اپنے ہونٹ رنگے، مہنگا والا پرفیوم خود پر چھڑکا اب وہ مسفرہ کے گھر جانے کے لئے تیار تھی پاؤں میں ہیل والی جوتی پہن کر ٹھک ٹھک کرتی حریم سیڑھیوں کی سمت بڑھ گئی جبکہ پیچھے بیٹھی بی بی جان اسے یوں جاتا دیکھتی ہی رہ گئیں۔

✦✦✦

سوہا نے اپنے فون پر آنے والی میکائیل کے گھر کی تصویروں کو دو سے تین بار دیکھا اور پھر میکائیل کا نمبر ملا لیا وہ ان تصویروں کو بھیجنے کا مطلب سمجھ گئی تھی اس لئے میکائیل کے فون ریسیور کرتی ہی بولی۔

"تمہارے داخلی دروازے پر جو بڑی سی کراس سی لگی تھی وہ کس نے اتاری؟"

"ممی نے"

میکائیل کے جواب نے اسے حیران کر دیا۔

ان کا خیال تھا تمہیں ہمارے گھر اس کراس کا لگایا جانا پسند نہیں آیا۔

"بات پسند یا ناپسند کی نہیں ہے"

سوہا نے وضاحت کرنا ضروری سمجھا۔

ہر شخص اپنے مذہب سے پہچانا جاتا ہے وہ مسلمان ہو یا عیسائی یا کوئی بھی دوسرا مذہب جس کے مطابق عبادت کرنا اس کا رائٹ بنتا ہے جس پر کوئی اعتراض نہیں کر سکتا مذہب سب کا اپنا ذاتی مسئلہ ہوتا ہے۔ لیکن ایک ہی گھر میں مختلف مذاہب کو اکٹھا کر کے جینے والے لوگ مجھے کبھی سمجھ نہیں آئے۔ میں تمہاری بات سمجھ گیا ہوں اور مجھے خوشی ہے تمہاری ایک دن میرے گھر آمد نے یہ بات میری ممی کو بھی سمجھا دی ہے جنہوں نے بہت سال سے کبھی کسی مذہب کو اہمیت نہیں دی اب وہ اس کی اہمیت سمجھ گئی ہیں۔

مجھے یہ سب جان کر خوشی ہوئی تم آنٹی کو میری طرف سے تھینک یو کہہ دینا۔

سوہا نے فون بند کر دیا اسے میکائیل کی ممی کے رویے نے حیران کر دیا تھا جو ایک دن کی ملاقات میں، پہلی ہی نظر میں سوہا کو سمجھ گئی تھیں چند گھنٹوں میں وہ اس کی پسند اور ناپسند جان گئی تھی اور ایک ان کی ماں تھی جو اتنے سالوں میں اب تک اپنی بیٹی کو نہ سمجھ سکی تھی اور یہ بات کافی دنوں تک سوہا کو پریشان کرتی رہی۔

✦✦✦

"مجھے سمجھ نہیں آتا حریم کیا چاہتی ہے۔"

مسفرہ نے رحمن کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ مسلسل جھوٹ بول رہی ہے بھائی عبدالکریم چاہتے ہیں خاور کو یہاں کاروبار کروا کر دے دیا جائے حریم اس میں بھی راضی نہیں جب کہ وہ اچھی طرح جانتی ہے میرا نے رشتہ کیا ہی لالچ میں تھا اگر میرا کو لالچ نہ ہوتا تو وہ اپنی بہن کی بیٹی لیتی ہے جسے خاور پسند بھی کرتا تھا مگر حریم نے تو انتہا کر دی ہے کسی کی کوئی بات سننے کو تیار نہیں۔

عبدالرحمن نے محسوس کیا جب سے حریم مسفرہ سے مل کر گئی ہے وہ مسلسل غصے میں تھی۔

"بھلی مانس ان کے مسئلہ کے پیچھے تم کیوں اپنا بلڈ پریشر بڑھا رہی ہو چھوڑو جس کا جو دل چاہتا ہے اسے کرنے دو۔"

"یہی تو مشکل ہے۔"

مسفرہ عبدالرحمان کے پاس چارپائی ان کے پاس بیٹھی۔

"تم میری بات سمجھ نہیں ہو دراصل میں یہ رشتہ کروا کر دونوں طرف سے پھنس گئی ہوں۔ اب یہ دونوں جاہل عورتیں اپنی اپنی غلطیوں کا ملبہ مجھ پر مل رہی ہیں تم نے دیکھا نہیں ابھی تمہاری بھابھی میرے ساتھ کس قدر ناراض ہو کر گئی ہیں ایسے ہی پچھلے ہفتے میرا مجھ پر برس کر گئی ہے۔ جیسے خاور کو ہانگ کانگ جانے سے میں نے روکا ہوا ہے۔"

عبدالرحمان کی سمجھ میں اب آیا مسفرہ کیوں پریشان ہے۔

"اب تم کیا سمجھتی ہو اس مسئلہ کا حل کیا ہونا چاہیے؟"

"میں چاہتی ہوں تم بھائی عبدالکریم کو فون کرو انہیں ساری بات بتاؤ تاکہ وہ خود خاور سے بات کر کے اپنے مسائل حل کریں اور اس طرح میری زندگی اس بک بک سے آزاد ہو۔"

"بھائی عبدالکریم سے بات کرنا بہت مشکل ہے کیونکہ ان کا دماغ مکمل طور پر بھابھی حریم کے قبضہ میں ہے اس لیے میں جو بھی کوئی بات کروں گا وہ فوراً بیوی کو بتائیں گے تم بھی اچھی طرح جانتی ہوں بھابھی حریم سے مشورہ کیے بنا وہ کوئی بھی قدم نہیں اٹھاتے۔ ہماری ہمدردی غلط رخ اختیار کر جائے گی۔ حریم بھابھی کا دل خراب ہوگا اور تم جو نوفل والا ٹانکا جوڑنے کا سوچے بیٹھی ہو وہ مسئلہ بیچ میں اٹک جائے گا۔"

عبدالرحمن کی بات سن کر اثبات میں سر ہلاتی مسفرہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"شکر ہے تم بھی کوئی عقل کی بات کرتے ہو۔ خیر مجھے اب اس مسئلے میں نہیں بولنا بھابھی جانے اور میرا دونوں اپنی اپنی جنگ لڑتی رہیں۔"

عبدالرحمن سے بات کر کے مسفرہ کا دل ہلکا ہو گیا تھا اس لیے وہ مطمئن ہو کر کچن کی جانب بڑھ گئی۔

◆◆◆

سوہا نے کمرہ کا دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔ ستائش بے سدھ سو رہی تھی وہ ڈر گئی۔ ستائش جب سے میڈیسن لے رہی تھی کافی ست ہو گئی تھی۔ سوہا نے آگے بڑھ کر اس کی نبض چیک کی اسی پل ستائش نے کروٹ بدلی تو سکون کا سانس لیتی سوہا کمرہ سے باہر نکل آئی ستائش پہلے سے بہتر ہو رہی تھی وہ چاہتی تھی اب نوفل سے ستائش کے لئے بات کرے ان ہی خیالوں میں گم اس نے آنٹی ثمینہ سے دھلے کپڑوں کی باسکٹ پکڑی اور اوپر جانے والی سیڑھیوں کی سمت بڑھی ہی تھی کہ برآمدہ کا دروازہ کھول کر حریم باہر آئی برقعہ پہنے گہری لال لپ اسٹک لگائے وہ کہیں جانے کے لئے تیار تھی سوہا رک گئی کیونکہ حریم کے ساتھ ہی عبایہ میں ملبوس باسمہ بھی تھی سوہا تیزی سے ان دونوں کے قریب آئی۔

"کہاں جا رہی ہیں آپ۔"

سوہا نے دیکھا باسمہ رو رہی تھی۔

"کیماڑی"

مختصر جواب دیتی حریم اپنی اونچی ہیل کی کھٹ کھٹ کے ساتھ دروازے کی جانب بڑھی جب سوہا نے ماں کو بازو سے پکڑ کر روک لیا۔

"آپ اسے وہاں کیوں لے کر جا رہی ہیں؟"

"تم کون ہوتی ہو مجھ سے سوال جواب کرنے والی۔"

حریم نے غصہ میں اسے گھورا

"پلیز ممی اتنا ہائپر مت ہوں میں تو صرف......"

سوہا گھبرا گئی۔

"سامنے سے ہٹو میرے اور دوبارہ مجھ سے کوئی سوال مت کرنا اس کا تمہیں کوئی حق نہیں۔ بیٹی ہو بیٹی بن کر رہو ماں بننے کی ضرورت نہیں"

باسمہ کا بازو تھامے حریم نے باہر نکلنے کے لئے قدم آگے بڑھایا ہی تھا کہ بی بی جان اس کے سامنے آگئی۔

"یہ تو تمہاری اولاد ہے تم سے کوئی سوال نہیں کرسکتی مگر میں تو ماں ہوں عبدالکریم کی۔ مجھے تو بتادو اس غریب کو یوں گھسیٹے کہاں لے جا رہی ہو اگر تمہارا ارادہ اس کے سسرال جانے کا ہے تو میرا مشورہ مانو یہیں رک جاؤ ایسا نہ ہو وہاں جاکر تم خود اپنی بے عزتی کروالو کیوں کہ تمہاری غلط بیانی، جھوٹے وعدوں نے میرا کا دماغ گھما رکھا ہے وہ مسفرہ کے پاس آئی تھی اس سے مل کر مجھے اندازہ ہوا تم اگر سیر ہو تو وہ سوا سیر ذرا لحاظ مروت نہیں ہے اس میں۔ اس لئے بہتر ہے کل شام ان سب کو دعوت پر بلالو واپسی میں وہ اپنی بچی بھی ساتھ لے جائیں گے۔"

بی بی جان کا مشورہ اچھا تھا ان کی باتیں بھی سچی اور کھری تھیں حریم رک گئیں کچھ دیر سوچا اور ساس کو دیکھ کر بولی۔

"کچھ بھی سہی اب اسے واپس تو چھوڑ کر آنا ہی ہے آپ کو پتہ ہے ان کے باپ کی طبیعت بہت خراب ہے ایسے میں اسے پتا چلا کہ باسمہ گھر بیٹھی ہے تو وہ وہاں اکیلا پردیس میں بے موت مارا جائے گا کیونکہ اپنی بچیوں کو لے کر وہ پہلے ہی بہت پریشان ہے۔"

حریم نے پہلی فرصت میں عبدالکریم کی بیماری کا کارڈ کھیلا اور اس میں کامیاب بھی ہو گئی۔

"جہاں تک دعوت کی بات ہے تو ابھی میں بہت تھکی ہوئی ہوں فی الحال کوئی دعوت نہیں کرسکتی عبدالکریم کی ذمہ داری نے مجھے ادھ موا کردیا ہے اس لئے اتنا جھنجھٹ رہنے دیں خاور کے ہاتھ پر چند ہزار رکھ دوں گی دونوں ماں بیٹا سیدھے ہو جائیں گے۔

پیسے کے زعم میں مبتلا حریم، باسمہ کو اپنے ساتھ لے کر سا کے سسرال جا پہنچی جہاں پیش آنے والی غیر متوقع صورت حال نے اس کے ہر اندازہ کو غلط ثابت کردیا۔

✧✧✧

عبدالکریم نے اپنے سامنے کھڑے نوجوان کو دیکھا اونچا لمبا اور خوبصورت سا یہ لڑکا اسے دو ماہ قبل عثمان اسلامک سینٹر میں ملا تھا اپنے ہاتھوں میں پھول تھامے وہ نوجوان عبدالکریم کی جانب دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

"اسلام علیکم انکل"

فارمیلٹی لہجہ میں بولتا وہ عبدالکریم کو بہت اپنا سا لگا ایسی ہی اردو اس کی بیٹیاں بھی بولا کرتی تھیں۔ جنہیں یاد کر کے عبدالکریم کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

"آپ کی طبیعت کیسی ہے؟"

اس نے اپنے ہاتھ سے پکڑے پھول عبدالکریم کی طرف بڑھائے جنہیں تھامتے ہوئے عبدالکریم نے اس کا ہاتھ بھی تھام لیا۔

میکائیل کا ہاتھ تھامتے ہی اسے ایک عجیب طرح

کی اپنائیت کا احساس ہوا۔
"میں آپ کا شکریہ ادا کرنے آیا تھا آپ عثمان اسلامک سنٹر میں میری ہیلپ نہ کرتے تو میں کبھی بھی نماز نہ سیکھ پاتا۔"
میکائیل کی آواز بھیگ گئی۔
"یہ اللہ تعالیٰ کی رضا سے تھا جو اس دن مجھے تم مل گئے اس میں میرا کوئی کمال نہیں۔"
عبدالکریم کے چہرہ پر نرم مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی۔
"کیا میں آپ سے ملنے آجایا کروں؟"
"کبھی کبھی انکل ناٹ ڈیلی۔"
وہ عبدالکریم کو تذبذب کا شکار دیکھ کر جلدی سے بولا۔
"تم روز بھی آسکتے ہو۔"
عبدالکریم نے خوشدلی سے کہا۔
"تھینک یو انکل"
میکائیل کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔
اس کے بعد میکائیل نے عبدالکریم کے ساتھ ایک اچھا وقت گزارا ان دونوں نے قریبی پارک میں واک بھی کی ایک ساتھ کھانا بھی کھایا عبدالکریم کو میکائیل اپنے دل کے قریب محسوس ہوا جس سے اس کی تنہائی میں رونق آگئی اس کے دل نے خواہش کہ میکائیل روز اس سے ملنے آجایا کرے۔ میکائیل نے انجانے میں سوہا کی طرف جانے والے راستے پر اپنا پہلا قدم رکھ دیا تھا۔

✦✦✦

حریم کے کیماڑی جاتے ہی سوہا نے اچھی طرح ساری الماری چھان لی اسے اپنے پاسپورٹ اور دیگر کاغذات کی تصویر چاہیے تھی جو میکائیل کو واٹس ایپ کر سکے تاکہ وہ اپنا کام شروع کرتا لیکن اس کا پاسپورٹ تو دور کی بات تھی۔ شناختی کارڈ بھی سامنے کہیں نہ تھا اسے حیرت ہوئی وہ کئی دنوں سے اپنا شناختی کارڈ مانگ رہی تھی مگر حریم اس کی بات ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیتی یہی وجہ تھی آج سوہا نے ماں کے گھر سے نکلتے ہی اس کے کمرہ سے خود شناختی کارڈ لینے کا ارادہ کیا۔ جہاں اسے پہلے ہی مرحلے پر ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ حریم نے ان تینوں کے ڈاکومینٹس چھپا کر رکھے تھے مگر کیوں؟ یہ بات اسے سمجھ نہ آئی الماری کے اندرونی دراز لاکڈ تھے جس کی چابی یقیناً اس کی ماں کے پاس تھی۔ اب اس سوچ نے اسے مزید پریشان کر دیا وہ جانتی تھی کہ حریم اسے کبھی بھی کوئی کاغذ نہ دے گی کیونکہ وہ نہیں چاہتی تھی اس کی بیٹیاں دوبارہ ہانگ کانگ واپس جائیں۔ وہ باسمہ اور خاور کے معاملے میں اپنی ماں کا رویہ دیکھ چکی تھی جو اس کے لئے ناقابل فہم تھا وہ یہ بات سمجھنے سے قاصر تھی کہ اس کی ماں ایسا کیوں چاہتی ہے۔ مگر ایک بات اسے سمجھ آگئی تھی اب جو کرنا تھا خود کرنا تھا مگر کیسے؟ اگر دراز کی چابی نہ ملی تو وہ اپنے کاغذات کس طرح نکالے گی؟ اس خیال کے دماغ میں آتے ہی وہ ایک نئی الجھن کا شکار ہوگئی جو بھی تھا اسے ہر حال میں دراز کی چابی چاہیے تھی اسی سوچ میں گھری وہ کمرہ سے باہر نکلی گھڑی میں وقت دیکھا ممی اور باسمہ کو گھر سے گئے کافی وقت ہوگیا تھا مگر وہ اب تک واپس نہ آئی تھیں بی بی جان نے ایک بار فون بھی کیا مگر حریم نے کال ریسیو نہ کی تو انہوں نے ڈرائیور کو کال کی جس نے بتایا وہ دونوں خاور کے گھر کے اندر ہی ہیں بی بی جان حیرت سے بڑبڑا رہی تھیں۔
"مجھے تو سمجھ نہیں آرہی حریم نے سارا دن خاور کے گھر ہی نکال دیا اللہ خیر کرے۔"

سائش ان تمام مسائل سے قطعی بے نیاز ان کے تخت پر بیٹھی اپنا اسکول ہوم ورک مکمل کرنے میں مصروف تھی ایسے میں سوہا نے سوچا وہ نوفل سے مل کر آئے جو اس کے بہت سے مسائل حل کرسکتا تھا اس لئے بی بی جان کو بتا کر وہ مسفرہ چاچی کی طرف آ گئی۔

✦✦✦

شازم نے دیکھا وہ اپنے سامنے کھانے کی پلیٹ رکھے کسی گہری سوچ میں گم تھی۔

"تم کھانا کیوں نہیں کھاتیں۔"

شازمہ نے جیسے ہی اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور وہ ڈر کر اچھل پڑی ساتھ ہی اس کے حلق سے ایک چیخ برآمد ہوئی شازمہ شرمندہ ہو گئی۔

"سوری یار تم تو ڈر گئیں۔"

شازم کو کوئی بھی جواب دیے بنا وہ ٹکر ٹکر اسے دیکھ رہی تھی۔

"مجھے اپنے پاپا کے پاس جانا ہے تم مجھے ان کے پاس چھوڑ آؤ ورنہ یہ لوگ مجھے مار دیں گے۔"

روتے ہوئے وہ شازمہ کی منتیں کر رہی تھی جب میڈیم وہاں آ گئی جو اسے روتا دیکھ کر حیرت سے بولی۔

"مجھے تو یہ لڑکی پاگل لگتی ہے جب سے آئی ہے نہ کچھ کھاتی ہے اور نہ ہی بات کرتی ہے اکیلی بیٹھی ہو تو ہنستی ہے کوئی بات کرلے تو رونے لگتی ہے۔"

اس کے بارے میں لگایا جانے والا میڈم کا تجزیہ بالکل درست تھا شازمہ نے بھی اس کی تائید کی۔

"آپ اسے ڈاکٹر کو دکھائیں میں نے اکثر دیکھا ہے یہ اپنے سامنے موجود کسی غیر مرئی مخلوق سے گفتگو بھی کرتی ہے۔"

"گھر سے دوری کے احساس نے اس کے دماغ پر اثر ڈالا ہے آہستہ آہستہ خود ہی ٹھیک ہو جائے گی تم پریشان مت ہو۔"

میڈم نے اپنے تجربہ کی بنیاد پر شازمہ کو سمجھایا اور آگے کی جانب بڑھ گئی۔

✦✦✦

"لڑکی کی ماں بار بار آ رہی ہے اور اللہ جانے لڑکی کہاں چلی گئی میں نے ہر ہسپتال اور پولیس اسٹیشن چیک کرلیا۔"

میڈم نتاشہ نے پریشانی کے عالم میں نرس کی جانب دیکھا۔

"انہیں بتا دیں لڑکی یہاں سے جا چکی ہے۔"

"کیا بکواس ہے یہ بھلا بتاؤ میں کیسے کہہ سکتی ہوں لڑکی یہاں سے جا چکی ہے جب کہ ہمارے پاس اس کا بل جمع نہیں ہے اور نہ ہی ڈسچارج شیٹ ہے۔"

"یہ کون سا مشکل ہے سب کچھ آپ کے ہاتھ میں ہے میڈم آپ اگر چاہیں تو اپنے ادارہ کی ساکھ بچا سکتی ہیں اگر وہ عورت تھانہ چلی گئی تو ہمارے لئے بہت مشکل ہو گئی اپنے بچاؤ کا انتظام پہلے سے کر کے رکھیں۔"

نرس کا مشورہ اچھا تھا کسی بھی ناگہانی کی صورت میں وہ ثبوت پیش کرسکتی تھی کہ لڑکی یہاں سے جا چکی ہے یہ سب سوچ کر اس نے باہر کاؤنٹر پر کھڑی لڑکی، ڈیوٹی پر موجود گارڈ اور چند اہم لوگوں کو اپنے کمرہ میں طلب کرلیا۔

✦✦✦

وہ جب سے پاکستان آئی تھی مسفرہ کی طرف آنے کا اتفاق نہ ہوا آج پہلی بار وہ ان کے گھر آئی تو مسفرہ اسے اپنے گھر دیکھ کر خوش ہو گئی۔

''آنٹی نوفل کہاں ہے؟''
رسمی دعا سلام کے بعد وہ اپنے مدعا پر آگئی۔
''اپنے کمرہ میں ہوگا وہیں چلی جاؤ''
سوہا کو جواب دیتی مسفرہ کا دل خوشی سے جھوم رہا تھا اس لمحہ اسے ایسا لگا گویا اس کے من کی مراد پوری ہونے کا وقت آگیا ہے وہ تو دل سے چاہتی تھی نوفل اور سوہا کے درمیان ایک اچھی دوستی کا آغاز ہو تو وہ حریم بھابھی سے اس رشتہ کی بات کر سکے ورنہ اسے خدشہ تھا یہاں بھی سوہا پہلے کی طرح صاف انکار نہ کر دے وہ اندازہ لگا چکی تھی سوہا باسمہ سے مختلف ہے اور اپنے حق کے لئے بولنا جانتی ہے کبھی کبھی اسے محسوس ہوتا حریم بھی سوہا سے خائف رہتی ہے۔
مسفرہ سے رسمی علیک سلیک کے بعد سوہا نوفل کے کمرہ میں آگئی نوفل اسے دیکھ کر خوش ہو گیا وہ پہلی بار اس سے ملنے اس کے کمرہ تک آئی تھی نوفل نہیں جانتا تھا سوہا اس سے کیا بات کرنے آئی ہے لیکن اس وقت سوہا کو اپنے کمرہ میں دیکھ کر اسے لگا جیسے بہار آگئی ہو۔
''زہے نصیب آج تو بڑے بڑے لوگ میرے کمرے میں آئے ہیں کبھی ہم انہیں دیکھتے ہیں کبھی اپنے کمرے کو دیکھتے ہیں''
نوفل نے اس کے بیٹھنے کے لئے کرسی لا کر رکھی اتنی دیر میں مسفرہ جگ میں ملک شیک لا کر اس کے سامنے موجود چھوٹی ٹیبل پر رکھ گئی۔ نوفل نے دیکھا کہ وہ کسی گہری سوچ میں گم قدرے خاموش ہے۔
''کیا بات ہے سوہا کیوں اتنی پریشان ہو؟''
نوفل نے اپنی کرسی بھی سوہا کے بالکل سامنے رکھ لی۔
''تمہیں پتا ہے نا پاپا کی طبیعت کس قدر خواب ہے''
وہ گود میں رکھے اپنے ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے آہستہ آواز میں بولی۔
''ہاں اور وہ وہاں اکیلے بھی ہیں''
''یہی پریشانی ہے دل میں اکثر خیال آتا ہے کاش ہمارا بھی کوئی بھائی ہوتا جوان حالات میں پاپا کے پاس ہوتا تو اتنی پریشانی نہ ہوتی۔ ممی نے یہی سوچ کر باسمہ کی شادی کی تھی کہ خاور بھائی کی شکل میں پاپا کو بیٹا مل جائے گا مگر وہ لوگ بہت لالچی نکلے انہوں نے تو باسمہ بیچاری کا جینا حرام کر رکھا ہے تو پاپا کے پاس جا کر انہیں کیا سنبھالیں گے پریشان ہی کریں گے ویسے تو بیٹیاں بھی بیٹے سے کم نہیں ہوتیں لیکن جانے کیوں پاپا ہمیشہ اس معاملہ میں وہمی رہے۔ ساری عمر یورپ میں گزار کر بھی وہ اندر سے ٹیپکل مرد ہی نکلے جن کے خیالات بیوی اور بیٹیوں کے معاملہ میں اتنے متضاد تھے کہ...... خیر چھوڑو''
سوہا نے اپنی بات درمیان میں چھوڑ کر ایک ٹھنڈی سانس لی۔
''میں بھی کیا کہانی لے بیٹھی۔''
''تم جو کہہ رہی ہو سچ ہے کوئی بھی غیر کسی دوسرے کا بیٹا نہیں بن سکتا البتہ کوئی اپنا ہو تو اس کے نزدیک چچا اور باپ میں فرق نہیں ہوتا۔''
نوفل آہستہ آہستہ سوہا کو اپنے ٹریک پر لا رہا تھا جب کہ سوہا بھی شاید یہی چاہتی تھی اس لئے اس نے فوراً نوفل کی ہاں میں ہاں ملائی۔
''تم صحیح کہہ رہے ہو۔''
نوفل نے سکھ کا سانس لیا سوہا اس کی بات سمجھ رہی تھی۔
''بس پھر میرا مشورہ یہ ہے کہ تم اپنے کسی قریبی عزیز سے شادی کر لو وہ تایا جی کے بیٹے کی

کمی ضرور پوری کر دے گا۔"

"تمہاری ہر بات درست ہے لیکن میں فی الحال شادی نہیں کرنا چاہتی نہ ہی کوئی قریبی اور نہ ہی دور کا عزیز کسی سے بھی نہیں ایک بات اور بتا دوں میں عمر بھر پاکستان رہنے کا فیصلہ کر چکی ہوں۔"

سوہا نے بڑی صفائی سے جھوٹ بولا

"فی الحال مجھے واپس نہیں جانا یہاں رہ کر اپنی تعلیم مکمل کرنی ہے پھر لندن جا کر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا ہے۔"

سوہا کا پلان وقت طلب لیکن مثبت تھا۔

"البتہ میرے پاس تمہارے لئے ایک اچھی آفر ہے۔"

سوہا اب دوسروں کی نفسیات سے کھیلنے کا ہنر اچھی طرح جان چکی تھی وہ سمجھتی تھی نوفل کی محبت اس سے زیادہ غیر ملکی شہریت سے ہے اس لئے اس نے اپنی چال بڑے کمال سے چلتے ہوئے آگے بڑھائی۔

"کون سی آفر میں سمجھا نہیں۔"

نوفل سمجھ چکا تھا سوہا اس سے شادی نہیں کرنا چاہتی اس لئے منتظر تھا اس کی اگلی آفر کیا ہوگی۔

"تم ستائش سے شادی کر لو۔"

سوہا نے اپنا پانسہ نوفل کی کورٹ میں پھینک دیا۔ اس کی بات سنتے ہی نوفل چونک اٹھا جب کہ وہ مسلسل بول رہی تھی۔

"آپ پلیز میرے ساتھ محبت کارڈ مت کھیلنا کیونکہ میں جانتی ہوں کہ ہر محبت ضرورت کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے۔ بے شک وہ سگے رشتوں میں ہی کیوں نہ ہو۔"

اس کی زبان میں اپنی ماں کا بخشا ہوا تجربہ بول رہا تھا مگر نوفل کے لئے سوہا کی آفر اس قدر غیر متوقع تھی کہ وہ سمجھ نہ پایا کیا جواب دے۔

"ستائش سے شادی مجھے کیا فائدہ دے گی۔"

وہ بہت سوچ کر بولا۔

تمہارے لئے یہ ایک فائدہ مند سودا ہے دیکھو نوفل یہاں رہتے ہوئے میں تمہاری تمام مشکلات جان چکی ہیں تمہیں اپنا مستقبل بنانے کے لئے کسی سہارے کی ضرورت ہے اور مجھے ستائش کے لئے ایک ایسا حساس بندہ چاہئے جو پاپا کے علاوہ ستائش کو بھی سمجھ سکے یقین جانو تم ستائش سے شادی کر کے وہ سب کچھ حاصل کر لو گے جو تمہیں چاہیے۔ تمہاری شکل میں مجھے بھی ایک اچھا دوست مل جائے گا اس کے علاوہ تمہارے پاس کوئی دوسرا بہترین آپشن نہیں ہے اچھی طرح سوچ لو ورنہ تمہاری عمر انہیں گلیوں میں سڑ کر گزر جائے گی۔"

اپنی بات ختم کر کے سوہا اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ستائش سے شادی تمہارے لئے ایک منافع بخش سودا ہے جو موجودہ حالات میں تمہیں بہت فائدہ دے گا۔"

"ٹھیک ہے مجھے سوچنے کے لئے کچھ وقت دو۔"

"سوچ لو لیکن یاد رکھنا وقت کبھی بھی اپنا نہیں ہوتا ایسا نہ ہو سوچنے میں ہی یہ وقت تمہارے ہاتھ سے نکل جائے۔"

یہ کہہ کر سوہا رکی نہیں کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل گئی اور اپنے پیچھے نوفل کو گہری سوچ میں ڈوبا چھوڑ گئی۔

✧✧✧

"بہت ہو گیا اس پاگل کو اپنے ساتھ واپس لے کر جاؤ اب ہم اسے مزید برداشت نہیں کر سکتے۔"

کمر پر دونوں ہاتھ رکھے باسمہ کی ساس

داخلی دروازے کے عین درمیان اس طرح کھڑی تھی کہ حریم اور باسمہ گھر کے اندر داخل نہ ہو سکیں۔

”کیسی ماں ہو تم اپنی بیٹی کو کام کاج کوئی سکھایا نہیں سارا دن پڑی بستر توڑتی رہتی ہے گھر داری سکھانے بنا اپنا عذاب ہمارے سروں پر مسلط کر دیا ناکارہ اور نکمی لڑکی۔ نہ کام کی نہ کاج کی۔“

میرا اونچی آواز میں چلا رہی تھی اس نے جس مقصد کے لئے اپنے بیٹے کی شادی کی تھی جب وہی پورا ہوتا نظر نہ آئے تو پھر لحاظ و مروت کیسا اس لئے وہ ساری رشتہ داری بھول کر جو بولنے پر آئی تو بولتی ہی چلی گئی۔ حریم نے گھبرا کر ایک نظر پوری گلی میں دوڑائی اور دل ہی دل میں شکر ادا کیا گلی تقریباً خالی تھی اس وقت کوئی اس کی بے عزتی نہیں دیکھ رہا تھا اس لمحہ میرا کی چلتی زبان سن کر اس کا دل چاہا اپنے ساتھ کھڑی باسمہ کا گلا دبا دے جس کی خاطر وہ اس دو ٹکے کی عورت کی اتنی باتیں سن رہی تھی وہ نہیں جانتی تھی میرا دل میں کدورت رکھنے والی عورت تھی جو نکاح والے دن حریم کی طرف سے ہونے والی اپنی بے عزتی کا بدلہ اس وقت لے رہی تھی جس میں باسمہ کا کوئی قصور نہ تھا۔ حریم کے پاس فی الحال اس کی بکواس سننے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا اس وقت ہر حال میں میرا کو رام کرنا اس کی مجبوری تھا اس نے بڑی مشکل سے اپنا غصہ دبایا زبردستی مسکرائی اور نہایت شاطرانہ لہجہ میں بولی۔

”میں تو آج تم سے خاور کے کاغذات لینے آئی تھی تاکہ کل ہی عبدالکریم کو بھیج دوں کیونکہ اس نے خاور کی امیگریشن کا کام شروع کر دیا ہے مگر تم تو یہاں سب کچھ ختم کرنے پر تلی بیٹھی ہو تو چلو جیسے تمہاری مرضی۔ اللہ حافظ۔“

پانی کا ایک گھونٹ پیے بنا وہ جس طرح آئی تھی ویسے ہی باسمہ کا ہاتھ تھامے واپس جانے کے لئے مڑی ہی تھی کہ میرا کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

”ارے بہن اندر آجاؤ آج صبح سے ہائی بلڈ پریشر نے دماغ خراب کر رکھا ہے اس لئے غصہ آگیا تم ذرا اسی بات پر ناراض ہو کر چل دیں۔“

حریم نے چلتے چلتے جو لالچ کا پھندا پھینکا تھا وہ سیدھا نشانے پر جا لگا اور اس کی بات سنتے ہی میرا گڑبڑا کر دروازے کی چوکھٹ سے ہٹ گئی حریم نے میرا کی تمام باتوں کو ان سنی کر دیا وہ آگے کی جانب بڑھ گئی جب میرا دروازے سے باہر نکل کر اس کے سامنے آگئی۔

”چلو اب معاف کر دو۔“

میرا نے حریم کو بازو سے پکڑ کر روک کر پینترا بدلنا یہ محاورہ آج حریم کی سمجھ میں آیا اور وہ مسکرا دی۔

”بس اب غصہ تھوک دو اور کھانا کھا کر جانا۔“

حریم کو بازو سے پکڑ کر وہ اپنے گھر کے اندر لے گئی اس نے خاور کو فون کر کے حریم کے لئے بھنا گوشت اور تندوری روٹی منگوائی اور اس کی خوب خاطر تواضع کی۔ واپسی میں حریم بھی خاور کے کاغذات ضرور لے آئی لیکن اب بھی خاور کو ہانگ کانگ بھیجنے کا اس کا کوئی ارادہ نہ تھا جس کی بڑی وجہ خاور کی لالچی فطرت تھی جو وہ سمجھ چکی تھی اس کے علاوہ میرا کے ہاتھوں ہونے والی اپنی بے عزتی وہ کبھی نہ بھول سکتی تھی۔ ان دو عورتوں کی فضول انا کے درمیان باسمہ کی زندگی تباہ ہو رہی تھی جس کا احساس اس کی اپنی ماں کو بھی نہ تھا۔

✦✦✦

عبدالرحمن نے کھانے کے خالی برتن پرے سرکائے ہی تھے کہ مسفرہ نے ٹھنڈے پانی کا گلاس اس کے سامنے کر دیا۔ عبدالرحمن چونکا اسے صبح سے لگ رہا تھا مسفرہ کچھ کہنا چاہتی ہے شاید اسے پیسوں کی ضرورت پڑ گئی تھی کیونکہ وہ ہمیشہ اپنے مطلب کے وقت ہی رحمن کی یوں خدمت کیا کرتی خالی گلاس مسفرہ کی جانب بڑھاتے ہوئے وہ ہنس کر بولا۔

''آج مجھ ناچیز سے کیا کام پڑ گیا۔''

''لو جی اب میں بنا کام تمہارے پاس بھی نہیں بیٹھ سکتی۔''

مسفرہ برا مان گئی۔

''ارے بھلی مانس تم خواہ مخواہ ناراض ہو رہی ہو کچھ پیسے چاہئیں تو بتا دو۔''

''نہیں۔''

مسفرہ نے انکار میں سر ہلایا۔

''اب مجھے تمہارے ان ٹوٹے پھوٹے چند پیسوں کی ضرورت نہیں رہی''

مسفرہ کے لہجے نے عبدالرحمان کو چونکا دیا۔

''خیر تو ہے رات کوئی خواب شاب دیکھ لیا ہے۔''

عبدالرحمن حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''وہ دن دور نہیں رہ گیا عبدالرحمن جب میرا شہزادہ پتر ہانگ کانگ جا کر نوٹ چھاپے گا میں بھی حریم کی طرح اونچی اڈی کی جوتی پہن کر ناک منہ چڑھا کر دوسروں سے بات کروں گی۔''

''لو بھائی بلی کو خواب میں چھیچھڑے''

عبدالرحمن ہنس کر بولا۔

''اب پتر گیا نہیں اور تو نے خوابوں کے تانے بانے بننا شروع کر دیے بھلی مانس اتنے اونچے اونچے خواب نہ دیکھا کر۔ جب یہ ٹوٹتے ہیں تو بندہ زور سے دھڑام کر کے آسمان سے نیچے آتا ہے اور سارا ہی ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے کچھ باقی نہیں رہتا۔''

بات کرتے کرتے عبدالرحمن سنجیدہ ہو گیا تھا۔

''میں وہ خواب نہیں دیکھتی جو مجھے چکنا چور کر دیں۔''

مسفرہ کا لہجہ پراعتماد تھا۔

''فکر نہ کرو حریم بھابھی تمہیں خود ستائش کا رشتہ دے گی بس چند دن انتظار کر لو۔''

اس کے ساتھ ہی مسفرہ نے عبدالرحمن کو سوہا اور نوفل کے درمیان ہونے والی گفتگو کا متن سنا دیا۔

''سوہا نے کہا اور تم نے مان لیا۔''

عبدالرحمن نے بیوی کی جانب دیکھا جس کا چہرہ اچھے دنوں کے تصور سے کھلا ہوا تھا۔

''خاور کو بھول گئی ہو کیا؟''

رحمان نے بیوی کو سمجھانا چاہا۔

''ہاں اور تم بھی بھول جاؤ اسے۔''

مسفرہ نے اطمینان سے کہا۔

''ہم ان کے جیسے بیوقوف نہیں ہیں اس لئے نوفل وہ تمام شرائط منوا کر نکاح کرے گا جن کا سوہا نے اس سے وعدہ کیا ہے''

''وعدہ سوہا نے کیا ہے اس کی ماں نے نہیں۔ سوہا ابھی بچی ہے اس کی ماں کبھی بھی کوئی ایسا وعدہ پورا نہیں کرے گی میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔''

عبدالرحمن بے یقین تھا۔

''چلو پھر تم انتظار کرو نوفل کے ہانگ کانگ جا کر فون کرنے کا۔''

طنزیہ انداز میں کہتی مسفرہ برتن اٹھا کر کچن کی جانب بڑھ گئی۔ عبدالرحمان سوچ رہا تھا بھلا رشتے بھی کبھی شرائط پر جوڑے جاتے ہیں بھلا

وہ رشتہ ہی کیا جو شرط کی سیڑھی پر کھڑا کر دیا جائے ذرا جو سیڑھی یہاں وہاں ہوئی رشتہ ٹوٹ گیا مگر یہ سب باتیں مسفرہ کو سمجھانا بے کار تھا۔

✧✧✧

"میں تم سے ناراض ہوں"

دیوتا نے باسمہ کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

"تم مجھے بھولتی جا رہی ہو۔"

"میں......"

باسمہ کو حیرت ہوئی۔

"ہاں تم"

دیوتا نے مسکرا کر اس کے سینہ پر اپنی شہادت کی انگلی رکھی۔

"میں چاہتا ہوں تم خوش رہو مگر ایسا نہیں ہے تم دن بدن اداسیوں میں ڈوبتی جا رہی ہو۔ تمہارے چہرے کی مسکراہٹ گم ہو گئی ہے۔ تمہاری آنکھیں غمگین رہتی ہیں۔ تمہیں یوں گم صم دیکھ کر مجھے تکلیف ہوتی ہے۔"

وہ بول رہا تھا اور باسمہ سن رہی تھی وہ اسے اپنی اذیت کے ہر لمحہ کے بارے میں بتانا چاہتی تھی ان دنوں وہ کرب کے جس سمندر میں ڈوبی ہوئی تھی اس کا ایک ایک لفظ محبت کے اس دیوتا کے سینے میں اتارنا چاہتی تھی۔ میرا اور خاور کے مارے جانے والے طنز کے نشتر اسے دکھانا چاہتی تھیں جنہوں نے اس کا وجود چھلنی کر دیا تھا اس کی آزادی اور معصومیت ختم کر دی تھی اب تو وہ پابند زنجیر تھی سانس بھی دوسروں کی مرضی سے لیتی تھی مگر وہ چاہ کر بھی نہ بول سکی اس کے الفاظ کہیں گم ہو گئے۔ جب دیوتا نے باسمہ کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے کھڑا کیا۔

"اور قص کریں اور ان خوشیوں کو تلاش کریں جو تمہارے اندر کہیں کھو گئی ہیں"۔

وہ اس کے دل کا حال جانتا تھا خوشی سے نہال باسمہ اس کی بانہوں میں جھول رہی تھی جب اسی پل میرا نے کمرہ کا دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔ جب سامنے نظر آنے والے منظر نے اس قدر خوف زدہ کر دیا کہ وہ دروازہ کی دہلیز پر ہی منجمد ہو گئی۔

✧✧✧

جب سے عبدالرحمن اور مسفرہ نے ستائش کے رشتہ کی بات کی تھی حریم کچھ الجھی ہوئی تھی۔ اسے اس رشتہ پر کوئی اعتراض نہ تھا نوفل گھر کا دیکھا بھالا بچہ تھا جو حریم کو پسند بھی تھا اعتراض اسے نوفل کی شرائط پر تھا جس سے حرص و لالچ کی بو آ رہی تھی۔ یہ ہی وجہ تھی کہ رات اس نے عبدالکریم کو فون کر کے نوفل کے رشتہ کا بتایا تو ساتھ ہی اس کی شرائط سے بھی آگاہ کر دیا۔

"مجھے لگتا ہے تمہارے بھائی، بھابھی کی نظریں بھی ہمارے پیسے پر ہیں اور یہ سب ہمارا بیٹا نہ ہونے کا نتیجہ ہے جس کا فائدہ نکّے نکّے کے لوگ اٹھا رہے ہیں۔ میرا ہو یا مسفرہ دونوں کی کوشش ہے اپنے بیٹوں کے ذریعہ ہماری جائیداد پر قابض ہو جائیں کاش اللہ ہمیں بھی ایک بیٹا دیتا تو یہ دن نہ دیکھنا پڑتا بات کے اختتام پر حریم کا وہی پرانا رونا تھا جسے عبدالکریم نے قطعی نظرانداز کر دیا اور اسے سمجھاتا ہوا بولا۔

"اگر وہ لالچ کرتے تو سب سے پہلے یہ پورا مکان اپنے نام کروا لیتے جس کا فائدہ بھی نوفل کو ہی تھا لیکن انہوں نے کبھی مکان کا ذکر نہیں کیا اس کا مطلب یہ ہوا نوفل کی شرائط کا تعلق لالچ سے نہیں ہے بلکہ وہ بھی ایک عام آدمی کی طرح اپنا مستقبل محفوظ کرنا چاہتا ہے جس پر مجھے کوئی اعتراض نہیں ویسے بھی وہ کوئی غیر نہیں ہے میرا اپنا بیٹا ہے اگر سیدھا آ جائے تو بھائی کی اولاد بھی اپنی ہی ہوتی ہے۔

''وہ تو سب ٹھیک ہے مگر ایسا نہ ہو کہ اس رشتہ کے بعد میرا اور مسفرہ دونوں مل کر ہمارا جینا حرام کر دیں۔''

حریم کا خدشہ اس کی زبان پر آ گیا۔

''اللہ مالک ہے ایسا ہوگا تو پھر دیکھ لیں گے تم خود سوچو ستائش جیسی لڑکی جو ڈر گز گیتی رہی ہے اس کی شادی کرنا کس قدر مشکل کام ہے ایسے میں اگر نوفل کسی لالچ کے تحت بھی یہ رشتہ کرنے کو تیار ہے تو میرا خیال ہے ہمیں انکار نہیں کرنا چاہئے۔''

حریم خاموش ہو گئی وہ سمجھ گئی۔

عبدالکریم بھی نوفل کو اپنے بیٹے کی جگہ دینا چاہتا ہے اور جب اس کا اپنا مقصد بیٹیوں کی شادی کے فرض سے فارغ ہونا تھا تو نوفل پر اعتراض بلا جواز تھا یہی سوچتے ہوئے اس نے نوفل کے رشتے کی حامی بھر لی۔

✧✧✧

''ستائش کا بھی رشتہ طے ہو گیا ہے۔''

میکائیل کو فون پر یہ اطلاع دیتی سوہا بہت مطمئن تھی اسے نوفل پر بہت بھروسہ تھا وہ ستائش کو پریشان نہیں کرے گا اور اس کے تمام معاملات سنبھال لے گا۔

''میں نے بتایا تھا نہ نوفل میرا کزن ہے اور بہت اچھا لڑکا ہے اس کا ستائش سے نکاح ہوتے ہی وہ پاپا کے پاس چلا جائیگا کاروبار میں ان کی ہیلپ کرے گا۔ ان کی دیکھ بھال بھی کرے گا پھر ستائش بھی اس کے ساتھ چلی جائے گی نوفل نے مجھ سے وعدہ کیا ہے وہ اس وقت تک رخصتی کی ضد نہیں کرے گا۔ جب تک ستائش اپنی تعلیم مکمل نہ کر لے مجھے امید نوفل کی توجہ اور محبت ستائش کو بدل دے گی۔''

اس رشتہ سے سوہا بہت مطمئن تھی۔

''اور تم؟؟''

اس کی ساری گفتگو میں میکائیل کے لئے صرف ایک لفظ اہم تھا ''تم'' جس کا اظہار اس نے فوراً کر بھی دیا۔

''ظاہر ہے مجھے بھی واپس آنا ہے اس لئے تو یہ سب کچھ کر رہی ہوں بس ستائش کے لئے ہی میں بھی واپس جانے کی کوشش شروع کرتی ہوں۔''

''واپس آنے کے لئے تو تمہیں بھی کسی سے نکاح کرنا پڑے گا۔''

میکائیل نے اپنے خدشہ کا اظہار کر دیا۔

''میں جلد ہی تمہیں اپنے پیپرز بھیج دوں گی تم پہلے میری جاب کا کچھ کرو تا کہ میں اپنی تعلیم مکمل کر سکوں کیونکہ واپس آ کر مجھے اپنی ممی کے ساتھ نہیں رہنا یہ تو طے ہے۔''

وہ میکائیل کے خدشہ کو نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔

میکائیل جانتا تھا ماں کے سلسلہ میں اس کے منفی رویے کی وجہ باسمہ تھی۔ اپنی ماں کے باسمہ کے ساتھ روا رکھے جانے والے سلوک نے سوہا کو خاصا دلبرداشتہ کر دیا تھا۔

''میں نے تمہیں پہلے بھی کہا تھا میں ہر جگہ تمہارے ساتھ ہوں بس تم ہمیشہ مجھ پر بھروسہ رکھنا۔''

''بھروسہ ہے تو تم سے اپنے دل کی ہر بات شیئر کرتی ہوں۔''

سوہا ہنس دی اور اس کی ہنس سے میکائیل مطمئن ہو گیا وہ سمجھ گیا تھا نوفل اور ستائش کے رشتہ نے سوہا کی کافی پریشانیاں دور کر دی ہیں۔

✧✧✧

اگلے ماہ ستائش اور نوفل کا نکاح تھا جس کی تیاری دونوں طرف شروع ہو چکی تھی۔ حریم کافی

خوش تھی کہ ستائش نے اس سلسلہ میں کوئی احتجاج نہیں کیا وہ سب تو ستائش کی طرف سے کسی ہنگامہ کی توقع کر رہے تھے مگر خلاف توقع وہ بالکل خاموش اور اپنے حال میں مست تھی اس نے پہلے مرحلہ میں ہی سب کے خدشات غلط ثابت کر دیے آج حریم اور سوہا منگنی کی شاپنگ کے لئے بازار جا رہی تھیں جب راستہ میں خاور کا فون آ گیا جسے ریسیو کرنے سے پہلے حریم اپنے فون کا اسپیکر آن کرنا نہ بھولی۔

''اسلام علیکم آنٹی''

حریم کے فون کان سے لگاتے ہی خاور کی آواز قریب بیٹھی سوہا کو سنائی دی تو وہ فوراً ہی اپنی ماں کی طرف متوجہ ہوئی۔

''وعلیکم السلام خیریت ہے آج تم نے اس وقت فون کر لیا۔''

خاور سے بات کرتے وقت حریم کا لہجہ ہمیشہ طنزیہ ہوتا تھا۔

''خواب میں دیکھا تھا میں جہاز کا سفر کر رہا ہوں تو سوچا آپ سے پوچھ لیا جائے ایسا نہ ہو کہ آنٹی جی اچانک فون کر کے بتائیں، بیٹا کل تمہاری فلائیٹ ہے۔''

خاور کی بات سن کر حریم نے سوچا بی بی جان نے سچ کہا تھا یہ ماں بیٹا سیر کو سوا سیر ہیں۔''

''کہاں گم ہو گئیں آنٹی میں نے کوئی ایسی بات تو نہیں کی جو آپ کی سمجھ میں نہ آئے۔''

''بیٹا اتنی چھوٹی سمجھ نہیں ہے میری شروع دن سے ہی سب کچھ سمجھ رہی ہو۔''

بظاہر حریم کا لہجہ بہت نرم تھا مگر اس کے چہرے پر چھائی سختی سوہا کو صاف دکھائی دے رہی تھی۔

''باسمہ کہاں ہے؟''

حریم نے خاور کی باتوں کو نظر انداز کر دیا۔

''اس نے کہاں جانا ہے کمرہ کے کسی کونے میں پڑی سو رہی ہو گی اسی کام کے لئے تو آپ نے اس کی شادی کی تھی۔''

''ایک دو دن میں تمہاری طرف چکر لگاتی ہوں پھر بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔''

اللہ حافظ کہہ کر حریم نے فون بند کر دیا صاف لگ رہا تھا کہ اس نے خاور سے جان چھڑوائی ہے۔

''الو کا......''

حریم کی زبان پر گالی آتے آتے رہ گئی۔

''اتنے لالچی لوگ پہلے دن سے ہی حرص لالچ نے ان کی آنکھیں بند کر رکھی ہیں اچھا ہوا میں اس لڑکے کو اپنے ساتھ نہیں لے گئی ورنہ تو یہ وہاں جا کر ہمارا سب کچھ تباہ و برباد کر دیتا۔''

بڑبڑاتی حریم نے موبائل بند کر کے خاور کا نمبر بلاک کیا اور فون اپنے ہینڈ بیگ میں ڈال دیا جب کہ سوہا کھڑکی سے باہر بھاگتے دوڑتے نظارے دیکھنے میں مصروف ہو گئی۔

✦✦✦

سوہا پودوں کو پانی دے رہی تھی جب نوفل کی موٹر سائیکل کی آواز سنائی دی اس نے جلدی سے پانی کا نلکا بند کر کے پائپ صحن میں پھینکا ہی تھا کہ نوفل بیرونی گیٹ کھول کر اندر داخل ہوا۔ اس کی نظر جیسے ہی سوہا پر پڑی اپنی جگہ تھم گیا۔ اسے یاد آیا وہ سوہا سے محبت کرنے لگا تھا یا شاید ابھی بھی کرتا تھا۔ وہ آگے بڑھا اور سوہا کے سامنے جا کر رک گیا۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرا دی میں تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی۔ تمہارا شکریہ نوفل تم نے مشکل وقت میں میرا ساتھ دیا۔

نوفل بنا جواب دیئے اک ٹک اسے دیکھے گیا۔

"ستائش کو لے کر میں بہت پریشان تھی ایسے میں تم سے بہتر مددگار مجھے دکھائی نہ دیا۔"

"اٹس او کے"

نوفل کا لہجہ عام سا تھا۔

"میں نے جو کیا وہ تم پر احسان نہیں بلکہ احسان تو تمہارا ہے جس کی مدد سے مجھے وہ حاصل ہونے والی ہے جس کا تصور بھی میرے پاس نہ تھا۔" وہ ابھی بھی سوہا کو دیکھ رہا تھا۔

"جانتی ہو سوہا اس منافع بخش سودے میں محبت لٹائی ہے میں نے اپنی۔ محبت کے معاملہ میں تو ویسے بھی میری قسمت خراب ہے جو ہر بار یہ مجھ سے دامن چھڑوا کر نکل جاتی ہے۔"

"میری دعا ہے تمہیں زندگی میں وہ سب کچھ حاصل ہو جس کی تم خواہش رکھتے ہو"

سوہا اس کی جانب دیکھتے ہوئے مسکرائی۔

"شاید اس سب کچھ میں محبت شامل نہ ہو کہ یہ جذبہ بار بار دلوں کو نہیں چھوتا"

"مجھے یقین ہے تمہارا دل ایک بار پھر محبت سے آباد ہوگا یہ میری دعا ہے۔"

سوہا کے لہجے میں محبت و خلوص دونوں شامل تھا۔

"کاش ایسا ہو جائے"

اسی وقت برآمدہ کا دروازہ کھول کر ستائش باہر نکل کر چلائی۔

"سوہا بی بی جان بلا رہی ہے۔"

نوفل نے پلٹ کر دیکھا ستائش آواز لگا کر واپس جا چکی تھی۔

"ستائش بہت اچھی ہے اس کا خیال رکھنا ہمیشہ خوش رہو گے۔"

"میرے لئے تم سے اچھا کوئی نہیں ہے۔"

اتنا کہہ کر نوفل رکا نہیں تیز تیز قدموں سے چلتا سیڑھیوں کی جانب بڑھ گیا۔ پیچھے کھڑی سوہا نے دل سے اس کی خوشیوں کی دعا کی جانتی تھی اس کی خوشیوں کے ساتھ اس کی بہن کی خوشیاں وابستہ ہیں۔

✧✧✧

آج اتوار کا دن تھا حریم اور سوہا دن چڑھے تک اطمینان سے سوتی رہیں جب کہ ستائش صبح سویرے میری کے ساتھ پکنک کے لئے اس کے فارم ہاؤس جا چکی تھی اس کی ضدی طبیعت کے باعث اسے روکنا یا کچھ کہنا فضول تھا اس لئے اب حریم اور سوہا نے اس سے الجھنا چھوڑ دیا تھا کیونکہ جب سے اس کا نوفل کے ساتھ رشتہ ہوا تھا حریم کے علاوہ سوہا بھی کافی مطمئن ہو گئی تھی۔ تقریباً بارہ بجے کے قریب بی بی جان کے جگانے پر سوہا اٹھی اور فریش ہو کر لاؤنج میں آئی جہاں ہر طرف دیسی گھی کی سوندھی سوندھی خوشبو پھیلی ہوئی تھی اس نے کچن میں جھانکا ثمینہ آنٹی مولی والے پراٹھے تیار کر رہی تھیں۔

"اپنی ماں کو بھی بلا لو آج تم دونوں کو دیسی ناشتہ کرواؤں۔"

بی بی جان نے ہاتھ میں پکڑا دہی کا باول ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔

"یہ زیرہ والا دہی آج میں نے خود بنایا ہے خاص طور پر تمہارے لئے۔"

بی بی جان جانتی تھیں اسے دہی بہت پسند ہے۔ آنٹی ثمینہ نے گرم گرم پراٹھے اس کے سامنے لا کر رکھ دیا اسی وقت اندرونی کمرے کا دروازہ کھول کر حریم بھی لاؤنج میں داخل ہوئی۔

"مجھے بلیک کافی کے ساتھ ایک سلائس سینک کر لا دو۔"

کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے اس نے ثمینہ کو ہدایت دی۔

"ممی پراٹھے بہت مزے کے ہیں آپ بھی

کھا کر دیکھیں۔ آج ڈائٹنگ کو بھول جائیں۔"

پراٹھے اور دہی سے لطف اندوز ہوتی سوہا نے اپنی ماں کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

"ویسے بھی میں سوچ رہی ہوں آج چار بجے تک ڈرائیور کے ساتھ سی ویو چلتے ہیں، وہاں ایک گھنٹہ واک کریں گے اس طرح ہماری فالتو کلوریز ضائع ہو جائیں گی۔ ٹھیک ہے نا بی بی جان۔"

بی بی جان نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

"ٹھیک ہے میرے لئے بھی پراٹھا ہی لے آؤ ثمینہ۔"

سوہا کو امید نہ تھی اس کی ماں اتنی جلدی مان جائے گی کیونکہ حریم نے کافی عرصہ سے پراٹھا کھانا بالکل چھوڑ رکھا تھا۔

بس پھر آج کے لئے ناشتہ کافی ہے آنٹی آپ لنچ مت بنایئے گا ہم چار یا پانچ بجے تک سی ویو جا رہے ہیں۔

ثمینہ کو ہدایات دیتی وہ کمرے میں آ گئی تا کہ دوپہر کا وقت سکون سے اے سی میں گزار سکے وہ نہیں جانتی تھی کہ کچھ دیر میں وہ ہونے والا ہے جس کا اس نے تصور بھی نہ کیا تھا۔ ایک ایسا حادثہ ان کے گھر کے دروازہ پر دستک دینے والا تھا جس نے اس کی باقی زندگی کا سکون درہم برہم کر دیا۔

✧✧✧

"ادھر آؤ میرے پاس"

خاور نے کمرہ میں داخل ہوتے ہی سامنے بیٹھی باسمہ کو آواز دی جو اپنے ٹیب میں گم شاید کوئی گیم کھیل رہی تھی۔ خاور کی آواز سن کے اس نے گھبراتے ہوئے اپنا سر اٹھایا خاور اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

"ٹانگیں دباؤ میری"

خاور نے اسے نیا حکم نامہ جاری کیا وہ لرزتی کانپتی اس کے قدموں میں آن بیٹھی۔ سی پل کمرے کا دروازہ زور دار آواز سے کھولتی میرا اندر داخل ہوئی۔ خاور نے دیکھا وہ بہت غصے میں تھی۔

"کیا ہوا اماں سب خیر تو ہے نہ"

وہ بستر سے اٹھ بیٹھا۔

"خیر کہاں"

باسمہ کو گھورتی میرا نے بیٹے کو جواب دیا۔

"تمہاری ساس نے تمہیں نہیں بتایا اس نے نوفل کے پیپرز جمع کرا دیئے ہیں اور سنا ہے کہ وہ ستائش کے نکاح کے فوراً بعد چچا کے پاس چلا جائے گا تا کہ ان کا کاروبار سنبھال سکے جس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم تو بیوقوف ٹھہرے جو اس عورت نے اپنی پاگل لڑکی ہمارے متھے منڈھ دی۔"

"تمہیں یہ سب کس نے بتایا"

خاور نے اٹھتے ہوئے باسمہ کو زور دار لات رسید کی وہ بستر سے نیچے جا گری۔

"عصفرہ کا فون آیا تھا بہت خوش تھی اس کے بیٹے نے نکاح سے پہلے اسامپ پیپر پر ساری شرطیں لکھوائی ہیں۔ وہ بالشت بھر کا لڑکا تم سے زیادہ سیانا نکلا"

"میں سمجھ گیا اماں اس کی ماں خود کو بہت ہوشیار سمجھتی ہے۔"

خاور نے بستر سے اٹھ کر ایک اور لات باسمہ کی کمر میں رسید کی۔ خوف اور تکلیف کی شدت سے وہ رونے لگی۔

(باقی اگلے ماہ)

یارِ من

بشریٰ سیال

چوتھی قسط

ناولٹ

محمد امیر اور عائشہ گل نے امی کو تمام شاپنگ دکھائی تھی۔ انہیں سب کچھ بہت پسند آیا تھا۔ مگر وہ ان چیزوں سے زیادہ محمد امیر کی عائشہ گل سے محبت اور چاہت پر خوش تھیں۔

''اتنا سب کچھ لینے کی کیا ضرورت تھی بیٹا''۔ وہ مسکراتے ہوئے محمد امیر کو دیکھنے لگیں۔

''ضرورت تو تھی نہ خالہ جان'' اس نے عائشہ گل کے سنجیدہ چہرے کی جانب دیکھا۔

''آپ تو ایسے مت کہیں، میری بیوی کو تو پہلے ہی کوئی شوق نہیں ہے شاپنگ کا خالہ جان۔ ورنہ لڑکیاں تو شاپنگ کرتے کبھی نہیں تھکتیں اور یہ محترمہ بہت جلد تھک گئیں'' عائشہ گل اس کے لفظ ''بیوی'' پر کچھ جھینپ سی گئی۔

''چائے پئیں گے آپ!'' عائشہ گل کو ڈر تھا کہ وہ امی کے سامنے نہ جانے مزید کیا کہے، اس لئے اس نے وہاں سے فرار ہونا ہی مناسب

''شیور!'' اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''امی آپ!'' وہ ان سے پوچھنے لگی۔

''نہیں بیٹا۔ اس وقت چائے پی لی تو نیند نہیں آئے گی'' امی نے منع کیا۔ وہ وہاں سے اٹھ کر کچن میں آ گئی۔

''محمد امیر!'' اس کے وہاں سے جاتے ہی امی نے اسے مخاطب کیا۔

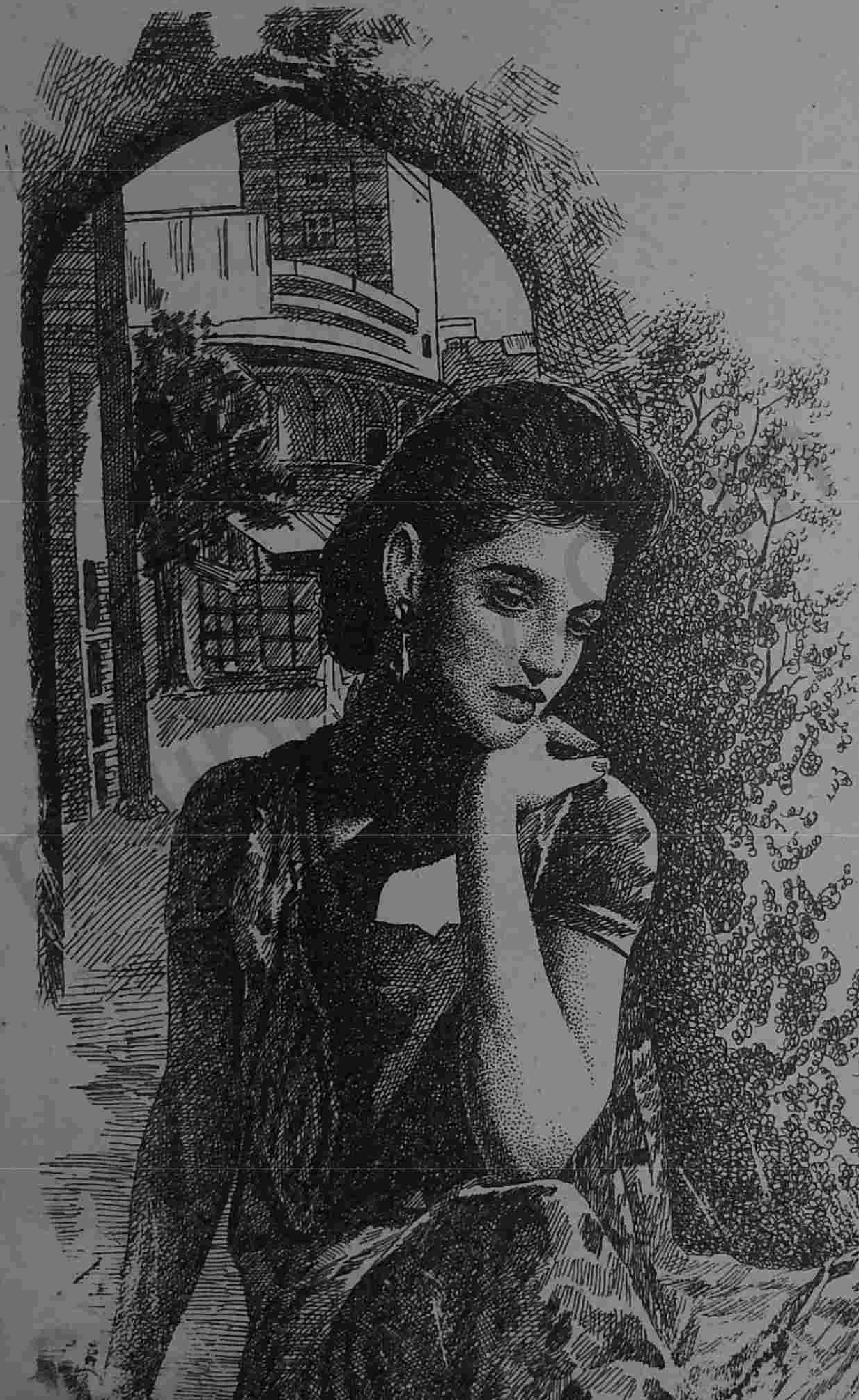
''جی خالہ جان''۔ وہ ان کی جانب پلٹا۔

''سب کچھ بہت خوبصورت اور قیمتی ہے۔ میری بیٹی کا اتنا خیال رکھنے کے لئے شکریہ''۔ محمد امیر ان کے لئے بہت خوبصورت سی شال لایا تھا اور وہ شاپنگ بیگز میں سے وہی ڈھونڈ رہا تھا۔

''کیوں شرمندہ کرتی ہیں خالہ جان''۔ اس نے شال نکال کر ان کی جانب بڑھائی۔

''یہ آپ کے لئے''۔





"بہت شکریہ بیٹا!" انہوں نے شال پکڑ لی۔

"مگر میں ایک بات کہنا چاہتی ہوں بیٹا"۔ انہوں نے محتاط انداز سیاس کی جانب دیکھتے ہوئے الفاظ کو ترتیب دیتے ہوئے کہا۔

"فرمایئے خالہ جان۔"

"عائشہ گل دولت، روپے پیسے، کپڑے اور جوتے سے متاثر ہونے والی لڑکی نہیں ہے بیٹا۔" محمد امیر ان کی بات سمجھ گیا تھا اور اتنا تو وہ عائشہ گل کو جان بھی گیا تھا۔

"دولت تو مُراد کے پاس بھی بہت تھی، شائد وہ اس سے محبت بھی کرتا ہو۔ مگر اسے عزت کرنا نہیں آتا۔ اور عائشہ گل اپنی عزت اور اناء پر چوٹ برداشت نہیں کر سکتی"۔ وہ کیا سمجھا رہی تھیں، محمد امیر اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔

"آپ میری طرف سے بے فکر رہیں۔ آپ کو کبھی شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔" اس نے انہیں مطمئن کرنا چاہا۔

"میں عائشہ گل سے محبت کرتا ہوں خالہ جان۔ اور جہاں محبت ہوتی ہے، وہاں عزت تو لازمی ہوتی ہے نہ۔ میرے دل میں اس کی بہت عزت ہے۔" امی اس سے بے حد خوش تھیں۔ انہوں نے تو خواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ ان کی بیٹی کا نصیب اتنا اچھا ہوگا۔ انہیں محمد امیر بے حد پسند تھا۔

"میں عائشہ گل کے لئے بہت فکر مند رہتی تھی۔ مگر اب بے فکر ہو کر مروں گی کہ میری بیٹی ایک مضبوط اور محفوظ پناہ میں ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے گویا ہوئیں۔

"کیسی باتیں کرتی ہیں خالہ جان"۔ وہ مصنوعی خفگی سے بولا۔

"ابھی تو آپ نے ہماری شادی کرنی ہے۔ ہمارے بچوں کو گود میں کھلانا ہے۔" چائے لے کر اندر آتی عائشہ گل کا جی چاہا سر پیٹ لے۔

"یہ کبھی بھی سوچ کر نہیں بولیں گے"۔ وہ دل ہی دل میں سوچ کر رہ گئی اور چائے محمد امیر کے سامنے رکھ دی اور خود نماز پڑھنے چلی گئی۔

✧✧✧

دن بھر کا تھکا ہارا ملائشیا اب سونے کو بے تاب تھا۔ علیزے ٹرنکولائزر کے زیر اثر بہت دیر تک سوتی رہی تھی۔ ماما کئی بار اسے دیکھ کر گئی تھیں۔

اب کی بار روم میں آئیں تو اس کے وجود میں ہلکی سی جنبش ہوئی اور وہ کسمسانے لگی۔ ماما اس کے پاس بیٹھ گئیں اور اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگیں۔

"علیزے!" انہوں نے اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔

"آنکھیں کھولو میرے بچے۔"

انہوں نے پیار سے اسے پچکارا۔ علیزے نے دھیرے دھیرے آنکھیں کھول دیں۔ کس قدر اُداسی اور ویرانی تھی اس کی آنکھوں میں۔ وہ اسے دیکھ کر رہ گئیں۔

"اٹھو، مِل کر ڈنر کرتے ہیں۔" وہ اس کے پاس سے اٹھیں اور کھڑکیوں سے پردے ہٹانے لگیں۔

"ڈِنر؟" وہ زیر لب بڑبڑائی۔

"کیا پھر سے رات ہو گئی؟" وہ خود کلامی انداز میں بولی۔ ماما واپس پلٹیں۔

"تم سارا دِن سوتی رہیں۔ میں نے بھی نہیں جگایا۔ دِن گزر گیا اور پھر سے رات ہو گئی۔" ماما اس کے پاس آ کر بیٹھ گئیں وہ اٹھی اور بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا لی۔

"دِن واقعی گزر گیا ماما! اور رات پھیل گئی۔

گھنی، سیاہ اور تاریک رات۔ بالکل میرے نصیب کی طرح سیاہ!"

اس نے پل بھر کا توقف کیا۔ ماما اس کے ملول وادا اس چہرے کو دیکھ کر رہ گئیں۔

"اور یہ رات کبھی ختم نہیں ہوگی ماما! آپ دیکھ لیجئے گا"۔ اس نے کھڑکی کے اس پار طمطراق سے ٹہلتی ہوئی رات کو دیکھتے ہوئے یاسیت سے کہا۔

"خدا نہ کرے علیزے"۔ وہ لرز کر رہ گئیں۔

"کیسی فضول باتیں کر رہی ہو۔ اٹھو، فریش ہو جاؤ"۔ وہ اس کا شانہ تھپتھپا کر اٹھتے ہوئے بولیں۔

"مجھے بھوک نہیں ہے ماما"۔ اس نے کھڑکی سے نظریں ہٹاتے ہوئے اپنے ہاتھوں کی لکیروں کو بغور دیکھتے ہوئے لاپرواہی سے کہا۔

"کیا کروں ایسا تمہارے لئے کہ تم پہلے کی طرح نارمل ہو جاؤ"۔

وہ واپس مڑیں اور اس کے سامنے آبیٹھیں اور متفکر نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے گویا ہوئیں۔

"محمد امیر سے میری بات کروا دیں ماما!" وہ منت بھرے لہجے میں بولی۔

"اسٹاپ اِٹ علیزے!" ماما کھڑی ہو گئیں اور زور سے چلائیں۔

"فار گاڈ سیک میرے سامنے محمد امیر کا نام مت لینا دوبارہ، اگر... اگر تم چاہتی ہو کہ میں زندہ رہوں۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں کہتے ہوئے منہ پر ہاتھ رکھ کر باہر کی جانب بڑھ گئیں۔

"میں جسم ہوں تو محمد امیر میری روح ہے اور اگر روح کو جسم سے الگ کریں گی تو نقصان آپ

ہی کا ہوگا ماما"۔ وہ زور سے چلائی تھی۔ مگر ماما اس کے روم سے جاچکی تھیں۔

علیزے کی حالت انہیں شدید پریشانی میں مبتلا کر رہی تھی۔ وہ کبھی سوچ بھی نہ سکتی تھیں کہ ان کی بیٹی ایک لاحاصل محبت کے لئے خود کو اس طرح خوار کرے گی۔

✧✧✧

روما شدید غصے کے عالم میں اپنے روم سے نکلی تھی۔ اس کا رخ ماما اور پاپا کے روم کی جانب تھا۔ اسے سخت طیش چڑھا ہوا تھا۔ اور اسی وجہ سے وہ بناء دستک دیئے دھاڑ سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگئی تھی۔

"مام، ڈیڈ۔" اس نے دونوں کو ایک ساتھ مخاطب کیا تھا۔ ماما تو میگزین دیکھ رہی تھیں، جبکہ پاپا کوئی فائل دیکھنے میں مگن تھے۔ دونوں ہی اسے اس طرح سامنے دیکھ کر چونکے تھے۔

"What happened بیٹا"۔ ماما نے میگزین ایک سائیڈ پر ڈال دیا اور اس سے استفسار کرنے لگیں۔

"یہ دیکھیں محمد امیر کی حرکتیں"۔ اس نے موبائل فون انہیں تھمایا۔ ماما نے سب تصویریں دیکھیں۔

"Is everyting ok?" پاپا بھی متفکر ہوئے۔

"آپ خود ہی دیکھ لیں اپنے بھتیجے کو۔" ماما نے موبائل فون انہیں کو تھمایا۔ اب وہ محمد امیر کو، عبایہ پہنے ہوئے لڑکی کا ہاتھ تھامے مال میں گھومتے دیکھ کر ورطۂ حیرت میں ڈوب گئے۔

"بیٹا اس کی کوئی فین ہوگی۔ اس میں کیا ہے ایسا جس پر تم خفا ہو رہی ہو۔" پاپا نے اسے پیار سے سمجھایا۔

"یہ سب اتنا نارمل نہیں ہے پاپا" روما زچ ہوئی۔

"بس آپ کل ہی تایا سے ہماری شادی کی بات کریں، مجھے محمد امیر کے تیور ٹھیک نہیں لگ رہے۔" وہ از حد متفکر تھی۔ وہ محمد امیر کے پاس کسی لڑکی کا کھڑے ہونا، اس سے بات کرنا برداشت نہ کر سکتی تھی، کجا کہ اس کے ہاتھ میں لڑکی کا، تھ۔ اس کا جی چاہ رہا تھا اس لڑکی کا ہاتھ توڑ دے۔

"پاپا آپ کال کریں امیر کو، اور اسے واپس بلائیں" اس نے غصے سے کہا۔

"آپ حسن بھائی سے بات کریں اور جلد شادی کی ڈیٹ فائنل کریں"۔ ماما نے کہا۔ روما کچھ دیر ان کے پاس بیٹھی رہی اور پھر موبائل فون لے کر باہر نکل گئی۔

"I will Kill you. تم ایک دفعہ واپس آ جاؤ محمد امیر۔" وہ غصے سے بڑبڑاتی ہوئی اپنے روم کی جانب بڑھی۔ اس وقت محمد امیر اس کے سامنے ہوتا تو وہ یقیناً اس کا سر پھاڑ دیتی۔

✧✧✧

رات ہر سو اپنے سیاہ بال بکھرائے گھوم رہی تھی۔ اندھیرا وادی سے کسی آسیب کی مانند چمٹ گیا تھا۔ عائشہ گل نماز اور تسبیحات سے فارغ ہو کر اپنی کتابیں لے کر بیٹھ گئی تھی۔ وہ پورے انہماک سے پڑھ رہی تھی جب ٹیرس کا دروازہ کھلا اور ٹھنڈ ہوا کا جھونکا کسی شرارتی بچے کی طرح بھاگتا ہوا اندر داخل ہوا اور نظروں سے اوجھل ہوگیا۔

"کیا کر رہی ہو؟" محمد امیر کی آواز سُن کر وہ چونکی اور کتاب سے سر اوپر اُٹھایا۔ وہ چائے کا خالی کپ تھامے سامنے کھڑا بہت فرصت سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"پڑھ رہی ہوں۔" مختصر جواب دے کر وہ

دوبارہ کتاب پر جھک گئی۔

"بہت پڑھ لیا کتابوں کو، اب تھوڑا سا مجھے بھی پڑھ لو۔"

وہ بہک رہا تھا، اور عائشہ گل اچھی طرح سمجھ رہی تھی۔ اس نے نگاہیں اٹھائیں اور خفگی سے اسے گھورا۔

"میرے ایگزامز شروع ہونے والے ہیں۔" وہ اس وقت صرف یہ چاہتی تھی کہ محمد امیر وہاں سے چلا جائے۔ مگر اس کا ایسا کوئی ارادہ نظر نہ آتا تھا۔

"اور اگر تم محبت کے امتحان میں فیل ہو گئیں مسز!" وہ دھیرے دھیرے چلتا ہوا اس کے عین سامنے بیڈ پر آ بیٹھا۔

"آپ مجھے مسز مت کہا کریں"۔ وہ جھنجھلائی۔ محمد امیر حیرت زدہ سا تھا۔

"وہاں آپ نے امی کے سامنے بھی مجھے اپنی بیوی کہا، مجھے بہت آکورڈ سا فیل ہوا۔" وہ کتاب کو بغور دیکھ رہی تھی۔ اور محمد امیر اسے۔

"تو کیا تم میری بیوی نہیں ہو؟" وہ بولا تو اس کا لہجہ ڈھیروں حیرت سمیٹے ہوئے تھا۔

"میں آپ کی بیوی ہوں، آپ اس بات کا حساس مجھے بار بار کیوں دلاتے ہیں؟" محمد امیر نے اس کے سامنے سے کتاب اٹھا لی تھی۔ عائشہ گل نے تیر کی سی تیزی سے اپنا جھکا ہوا سر اوپر اٹھایا تھا۔

"کیا تمہارے لئے یہ رشتہ، یہ احساس، کہ تم میری بیوی ہو، باعثِ شرم ہے؟" وہ بے یقین سا تھا۔

"بڑوں کا لحاظ اور ادب بھی کوئی چیز ہوا کرتی ہے۔" اس نے صاف گوئی سے کہا۔

"اور میں نے کوئی بدلحاظی نہیں کی۔" وہ اپنے مؤقف پر قائم تھا۔

"تم بیوی ہو میری تو کہنے میں کیا حرج ہے" وہ بضد تھا۔

"کتاب واپس کریں" عائشہ گل نے ہاتھ بڑھایا۔

"تم کبھی بھی مجھے خوش نہیں ہونے دیتی عائشہ گل۔" اس نے کتاب واپس اس کے سامنے رکھی اور اٹھ کر باہر ٹیرس پر نکل گیا۔ عائشہ گل نے سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

"عجیب انسان ہیں، بلاوجہ خفا ہو جاتے ہیں اور پھر یہ بھی میری ڈیوٹی ہے کہ ہر بار نہیں مناؤں"۔ اس نے کتاب کھولی اور پڑھنے لگی۔

"نہیں پڑھا جا رہا مجھ سے"۔ اسے جلد ہی احساس ہو گیا کہ وہ محمد امیر کو ناراض کر کے پڑھ نہیں سکتی۔ اس نے سٹاپ بند کر دی اور ٹیرس کے بند دروازے کو دیکھا اور ایک گہری سانس لی۔

✧✧✧

اِزابیل، اویس کا بہت خیال رکھتی تھی۔ اس کی فُل ٹائم کیئر کے لئے اس نے ایک ملازم رکھ لیا تھا۔ وہ اس کے لئے کافی ساری شاپنگ کر کے لائی تھی، اور اس کے پاس بیٹھی اسے ایک، ایک چیز دکھا رہی تھی۔

روزانہ شام کو یونیورسٹی سے آنے کے بعد وہ اسے وہیل چیئر پر بٹھا کر لان میں لے آتی تھی۔ وہاں بیٹھ کر دونوں کافی پیا کرتے اور بہت سی باتیں کرتے۔ اویس زندگی سے دور جانے کی باتیں کرتا تو وہ اسے واپس زندگی کی طرف کھینچ لاتی۔

اس وقت بھی اس کی ساری شاپنگ اس کی وارڈروب میں سیٹ کروانے کے بعد وہ اسے لان میں لے آئی۔ دونوں کافی پی رہے تھے، جب بیرونی گیٹ کھلا اور ہاشم اندر آئے۔

گاڑی سے اُتر کر وہ چلتے ہوئے اس کے قریب آئے۔

''اندر آؤ اِزابیل، مجھے بات کرنی ہے تم سے''۔ وہ تحکم بھرے لہجے میں کہہ کر اندر کی جانب بڑھ گئی۔ اِزابیل نے اویس کے گھبرائے ہوئے چہرے کو دیکھا۔

''ریلیکس!'' وہ اپنی جگہ سے اٹھی، کافی کا مگ سنٹرل ٹیبل پر رکھا اور اس کے قریب آتے ہوئے اس کا شانہ تھپتھپایا۔

''میں ابھی آتی ہوں'' وہ پلٹی اور لمبے لمبے ڈرگ بھرتے ہوئے اندر کی جانب بڑھی۔

''یس ڈیڈ!'' وہ پریشانی کے عالم میں لاؤنج میں اِدھر سے اُدھر ٹہل رہے تھے۔ اسے دیکھ کر رک گئے۔

''یہ تماشہ کب تک چلتا رہے گا'' انہوں نے حقارت سے باہر کی جانب اشارہ کیا۔

''ڈیڈ پلیز!'' اس نے ہاتھ اٹھا کر انہیں مزید بولنے سے روکا۔

''آپ اس کے لئے ایسے مت بولیں۔'' اس نے احتجاجاً کہا۔

''تم جانتی ہو، راحیل تم سے کتنا خفا ہے۔'' وہ اسے احساس دلانا چاہتے تھے۔

''ایم سوری ڈیڈ۔ مگر میں اُسے منالوں گی۔'' وہ تسلی آمیز لہجے میں بولی۔

''تم اپنے ساتھ اچھا نہیں کر رہی''۔ انہوں نے تنبیہ کی۔

''اچھا تو میں نے اس کے ساتھ بھی نہیں کیا۔ وہ سر جھکائے کھڑی تھی۔ اداسی سے گویا ہوئی اس کا احساس جُرم اسے چین نہ لینے دیتا تھا۔

''وہ صرف ایک حادثہ تھا۔ جس میں تمہارا کوئی قصور نہیں تھا۔'' وہ بہت آرام سے اسے ہر قصور سے بری الذمہ کر رہے تھے۔

''تم اس کی سزا خود کو مت دو''۔

''قصور تو اس کا بھی نہیں تھا ڈیڈ، پھر سزا صرف اسے کیوں ملے۔'' وہ اس کی حمایت میں بولی۔

''تم کب تک اس کا خیال رکھو گی۔ تمہاری شادی ہو جائے گی تو پھر یہ سب کون کرے گا؟ بہتر ہے ابھی......''

''آپ اس کی فکر مت کریں ڈیڈ۔'' اس نے بات کو سمیٹا۔

''میں اس کا خیال تب تک کروں گی جب تک وہ دوبارہ اپنے پاؤں پر نہ کھڑا ہو جائے۔ اسے اپنی پہچان، شناخت اور کھوئے ہوئے رشتے واپس نہ مل جائیں۔'' وہ کہہ کر رکی نہیں تھی وہاں سے نکلتی چلی گئی تھی۔ ہاشم پُرسوچ نگاہوں سے اسے جاتا دیکھ رہے تھے۔

✧✧✧

علیزے بیڈ سے اُتری اور ننگے پاؤں چلتے ہوئے باہر نکل آئی۔ ماما لاؤنج میں صوفے پر بیٹھی آنسو بہا رہی تھی۔ علیزے کو سخت شرمندگی نے آن گھیرا۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی، ان کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ مگر وہ اس کی جانب متوجہ نہ ہوئی تھیں۔

''ماما!'' علیزے نے انہیں پکارا۔

''آئے ایم سوری ماما''۔ وہ ان کے قدموں میں بیٹھ گئی۔

''مجھے معاف کر دیں'' وہ شرمندہ نظر آ رہی تھی۔

''میرا مقصد آپ کو ہرٹ کرنا نہ تھا۔ آئے ایم سوری ماما''۔ اس نے ان کے گالوں پر پھسلتے آنسوؤں کو اپنے ہاتھوں سے صاف کیا۔

''تم مجھے ہرٹ کرلو، مگر خود کو مت کرو۔'' وہ

منت بھرے لہجے میں بولی تھیں۔
"تم محمد امیر کو اپنے دل اور دماغ سے نکال دو۔" انہوں نے علیزے کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔
"نہیں ماما!" علیزے نے سر نفی میں ہلایا۔
"آپ کو لگتا ہے کہ یہ میرے اختیار میں ہے؟" وہ استفہامیہ نظروں سے ان کی جانب دیکھنے لگی تھی۔
"سب کچھ انسان کے اپنے اختیار میں ہوتا ہے بیٹا! تم کوشش تو کر کے دیکھو۔" انہوں نے اس کا چہرہ ہتھیلیوں میں لے کر اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔
"دل پر اختیار نہیں ہوتا ماما۔ میرے ڈیڈ کو اس دنیا سے گئے کتنے سال گزر گئے، کیا آپ بھول پائی ہیں انہیں۔"
اس نے انجانے میں ان کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ وہ آنکھیں پھاڑے اسے دیکھ رہی تھیں۔
"وہ میرے شوہر تھے علیزے۔ وہ مجھ پر جان چھڑکنے والا شخص تھا میں کیسے بھولوں اسے۔" وہ بہت کم اس سے اپنے دل کی بات کیا کرتیں، علیزے کے ڈیڈ کا ذکر کرتیں، مگر وہ جانتی تھی کہ وہ ان سے آج بھی کتنی محبت کرتی ہیں۔ وہ علیزے کی پیدائش سے دو ماہ قبل انہیں چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ مگر ماما نے دوبارہ شادی نہ کی تھی۔ اور علیزے جانتی تھی ماما نے زندگی ان کی یادوں، اور علیزے کے سہارے گزاری تھی۔
"جس سے محبت ہو جائے نہ ماما!" علیزے نے پل بھر توقف کیا۔ اس کے سینے سے ایک گہری سانس برآمد ہوئی تھی۔
"اسے بھلانا اپنے اختیار میں نہیں ہوتا۔" اس نے ان کی جانب دیکھتے ہوئے بات مکمل کی اور نگاہیں جھکا لیں۔
"خود کو بربادی سے بچانا انسان کے اپنے اختیار میں ہوتا ہے بیٹا۔" انہوں نے مزید سمجھانا چاہا۔ کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ ان کی بیٹی اسے پھولوں سے دامن بھرنے کی خواہش کر رہی ہے جو سوائے اسے زخمی کرنے کے اور کچھ نہ دیں گے۔ اور وہ اس کے دل کو لہولہان ہونے سے بچانا چاہتی تھیں۔ اسی لئے کہہ گئیں۔
"آپ نہیں سمجھیں گے ماما۔" علیزے نے مزید بحث کا ارادہ ترک کیا۔
"کاش تم میری بات سمجھ جاؤ علیزے"۔ وہ متاسف لہجے میں بولیں۔ علیزے نے خاموشی میں ہی عافیت جانی۔

◆◆◆

عائشہ گل اٹھی، دروازہ کھولا اور ٹیرس پر نکل گئی۔ محمد امیر حسب معمول اور حسب توقع گرل پر ہاتھ جمائے، آگے کو جھکا ہوا، نیچے وادی میں نا جانے کیا تلاش کر رہا تھا۔ سرد و تند ہوا سرسراتی ہوئی ٹیرس پر اٹھکیلیاں کر رہی تھی۔ عائشہ گل خاموشی سے محمد امیر کے پہلو میں جا کھڑی ہوئی تھی۔ مگر وہ اس کی جانب متوجہ نہ ہوا تھا۔
"محمد امیر!" اس نے آہستگی سے پکارا۔ مگر جواب ندارد۔
"آپ خفا ہیں مجھ سے؟" اس کے لہجے سے پریشانی مترشح تھی۔
"تمہیں فرق پڑتا ہے؟" اس کی جانب دیکھے بناء ہی وہ تند لہجے میں بولا تھا۔
"اگر فرق نہ پڑتا تو، یہاں آپ کے پاس نہ آتی۔" وہ مصالحت آمیز لہجے میں بولی۔
"تو مت آتی، کس نے بلایا ہے۔" اس کا

موڈ ہنوز خراب تھا۔ لہجے میں اجنبیت سموتے ہوئے بولا تو عائشہ گل کی پریشانی میں اضافہ ہو گیا۔ وہ اس کے پل میں تولہ پل میں ماشہ ہوتے مزاج کو سمجھ نہ پا رہی تھی۔

"جاؤ، جا کر اپنی کتابیں پڑھو، ایگزامز ہیں تمہارے"۔ وہ اس پر طنز کا نشتر چھوڑتے ہوئے بولا۔ تو عائشہ گل کے حوصلے ٹوٹنے لگے۔

"مجھ سے نہیں پڑھا جا رہا۔" اس نے اعتراف کرتے ہوئے سر جھکا لیا۔ محمد امیر نے رُخ بدلا اور اس کی جانب دیکھا۔ ساری خفگی لمحوں میں جیسے کہیں غائب ہو گئی۔

"تم جانتی ہو پوری دنیا میں اَن گنت لڑکیاں ہیں۔ جو مجھ پر مرتی ہیں۔ مجھ سے ایک بار بات کرنے کو ترستی ہیں۔ مگر میں نے کبھی کسی کو لفٹ نہیں کروائی۔ کیونکہ مجھے تو تمہارا ہونا تھا۔ میں اپنے ہزاروں کام، بے شمار مصروفیات چھوڑ کر یہاں تمہارے پاس بیٹھا ہوں، تمہیں کوئی قدر نہیں میری۔" اس نے عائشہ گل کے شانوں پر اپنے دونوں ہاتھ مضبوطی سے رکھے تھے۔

"اور جب میں چلا جاؤں گا تب تم مجھے یاد کرو گی۔"

عائشہ گل نے نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں سے جھلکتے سرکش جذبوں کی تاب نہ لاتے ہوئے اس نے فوراً زاویہ نظر بدل لیا تھا۔

"میرے جانے کے بعد تمہیں میری قدر ہو گی"۔ عائشہ گل کے دل نے ایک بیٹ مس کی تھی۔ وہ کتنا شاندار شخص تھا۔ اس کی محبتوں کے خزانے کی وہ بلاشرکت غیرے مالک تھی۔ اور ابھی عائشہ گل کو اپنی خوش بختی کا خود بھی اندازہ نہ تھا۔

"مجھے معاف کر دیں پلیز!" وہ مصالحت آمیز لہجے میں بولی۔

"نہیں۔ تم مجھے معاف کر دو۔ میں آئندہ تمہیں اپنی مسز نہیں کہوں گا"۔ وہ ہنوز خفا تھا۔

"یعنی آپ نے مجھے معاف نہیں کیا۔" اس نے محمد امیر کی جانب دیکھا۔

ہوا نے زور پکڑ لیا تھا۔ کالی گھٹاؤں نے آسمان کو گھیر لیا تھا۔ اور چاند بادلوں میں منہ چھپا کر بیٹھ گیا تھا۔

"میں تم سے ناراض نہیں رہ سکتا۔ پتا نہیں تم کیا ہو عائشہ گل۔" اس نے دایاں ہاتھ بڑھا کر اس کے ماتھے کو چھوتی لٹ کو درست کیا۔ عائشہ گل ساکت ہو گئی۔ اس کا سانس بند ہونے لگا۔

"لگتا ہے بارش ہو گی۔" وہ نگاہیں اٹھا کر آسمان کو دیکھنے لگی۔ محمد امیر نے بھی اس کی نگاہوں کے تعاقب میں آسمان کی جانب دیکھا۔

"موسم بہت خوبصورت ہے اور اسے مزید خوبصورت بنانے کے لیے......" بولتا ہوا اچانک وہ بات ادھوری چھوڑ کر کمرے کی جانب بڑھا۔ جبکہ عائشہ گل شش و پنج میں مبتلا وہیں کھڑی رہی۔

"کہاں گئے؟" ابھی وہ سوچ ہی رہی تھی کہ وہ واپس آ گیا۔ اس نے ہاتھ میں سُرخ، عروسی، بھاری کامدار دوپٹہ پکڑ رکھا تھا۔

"اسے اوڑھ لو۔" حکم صادر ہوا۔

"مگر کیوں؟" عائشہ گل آنکھیں پھاڑے اسے دیکھ رہی تھی۔

"اس حسین موسم کو گواہ بنا کر، میں اس گھر میں اپنی آخری رات کو یادگار بنانا چاہتا ہوں"۔ وہ معنی خیزی سے بولا۔ عائشہ گل ناسمجھی کے عالم میں اسے دیکھ رہی تھی۔ محمد امیر نے دوپٹہ خود سے اوڑھا دیا۔

"تھوڑا سا میک اپ بھی کر لو۔ بلکہ بال بھی

بنالو"۔ وہ اس کی ٹھوڑی کو چھوتے ہوئے بولا۔

"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" وہ ششدر رہ گئی۔

"میں آج، ابھی، اس لمحے، تم سے منگنی کر رہا ہوں عائشہ گُل"۔ عائشہ گل اس کی بات پر حیران رہ گئی۔

"مگر ہمارا تو نکاح ہو چکا ہے نہ۔" وہ جیسے اُسے یاد دلا رہی تھی۔

"سو واٹ!" محمد امیر نے جیکٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈالا اور مخملی کیس باہر نکالا۔ عائشہ گُل آنکھیں پھاڑے اس کی حرکات کو دیکھ رہی تھی۔ وہ زیرِ لب مسکراتا ہوا بہت اچھا لگ رہا تھا۔

"ہاتھ دو"۔ اس نے عائشہ گُل کے سامنے اپنی چوڑی ہتھیلی پھیلائی۔ کچھ جھجکتے ہوئے اس نے بایاں ہاتھ اس کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔

"اگر میں نکاح سے پہلے تم سے منگنی کرتا تو کیا تم مجھے اپنا ہاتھ تھامنے دیتی۔" وہ شرارت آمیز سنجیدگی سے بولا۔

"یقیناً نہیں"۔ جواب بھی اس نے خود ہی دے دیا تھا۔

"اور میں حسرت سے تمہیں ماں کے ہاتھوں سے انگوٹھی پہنتے دیکھتا رہتا۔" اپنی ہی بات پر وہ خود ہی ہنس دیا تھا۔

"انگوٹھی بہت خوبصورت ہے تھینک یو!" عائشہ گل نے ہاتھ واپس کھینچنا چاہا۔ مگر محمد امیر کی گرفت بہت مضبوط تھی اور اس کا ہاتھ چھوڑنے کا کوئی ارادہ بھی نہ تھا۔

"نہیں ۔ تمہارا ہاتھ زیادہ خوبصورت ہے۔" اس نے جیب سے موبائل نکالا، عائشہ گُل کو بازوؤں کے حلقے میں لیتے ہوئے اس کے ساتھ سیلفی بنانے لگا۔ دفعتاً اس کا موبائل بپ دینے لگا۔

"رُبش!" وہ سخت بدمزہ ہوا۔

"یہ روما بھی نہ......" محمد امیر نے اس کی کال کاٹ دی اور مسکراتے ہوئے عائشہ گُل کے دلکش چہرے کو دیکھا۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی پڑنے لگی تھی۔ عائشہ گُل بھاگ کر اندر چلی گئی تھی۔ محمد امیر ہنستا ہوا اس کے پیچھے آیا تھا۔ سردی نے اس کے ہاتھ پاؤں جما دیے تھے مگر اسے مطلق پرواہ نہ تھی۔

✦✦✦

اگلے روز روما کے والدین بنا اطلاع دیے لنچ پر محمد امیر کے گھر پہنچ گئے تھے۔ دونوں میاں بیوی انہیں سامنے دیکھ کر نظریں چرانے لگے تھے۔ اب بھلا وہ کس منہ سے بتاتے کہ وہ انہیں بتائے بغیر محمد امیر کا نکاح کر چکے ہیں۔ ایک تو وہ روما کی محمد امیر کے لئے پسندیدگی سے اچھی طرح واقف تھے۔ پھر اس طرح انہیں اطلاع دیے بغیر یوں چپ چاپ بیٹے کا نکاح کر دینا، انہیں بتاتے ہوئے بے حد عجیب سا لگ رہا تھا۔

"بہت دِن رہ آئی آپ دردانہ، اب آپ کی بہن کیسی ہے؟" روما کی ماما نے استفسار کیا تو دردانہ نے نظریں چُرائیں۔

"اب بہتر ہیں"۔ مختصر جواب آیا۔

"محمد امیر واپس نہیں آیا؟" نے متلاشی نظروں سے اِرد گرد دیکھا۔

"جی! وہ خالہ کے پاس رک گیا ہے۔ جب تک وہ مکمل تندرست نہیں ہو جاتیں"۔ دردانہ نے ہی جواب دیا۔

"کمال ہے کہاں تو ساری زندگی آپ کو بہن اور امیر کو خالہ کا خیال نہیں آیا اور اب ایسا خیال کہ......" قصداً بات ادھوری چھوڑ کر وہ ان دونوں میاں بیوی کے شرمندہ اور کچھ چور سے

انداز کو بغور دیکھنے لگیں۔ انہیں یقین ہو گیا دال میں کچھ تو کالا ہے۔

✦✦✦

اویس کا ہاسپٹل میں چیک اپ تھا۔ اِزابیل یونیورسٹی نے جلدی آ گئی تھی۔ وہ خود اسے ہاسپٹل لے کر گئی تھی۔ ڈاکٹرز اس کی رپورٹس دیکھ کر خاصے حیران تھے۔ وہ اب دماغی طور پر کافی ریلیکس محسوس ہو رہا تھا۔

واپسی میں اِزابیل اسے ایک کافی بار میں لے گئی تھی۔ جہاں بیٹھ کر دونوں نے کافی پی تھی۔ اویس معمول سے زیادہ خاموش تھا۔ اِزابیل کو ڈیڈ کی کالز آ رہی تھیں۔ وہ اسے گھر بلا رہے تھے۔

جس وقت وہ اویس کو ملازم کی مدد سے گاڑی سے نکال کر وہیل چیئر پر بٹھا رہی تھی اس نے لان میں بیٹھے راحیل اور اس کے پیرنٹس کو دیکھا تھا۔ وہ سب بغور اِزابیل کو دیکھ رہے تھے۔

''تم اویس کو اس کے روم میں لے کر جاؤ۔'' اس نے ملازم کو ہدایت کی اور خود لان کی جانب بڑھی۔

''کیسی ہو اِزابیل!'' راحیل کی والدہ نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے تیکھے پن سے کہا۔

''فائن۔ آپ کیسی ہیں آنٹی؟'' وہ ان کا طرزِ تخاطب نظر انداز کر گئی۔

''تو ہاشم اب ہمیں شادی کی تاریخ دے دو''۔ راحیل کے والد کی بات پر اِزابیل نے چونکتے ہوئے انہیں دیکھا۔

''ہاں!'' ہاشم نے اِزابیل کی جانب دیکھا۔ وہ اس اچانک اُفتاد کے لئے ہرگز تیار نہ تھی۔ ہونقوں کی طرح ان سب کے منہ تک رہی تھی۔

''میرا بھی یہی خیال ہے کہ اب ان کی شادی کر دی جائے۔'' ہاشم نے بغور اِزابیل کے دھواں دھواں چہرے کو دیکھا۔

''میرے ایگزامز ہونے والے ہیں''۔ اِزابیل نے دبا، دبا احتجاج کیا۔ تو راحیل نے کھوجتی ہوئی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

''اِزابیل تم چپ رہو''۔ ڈیڈی نے اسے ڈپٹا۔

''اس دفعہ کے Easter سے پہلے ہم شادی کر دیتے ہیں ان کی'' راحیل کے والد بولے تو اِزابیل نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

ڈیڈی اس کی بے چینی کی وجہ سمجھ رہے تھے۔

''میرا خیال ہے کرسمس سے پہلے شادی ہو جانی چاہیے۔'' ہاشم نے اچٹتی سی نگاہ اِزابیل پر ڈال کر کہا تو وہ اٹھ کر اندر چلی گئی۔ سب اسے جاتا دیکھتے رہے۔

✦✦✦

علیزے نے ماما کی خاطر خود کو کمپوز کر رکھا تھا۔ آج دو دن بعد وہ آفس آئی تھی۔ کسی کام میں دل نہ لگ رہا تھا مگر وہ دِل لگانے کی کوشش کر رہی تھی۔ ایما بہت دیر سے اسے نوٹس کر رہی تھی۔

''لنچ کا ٹائم ہو گیا۔ اٹھ جاؤ۔'' ایما نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھانا چاہا۔

''مجھے بھوک نہیں ہے یار۔'' اس کی انگلیاں تیزی سے کی بورڈ پر متحرک تھیں۔ ایما کی جانب دیکھے بناء اس نے جواب دیا تھا۔

''اچھا میرے ساتھ تو چلو نہ کینٹین۔'' وہ بضد تھی۔

''میرا دو دن کا کام جمع ہوا پڑا ہے''۔ اس نے بہانہ بنایا۔ مگر ایما اس کی کوئی بات سننے کو تیار

نہ تھی۔ بالآخر اس کی ضد کے آگے ... ہار مان
گئی۔ وہ دونوں بیٹھ گئیں۔ علیزے نے
اپنے لیے بلیک کافی کا آرڈر دیا۔

"ساتھ میں کچھ نہیں لوگی؟" ایما نے برگر اور کولڈ ڈرنک منگوائی تھی۔ علیزے نے سر کو نفی میں ہلایا۔

"تمہیں پتا ہے محمد امیر کی ایک نقاب پوش لڑکی کے ساتھ تصویر آج کل سوشل میڈیا پر وائرل ہے۔ پوری دنیا سے لاکھوں کروڑوں فینز اس تصویر پر کمنٹ کر رہے ہیں۔" علیزے نے بری طرح چونکتے ہوئے ایما کی جانب دیکھا۔

"اس تصویر میں محمد امیر نے بڑے استحقاق سے اس لڑکی کا ہاتھ تھام رکھا ہے۔" ایما نے مزید بتایا۔ ان کا لنچ سرد ہو چکا تھا۔

ایما نے اپنا لنچ پیک کھولا، برگر کا بائیٹ لیتے ہوئے ساتھ میں کولڈ ڈرنک کا بڑا سا سپ لیا۔

علیزے کے دل کی دنیا تہ و بالا ہونے لگی تھی۔ سینے میں بائیں جانب ایک درد اٹھا تھا، جو رفتہ رفتہ پورے بدن میں پھیل گیا تھا۔

"یہ دیکھو تصویر۔" ایما نے اپنی جینز کی پاکٹ میں سے موبائل فون نکالا اور تصویر علیزے کو دکھائی۔ جسے دیکھتے ہی علیزے کے چہرے کا رنگ متغیر ہونے لگا۔ محمد امیر کے ہاتھ میں کسی لڑکی کا ہاتھ تھا۔ علیزے کو اس لڑکی پر بری طرح رشک آیا تھا۔ اُسے اس سے کوئی حسد یا جلن محسوس نہ ہوئی تھی۔

"کاش یہ ہاتھ میرا ہوتا۔" تصویر کو دیکھتے ہوئے وہ اسی نہج پر سوچے جا رہی تھی۔

اس کے دل کی حالت سے بے خبر وہ اپنا برگر اور کولڈ ڈرنک انجوائے کر رہی تھی۔ جبکہ علیزے کے سامنے پڑی اس کی کافی ٹھنڈی ہو رہی تھی۔

"تم یہ پک مجھے واٹس ایپ کر دو۔" دِل کا ... بات ... دے وہ ایما سے کہنے لگی تھی۔

"شیور!" ایما نے موبائل پکڑ کر فوراً وہ تصویر اسے سینڈ کر دی تھی۔

"نا جانے یہ لڑکی کون ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ محمد امیر نے یہ تصویر خود اپنے کسی سوشل میڈیا اکاؤنٹ پر اپلوڈ نہیں کی، بلکہ یہ کسی اور نے وائرل کی ہے۔ سوال یہ اٹھتا ہے کہ یہ لڑکی کون ہے"۔ ایما برگر اور کولڈ ڈرنک سے پورا پورا انصاف کرتے ہوئے پُرسوچ انداز میں بولی۔

"اس کی کوئی فین ہوگی" علیزے نے خیال ظاہر کیا۔

"نہیں"۔ ایما نے فوراً سر نفی میں ہلایا۔

"وہ فینز کو کب اتنا سر پر اٹھاتا ہے۔" ایما نے اس کی بات سے انکار کیا۔ علیزے کا دل بُری طرح اچاٹ ہونے لگا تھا۔ وہ کافی پیے بغیر واپس اپنی سیٹ پر آ گئی تھی۔

"اپنی کافی تو پیتی جاؤ۔" ایما نے عقب سے اسے پکارا۔ وہ ان سنی کر کے باہر نکل گئی۔ سیٹ سے اپنا بیگ اٹھایا آفس کی عمارت سے باہر آ گئی۔

وہ بے سمت چلی جا رہی تھی۔ اسے خود بھی خبر نہ تھی کہ وہ کہاں جا رہی ہے۔ دل بری طرح ٹوٹا اور بکھرا ہوا تھا۔ اس کا وجود آندھیوں اور زلزلوں کی زد میں تھا۔

✦✦✦

دھرتی نے نیا چولا اُتار پھینکا تھا اور روشن، نکھرا اور ستھرا سفید لباس زیب تن کر لیا تھا۔ رات بھر برسنے والی بارش وادی کو نہلا کر نیا اور ستھرا کرتی رہی تھی۔

روشن، روپہلی اور چمکیلی صبح انگڑائی لے کر

وادی میں بیدار ہوئی تھی۔ رات بھر ہونے والی بارش کی وجہ سے وادی اور بھی زیادہ حسین اور سرسبز وشاداب لگنے لگی تھی۔

عائشہ گل نے امی کے لئے ناشتہ بنایا اور ان کو اپنے ہاتھوں سے کھلایا۔

"تم کالج نہیں گئی"۔ وہ پوچھنے لگیں۔

"آج محمد امیر واپس جا رہے ہیں۔ تو اس لیے......" اس نے قصداً بات ادھوری چھوڑ دی۔

"بہت اچھا کیا"۔ امی نے اسے شاباش دی۔

"ہمیشہ اس کا کہنا ماننا۔ فرمانبردار اور اچھی بیوی بن کر رہنا۔ وہ بہت اچھا ہے۔ اور تم سے محبت بھی کرتا ہے۔" امی نے ناصحانہ انداز میں سمجھایا۔ عائشہ گل نے اثبات میں سر ہلایا۔

وہ برتن لے کر کچن میں آ گئی۔ ڈور بیل بجی تھی اور ساتھ یہ دروازے پر دستک ہونے لگی تھی۔ بلکہ دروازہ دھڑ دھڑایا جانے لگا تھا۔ عائشہ گل لکڑی کا دروازہ کھول کر باہر آئی اور بیرونی دروازہ کھول دیا۔ سامنے کھڑے مُراد کو دیکھ کر اس کی روح فنا ہونے لگی۔

وہ تیزی سے مڑی اور لمبے لمبے ڈگ بھرتی اندر چلی گئی۔ مراد اس کے پیچھے آیا۔

"رکو عائشہ!" وہ دھاڑا۔ عائشہ گل چادر سے چہرہ ڈھانپے کھڑی تھی۔

"یوں مت بھاگا کرو مجھے دیکھ کر۔ پارہ ہائی ہونے لگتا ہے میرا۔" اس کی دھاڑ بلکہ چنگھاڑ سن کر محمد امیر کمرے سے باہر نکلا تھا۔

"شادی ہونے والی ہے ہماری، تمہارے امتحانوں کے بعد"۔ مراد نے آگے بڑھ کر اس کی کلائی تھامی۔

"ہاتھ چھوڑو اس کا۔" محمد امیر تیر کی سی تیزی سے آگے آیا تھا۔ لکڑی کا زینہ اُتر کر امی نیچے آئی تھیں، اور محمد امیر اور مُراد کو آمنے سامنے دیکھ کر ان کا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا تھا۔ وہ تیزی سے ان کے قریب آئیں۔

"نہیں چھوڑتا میں ہاتھ۔ تم کون لگتے ہو اس کے۔" عائشہ گل دزدیدہ نگاہوں سے محمد امیر کو دیکھ رہی تھی۔ جو خون آشام نظروں سے مُراد کو گھور رہا تھا۔

"How dare you" محمد امیر نے آگے بڑھ کر عائشہ گل کی کلائی اس کی گرفت سے کھینچی اور اسے اپنے عقب میں چھپا لیا۔

"عائشہ تم اپنے کمرے میں جاؤ"۔ امی از حد خوفزدہ تھیں۔

"ارے تم تو...... تم...... وہی ہو نہ، گلوکار، محمد امیر۔ تم یہاں کیسے؟" اچانک مُراد بولا تھا۔ عائشہ گل نے ناسمجھی کے عالم میں پہلے مُراد اور پھر محمد امیر کی پشت کو گھورا تھا۔

"مُراد بیٹے یہ میرا بھانجا ہے۔ میں بہت بیمار ہو گئی تھی، یہ کراچی سے میری تیمارداری کے لئے آیا ہے۔ آج شام واپس جا رہا ہے۔" محمد امیر نے دیکھا کہ خالہ جان کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا ہے۔

"اور یہ بھی تو بتائیں نہ خالہ جان کہ......"

"محمد امیر!" امی جان نے جلدی سے اس کی بات کاٹی۔

"بیٹا! آپ جاؤ۔ فریش ہو کر آؤ۔ میں ناشتہ دیتی ہوں آپ کو، مُراد بیٹا آپ ناشتہ کرو گے؟؟" وہ تھوک نگلتے ہوئے بولیں۔ محمد امیر بغور ان کے ڈرے سہمے انداز کو دیکھ رہا تھا۔

"ناشتہ کرنے نہیں آیا۔ صرف یہ بتانے آیا ہوں کہ ایک مہینے کے لئے میں انگلینڈ جا رہا ہوں۔ میری واپسی تک شادی کی تیاری مکمل

رکھنا۔" محمد امیر غصے کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ مگر خالہ جان کی خاطر خاموش رہا۔

"یہ چیک رکھ لیں۔ شادی کی تیاریوں کے لئے"۔ اس نے جیب سے چیک نکال کر امی کے ہاتھ پر رکھا۔

"مجھے تمہارے پیسے نہیں چاہیے۔" عائشہ گل نے امی کے ہاتھ سے چیک لیا، اسے ٹکڑے ٹکڑے کر کے مراد کے منہ پر مارا محمد امیر کے سینے میں دہکتے الاؤ کچھ کم ہونے لگے۔

"عائشہ تم اندر جاؤ۔" امی نے اسے آنکھیں نکالیں۔

"سمجھا دیں اسے چاچی! میں غصے کا بہت بُرا ہوں۔" وہ مونچھوں کو تاؤ دیتا ہوا بولا۔

"اور تم......!" اب وہ محمد امیر کی جانب مُڑا۔

"ہماری شادی پر ضرور آنا" اس نے محمد امیر کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"شہر سے مراثیوں کا پورا ٹولہ آئے گا میری حویلی، ناچنے اور گانے کے لیے تم تو اتنا اچھا گاتے ہو۔" وہ زور زور سے قہقہے لگانے لگا۔

عائشہ گل کو اس سے شدید نفرت محسوس ہوئی تھی۔

"اور پیسوں کی فکر نہ کرنا۔ منہ مانگے دام دوں گا تمہیں۔" زور، زور سے قہقہے لگاتے ہوئے وہ واپس مڑ گیا۔ جبکہ محمد امیر بل کھا کر رہ گیا۔

"میں صرف آپ کی وجہ خاموش رہا خالہ جان۔" محمد امیر کا موڈ خاصا بگڑا ہوا تھا۔ عائشہ گل اُس کے عقب سے نکل کر زینے کی جانب بڑھی اور تیزی سے اوپر چڑھ گئی۔ محمد امیر خاموشی سے اسے جاتا دیکھتا رہا۔

✦✦✦

علیزے اِردگرد سے بے نیاز، تیز تیز قدم اُٹھاتی چلی جا رہی تھی۔ اس کے دل کی دنیا میں ناقابل بیان طوفان اٹھ رہے تھے۔ دماغ وحشتوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ یکا یک وہ سڑک کنارے ایک سنگی بینچ پر گرنے کے انداز میں بیٹھی۔

"محمد امیر!" اس کے لبوں نے بے آواز جنبش کی۔ اس نے موبائل فون نکالا اور محمد امیر کی وہ تصویر دیکھنے لگی جس میں وہ لڑکی اس کے ساتھ تھی۔

"تم کتنی خوش نصیب ہو، تمہارا ہاتھ محمد امیر کے ہاتھ میں ہے۔" وہ اس لڑکی سے مخاطب تھی۔ اس کا جذبہ رشک انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔ ہاں اُسے کوئی حسد یا جلن محسوس نہ ہوئی تھی۔ کیونکہ وہ ہر اس شخص کا دِل سے احترام کرتی تھی جو محمد امیر کو چاہتا تھا، اس کے آس پاس رہتا تھا۔

"میں جانتی ہوں، میں زمین اور تم آسمان ہو محمد امیر۔ اور زمین کبھی آسمان سے نہیں مِل سکتی۔ مگر محمد امیر! کاش تم مجھے مِل جاؤ۔" وہ اس کی تصویر پر ہاتھ پھیرنے لگی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔

"پوری دنیا میں سے صرف ایک شخص مانگا ہے میں نے، وہ کیوں نہیں ملتا"۔ وہ دھاڑیں مار، مار کر رونے لگی تھی۔ سڑک پر آتے جاتے لوگ حیرت سے اسے دیکھتے اور پھر آگے گزر جاتے۔

✦✦✦

ملازم اویس کو اس کے روم میں چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ وہ وہیل چیئر کو خود چلا کر کھڑکی کے پاس لے آیا اور باہر دیکھنے لگا۔ جہاں ازانیل سب کے ساتھ بیٹھی خوش گپیوں میں مصروف تھی۔

"ان سب کے درمیان میری جگہ کہاں ہے؟" اس کے دل نے سوال کیا تھا۔ ازانیل کو

[illegible] دل پکا تھا۔

[illegible]

[illegible] ساتھ [illegible] کر رہی ہے۔" ملازم اس کو کافی دینے آیا تھا۔ "ازابیل میم نے آپ کے لئے بھجوائی ہے۔"

"سنو!" وہ جانے کے لئے مڑا تو اویس نے اسے پکارا۔

"کوئی مہمان آئے ہوئے ہیں؟" اس نے سرسری سے انداز میں استفسار کیا۔

"ازابیل میم کے سسرال والے آئے ہیں۔ راحیل سر، میم کے فیانسی ہیں۔" وہ اسے بتانے لگا۔ اویس خالی خالی نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

"میم کی شادی کی ڈیٹ فکس ہو رہی ہے۔" وہ اسے تفصیل سے آگاہ کر کے جا چکا تھا۔ اویس کے اندر عظیم توڑ پھوڑ ہونے لگی تھی۔ وہ تو ازابیل کا اس قدر عادی ہو چکا تھا کہ اسے وہ تھوڑی دیر نظر نہ آتی تو وہ اسے پکارنے لگتا۔

"تو کیا یہ مجھے چھوڑ کر چلی جائے گی۔" وہ زیر لب بڑبڑایا۔ "میں تو اس کا اتنا عادی ہو چکا ہوں۔" وہ بے چین ہونے لگا تھا۔ راحیل نے بات کرتے ہوئے اچانک ازابیل کا ہاتھ پکڑا تھا۔ اویس کی برداشت جواب دینے لگی تھی۔

"میں تمہارے سوا کوئی نہیں ہے ازابیل۔" وہ وہیل چیئر کو بیڈ تک لایا، خود کو گھسیٹتے ہوئے بمشکل بیڈ پر گرایا۔ "آہ!" اس کے منہ سے کراہ نکلی۔ پاؤں میں شدید درد اٹھا تھا۔ بہت جدوجہد کے بعد وہ بیڈ پر لیٹ گیا تھا۔

"نہیں پینی ہے مجھے کافی، نہ ہی میڈیسن کھانی ہے۔" اس نے کمبل خود پر درست کیا اور آنکھیں موند لیں۔ وہ ازابیل سے ناراض ہو

✦ ✦ ✦

ایک اداس اور خاموش شام وادی میں اُتری تھی اور ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے رہی تھی۔ عائشہ گل نے زرد لباس پہنا ہوا تھا۔ اور وہ خود بھی شاخ سے جدا، ملول و اُداس پتے کی مانند تنہا لگ رہی تھی۔ وہ ٹیرس پر کھڑی تھی۔ سیاہ کشمیری کڑھائی والی شال اوڑھے وہ سینے پر ہاتھ باندھے کھڑی ایک حسین مورتی لگ رہی تھی۔

"اُداس ہو۔" اس کے عقب میں محمد امیر کی آواز اُبھری تھی۔ وہ خاموش رہی۔

"تم پریشان مت ہونا۔ مراد تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔" اس کو شانوں سے تھام کر رُخ اپنی جانب موڑا۔ عائشہ گل ہنوز نگاہیں جھکائے کھڑی تھی۔

"میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔ میری زندگی میں آنے والی تم پہلی اور آخری لڑکی ہو عائشہ گل!" وہ ایک مرتبہ پھر اعتراف محبت کر رہا تھا۔ اس نے اس کا ہاتھ تھاما تھا۔ اور اس لمحے عائشہ گل کے دل نے شدت سے خواہش کی کہ وہ اس کا ہاتھ تھامے کھڑا رہے، اور کبھی اس کا ہاتھ نہ چھوڑے۔

"مجھے معلوم نہ تھا کہ یہاں آ کر میری زندگی اس طرح بدل جائے گی۔ میں تمہیں بتا نہیں سکتا کہ تم میرے لئے کیا ہو عائشہ گل!" عائشہ گل نے نگاہیں اٹھا کر اس کی جانب دیکھا۔ اس کا دِل محمد امیر نے ایک ایک لفظ پر ایمان لے آیا تھا۔

"اپنا خیال رکھنا!" اس نے عائشہ گل کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔

(باقی اگلے ماہ)

گل کی گانٹھ

معصومہ منصور



"پتا نہیں کہاں رہ گئی یہ ضوئی بھی۔ اب آ بھی جاؤ"۔ نوری بڑبڑاتے ہوئے پیڑ کے نیچے ٹہل رہی تھی۔ اس کے بے چین قدم یہاں سے وہاں تک مٹی اڑا رہے تھے۔

"کیا میں خود جا کر دیکھوں؟" اس نے خود سے سوال کیا اور کھیتوں کی جانب بڑھی۔

"کیا میرا جانا ٹھیک ہوگا؟" عجیب کشمکش تھی۔ وہ رک گئی۔

"ضوئی! ہمیں دیر ہو رہی ہے۔" اس نے آواز لگائی مگر جواب ندارد۔

"مر تو نہیں گئی؟" غصے سے بڑبڑاتے ہوئے وہ کھیتوں کے تھوڑا اور قریب گئی اور جھک کر دیکھا وہ دونوں آمنے سامنے کھڑے تھے۔ وہ جھجک کر ایک قدم پیچھے ہٹی۔ پھر دوسرے ہی لمحے غصے سے ان کے قریب چلی آئی۔

"چل ضوئی! چار سو اندھیرا پھیل گیا ہے...... اماں، بابا، راہ دیکھتے ہوں گے" قریب جا کر اس نے ضوئی کا بازو ہلا ڈالا۔ زرفشاں اور اسد نے ایک ساتھ اسے دیکھا۔

"ضوئی! یہ صرف گانی نہیں ہے...... یہ ایک وعدہ ہے...... میں جلدی تمہارے پاس لوٹوں گا...... پوری کامیابی کے ساتھ۔" اسد ضوئی کی جانب دیکھ کر بولا اور ساتھ ہی کچھ ضوئی کی مٹھی میں دبایا۔

"چل ضوئی اور دیر ہوئی تو شامت آجائے گی۔" نوری نے اس کا بازو کھینچا۔

"میرا انتظار کرنا"۔ اسد نے کہا اور جھک کر زمین پر پڑا سیاہ بیگ اٹھا کر چل دیا۔ ضوئی بالکل خاموش تھی۔ اس کی سیاہ آنکھیں جاتے ہوئے اسد پر جمی تھیں۔

"جلدی چل ناں! تیرے اماں، بابا نے تو پھر مجھے بخش دینا ہے...... مگر میرے ویر نے مجھے نہیں بخشنا آج"۔ نوری نے ضوئی کا بازو پکڑ کر گھسیٹا۔ نیم مردہ سی ضوئی گانی کو مٹھی میں دبائے نوری کے پیچھے پیچھے چل دی۔ اس کی مٹھی میں دبی سیاہ گانی کے گھنگھرو اس کی دل کی دھڑکن کے ہمراہ چھن چھن کرنے لگی۔

✦✦✦

نسرین گھر میں داخل ہوئی۔ سامنے ہی ضوئی صحن کی جھاڑو لگا رہی تھی۔

"آج پانی لینے نہیں جانا"۔ وہ ضوئی کے قریب آکر رکی۔

"ہاں! جانا ہے"۔ ضوئی نے جھاڑو روک کر ایک نظر اسے دیکھا اور پھر سے تیزی سے ہاتھ چلانے لگی۔

جھاڑو کے ہر بار زمین پر پھیرنے کے ساتھ دھول اٹھتی اور ایک جانب چلی جاتی۔ ضوئی نے کچرا اٹھا کر ٹین کے ڈبے میں ڈالا اور ہاتھ دھونے لگی۔

"کتنی خوبصورت لگ رہی ہے۔" نسرین نے ضوئی کی دودھیا گردن سے جھولتی گانی کو دیکھ کر سوچا مگر کہا کچھ نہیں۔ بلاوجہ ہی حسد کا سانپ اس کے اندر سر اٹھانے لگا۔

"اب یہ کیا کرنے لگی ہو؟" ضوئی کو گھاس اٹھا کر چارہ مشین کی جانب بڑھتے دیکھ کر نسرین ٹھٹکی۔

"بس تھوڑی ہی گھاس کاٹ کر بکری کو ڈال دوں...... اسے بھوک لگی ہوگی۔" وہ مشین میں گھاس کو ترتیب سے رکھ کر مشین چلانے لگی۔

"دھوپ بڑھتی جا رہی ہے ضوئی...... اور ابھی نوری کو بھی لینا ہے۔"

"بس پانچ منٹ"۔ ضوئی جلدی جلدی مشین چلانے لگی۔ نسرین گانی کو دیکھنے لگی۔ دو انچ کی سیاہ گانی، جس پر تین سفید نگ جڑے

تھے۔ اور تین ہی سیاہ گھنگرو اس کے نیچے لٹک رہے تھے۔ جو چارہ کاٹتی ضوئی کی ہر حرکت پر چھن چھن بول اٹھتے۔

"کیا یہ اسے اسد نے دی ہوگی۔" نسرین کے دل میں پھر حسد کا سانپ کلبلانے لگا۔ اس کا دل چاہا وہ گانی ضوئی کے گلے سے نوچ کر پھینک دے۔ مگر وہ ضبط کرتے ہوئے ضوئی کے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگی۔ ضوئی نے گھاس کاٹ کر صحن میں بندھی بکری کو ڈالی اور ہاتھ پھیر کر کپڑے جھاڑے۔

"چلو آؤ چلیں"۔ اس نے تار پر لٹکتا ڈوپٹہ اتار کر اوڑھا مٹکا کمر پر لٹکایا اور نسرین کے ہمراہ چل دی۔ راستے میں رُک کر انہوں نے نوری کے گھر سے نوری کو بلایا اور تینوں ہنستی، باتیں کرتیں کھیتوں پر لگے ٹیوب ویل کی جانب بڑھنے لگیں۔ گاؤں میں صرف ایک ہی ٹیوب ویل تھا۔ جس سے دن میں دو بار کھیتوں کو پانی دیا جاتا۔ اس دوران گاؤں والے کھانا پکانے اور پینے کے لئے بھی پانی لے جاتے۔ باقی ضروریات زندگی کے لئے نہر کا پانی استعمال کیا جاتا۔

"اسد چلا گیا؟"۔ نسرین نے ضوئی سے پوچھا۔

"نا صرف چلا گیا...... بلکہ تم نے دیکھا وہ کیا دے کر گیا اسے"۔ جواب ضوئی کے بجائے نوری نے دیا۔ ضوئی نے مسکراتے ہوئے گردن سے لپٹا سیاہ دھاگہ کھینچ کر گانی نسرین کو دکھائی۔ گانی پر نظر پڑتے ہی حسد کے ناگ نے نسرین کے اندر ضوضو کر کے شور مچا دیا۔

"ارے! یہ تو بہت پیاری ہے۔" اپنے احساسات ضبط کرتے ہوئے نسرین نے بظاہر مسکرا کر کہا اور حسد کے سانپ کو کچلنے کی کوشش

کی۔ ضوئی نے گانی چھوڑ دی۔ نسرین کے اندر حسد کا سانپ تلملاتے ہوئے بے چینیاں بھرنے لگا۔

✦✦✦

''تین مہینے ہو گئے ہیں...... اسد کی کچھ خیر خبر؟'' ان تینوں کے ہاتھوں میں درانتیاں تھیں۔ ان سے کچھ فاصلے پر دوسری عورتیں بھی گھاس کاٹنے میں مصروف تھی۔ ان سب کی تیزی سے چلتی درانتیاں زمین پر گھاس کے ڈھیر پر ڈھیر لگائے جا رہی تھیں۔

''نہیں''۔ اسد کے ذکر پر نا صرف ضوئی کے چلتے ہاتھ رکے تھے بلکہ اس کے چہرے کے ہر نقش میں اداس گھلنے لگی تھی۔

''تمہیں خود کسی طرح پتا کروانا چاہیے'' نسرین بولی۔

''میں کہاں...... کیسے پتا کرواؤں''۔

''تمہیں خبر ہے کچھ...... یہ بڑے شہر کتنے ظالم ہوتے ہیں...... گاؤں کے معصوم لوگوں کو نگل جاتے ہیں یہ''۔ نسرین کی بات پر ضوئی کا دل ڈوب گیا۔ اس نے گلے میں جھولتی گانی کو دیکھا جس کی چمک اب ماند پڑ چکی تھی۔

''اللہ کی امان میں دیا''۔ اس کے دل کی گہرائی سے خاموش دعا نکلی۔ اس نے گانی مٹھی میں پکڑ کر ہلکا سا دبا کر محسوس کیا اور پھر چھوڑ دیا۔ نوری اور نسرین اب دوسری باتیں کرنے لگیں۔ ایک بار پھر درانتیاں تیزی سے چلنے لگیں اور زمین پر گھاس کے ڈھیر پر ڈھیر لگنے لگے۔

✦✦✦

گھاس کی گٹھڑی زمین پر ڈال کر جیسے ہی پانی سے ہاتھ دھو کر وہ کھڑی ہوئی اسے کچھ خالی پن کا احساس ہوا۔ اس نے جلدی سے گردن پر ہاتھ پھیرا۔ اس کا دل دھک رہ گیا۔ گردن سے گانی غائب تھی۔

''اُف خدایا''۔ اس نے ماتھے پر ہاتھ مارا۔ جلدی جلدی ڈوپٹہ، کپڑے جھاڑے مگر کچھ نا گرا۔ وہ تیزی سے گھاس کی گٹھڑی کی جانب بڑھی گھاس کا تنکا تنکا دیکھ ڈالا مگر کچھ نا ملا۔

''اب کیا کرے وہ''۔ آخری بار اس نے گانی کو کھیتوں میں گھاس کاٹتے وقت دیکھا تھا۔ پھر نوری نسرین باتیں کرنے لگیں تھیں اور وہ خاموشی سے گھاس کاٹنے لگی تھی۔ ضرورت کے مطابق گھاس کاٹ کر ان تینوں نے اپنا اپنا کپڑا بچھایا، گھاس باندھی اور اپنے اپنے گھر کی راہ لی۔ یعنی کھیتوں سے گھر تک کے راستے پر ہی گانی کہیں گری تھی۔

''اب وہ دوبارہ کیسے کھیتوں میں گانی دیکھنے جائے'' وہ سوچنے لگی۔ تبھی اس کی نظر گندے کپڑوں کی گٹھڑی پر پڑی۔ جو صبح اس نے دھونے کیلئے اکٹھے کئے تھے۔ مگر دن بھر میں دھو نہیں پائی تھی۔ اس نے جلدی سے گٹھڑی بغل میں دبائی اور دروازے کی جانب چل دی۔

''اماں! میں نہر پر کپڑے دھونے جا رہی ہوں''۔ جاتے جاتے اس نے آواز لگائی۔

''اری! دونوں وقت ملنے والے ہیں، اس وقت نہر پر مت جا''۔ اس نے پیچھے اماں کی آواز سنی۔ مگر وہ ان سنی کرتی دروازہ پار کر گئی۔

✦✦✦

پُل پر کوئی کھڑا تھا۔ اس نے سر پر سے گٹھڑی اُتار کر دیوار پر رکھی۔ گٹھڑی میں ہاتھ ڈال کر کچھ نکالا، دیکھا اور پھر پوری قوت سے نہر میں پھینک دیا۔ گٹھڑی پھر سے سر پر رکھی اور چلنے لگی۔ حسد کا ناگ آخر جیت ہی گیا تھا۔ وہ ضو ضو کر کے جھومنے، ناچنے اور شور مچانے لگا۔ گانی

کو نہر میں پھینک کر نسرین نے اپنے اندر ڈھیروں سکون اترتا محسوس کیا۔ وہ شادی پل پر چلے جا رہی تھی اور پل کے نیچے نہر میں سیاہ گانی آہستہ آہستہ پانی کے بہاؤ کے ہمراہ بہہ رہی تھی۔

✧✧✧

ضوئی جب کھیتوں پر پہنچی وہاں کوئی نہیں تھا۔ گھر سے کھیتوں تک کا تمام راستہ وہ دیکھتی آئی تھی اور اب دیوانوں کی طرح کھیتوں میں ادھر اُدھر ڈھونڈ رہی تھی۔ مگر وہاں گانی ہوتی تو ملتی۔ اسے اداسی نے بُری طرح جکڑ لیا۔

"اسد ٹھیک تو ہوگا...... کہیں اس کے ساتھ کوئی حادثہ تو نہیں ہوگیا...... اتنے دن ہو گئے اس کی کوئی خبر بھی تو نہیں آئی۔" اس کے دل میں الٹے سیدھے گمان آنے لگے۔ وہ مردہ دلی سے کپڑے اٹھا کر نہر پر چلی آئی۔ کچھ ہی دیر میں اس کے ہاتھ زور زور سے کپڑے دھونے لگے اور آنکھیں پانی بہانے لگیں۔

"پیارے اللہ جی...... سب اچھا رکھنا...... سب ٹھیک رکھنا۔ سب کی خیریت رکھنا" اس کا دل مسلسل دعائیں کر رہا تھا۔ کپڑا دھو کر اس نے جونہی نہر کے پانی میں کھنگالا۔ کوئی چیز اس کی کلائی سے آ کر لپٹ گئی۔ اس نے گھبرا کر تیزی سے ہاتھ باہر کھینچا۔

سیاہ گانی اس کی دودھیا کلائی سے سیاہ ناگن کی مانند جھول رہی تھی۔

"اللہ جی"۔ خوشی سے بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔ کتنی ہی دیر وہ گانی آنکھوں کے سامنے کیے دیکھتی رہی۔ تبھی اس کی نظروں نے سامنے سے کسی کو آتے ہوئے دیکھا۔ ضوئی نے غور کیا وہ اسد تھا۔ جو ہاتھ میں سیاہ بیگ پکڑے چلا آ رہا تھا۔ اس نے بیقراری سے گانی کو مٹھی میں جکڑا اور خوشی سے اٹھ کر اسد کی جانب بڑھی۔

نسرین جیسے لوگ ہمیں اپنے اردگرد اکثر ہی دیکھنے کو مل جاتے ہیں۔ جو بلا کسی جواز کے دوسروں سے ان کی خوشیوں سے حسد کرنے لگتے ہیں۔ بلاوجہ کے حسد اور فضول گمان کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ اللہ پاک نے جب جس کو جس چیز سے نوازنا ہوتا ہے...... نواز دیتا ہے۔

✧✧✧

غار گر

سندس جبیں

پندرہویں قسط کا خلاصہ

ہے۔ فیروز کو نورِ نذر سے شدید محبت ہے۔ جبکہ اویس کو اتنا ہی وہ بُرا لگتا ہے۔ نورِ نذر اپنی تجسس طبیعت کے ہاتھوں اویس کے کمرے میں بار بار جاتا ہو۔ جس پر اویس اسے کھلے لفظوں میں وارننگ دیتا ہے، ایک دن اویس اسے چھپ کر اپنی باتیں سنتے دیکھ لیتا ہے۔ وہ طیش میں آ کر اس کے ساتھ مار پیٹ کرنا چاہتا ہے، اسی وقت فیروز وہاں آ جاتا ہے، اور نورِ نذر کو اس سے بچانے کی کوشش کرتا ہے۔ جس پر اویس، فیروز پہ اپنی جاسوسی کروانے کا الزام لگاتا ہے اور غضب ناک ہو کر پستول نکال لیتا ہے۔

نورِ نذر کے قتل کے بعد پیش آنے والے واقعات کا احاطہ کرتی ہے کہ کیسے اویس، فیروز پہ غلط الزام لگا کر اسے نورِ نذر کا قاتل ثابت کرتا ہے اور اس کیلئے گھر کے ملازموں کو ساتھ ملا لیتا ہے۔ اس کی سازش کامیاب ٹھہرتی ہے اور ابا میاں دلاور لغاری اُسے گھر سے نکال دیتے ہیں۔ فیروز، اویس کا سامنا کرتا ہے جہاں اویس کھلم کھلا اس کا مذاق اڑاتا ہے اور اُسے بتاتا ہے کہ اس نے سازش کے تحت اسے گھر سے نکلوا دیا ہے۔

اب آپ آگے پڑھیے

سولہویں قسط





اس نے خواب میں دیکھا!
اک ننھا ہاتھ،
جو اس کے مضبوط ہاتھ کو
اپنی ننھی اور کمزور اُنگلیوں سے
اپنی اور کھینچتا تھا......
اس نے بے ساختہ وہ ننھا ہاتھ
تھاما اور چوم لیا......
پھر نظر اُٹھ کر دیکھا تو دِل
دھک سے رہ گیا......
وہ ایک بے حد چھوٹا بچہ تھا
جو مسلسل رو رہا تھا......
رات تاریک اور گہری تھی
وہ خوفزدہ تھی،
وہ دربدر تھی،
آج اُسے پناہ چاہیے تھی،
اُسے ابا میاں کے گھر سے بے دخلی کا پروانہ مل چکا تھا۔
وہ دوڑ رہا تھا۔

پیروں میں مہنگے جوتے پہنے، وہ جوتے جو اُس کے باپ کی کمائی کے تھے، جب وہ انہی قیمتی جوتوں میں اپنے چچا کے در پہ گیا، کہ اگر وہ چند دن کیلئے اُسے پناہ دے سکیں؟

جواباً انہوں نے صاف انکار کر دیا تھا۔

"دیکھو فیروز، تم ابھی بچے ہو، رشتوں کی نزاکتوں کو نہیں سمجھتے، میں اپنے بھائی کے خلاف جا کر کبھی بھی تمہیں اپنے گھر میں پناہ نہیں دے سکتا۔" انہوں نے دوٹوک انکار کر دیا۔

"لیکن چچا جان! میری بات تو سُنیں۔" اُس نے گھگھیا کے کہا،

اس کے پیروں کے نیچے زمین کانپ رہی تھی۔ بھلا وہ کہاں جائے گا، کس سے چند دن کی پناہ مانگے گا۔

اگر اس کی بات سُننے سے سگے چچا نے ہی انکار کر دیا تھا تو آگے اس کی بات کون سُنے گا؟

"دیکھو بیٹے! جب باپ بات نہ سنے تو دنیا میں کوئی بات نہیں سُنتا اور جب باپ گھر میں پناہ نہ دے تو کوئی اور بھی اپنی چھایا تلے نہیں رکھتا۔" ان کا انداز دوٹوک تھا۔

فیروز نے سوکھے گلے کے ساتھ ان کی بات سُنی، اُسے شدید پیاس لگی تھی۔

مگر اب وہ بھلا پانی کیسے مانگتا؟

وہ واپسی کیلئے مُڑا۔

"سنو!" چچا نے پکارا۔

وہ مبہم امید سے مُڑا کہ شاید دل میں کوئی رحم آ گیا ہو۔
''کیا باپ نے اتنے روپے دے کر بھی گھر سے نہیں بھیجا کہ چند دن کہیں قیام کر سکو؟''
ان کا لہجہ طنزیہ نہیں تھا مگر فیروز کو کانٹے کی طرح چبھا، اس نے خالی خالی نظروں سے انہیں دیکھا۔
اُس سے بولا ہی نہیں گیا۔
''تمہارا چہرہ دیکھ کر لگتا ہے کہ پھر اب انکار میں ہی ہے''۔ وہ مزید بولے۔
''ایسا کرو، یہ جوتے بیچ دو۔''
یہ بہت قیمتی دکھائی دیتے ہیں۔'' انہوں نے سادہ سا حل پیش کیا فیروز کے اوپر جیسے قیامت گزر گئی۔
اس نے جلتی آنکھوں سے اپنے پیروں کو دیکھا، وہ جوتے بہت قیمتی تھے، واقعی بہت قیمتی تھے۔
''مشورہ دینے کا بہت شکریہ چچا جان، میں اسے یاد رکھوں گا۔''
اُس نے ضبط سے کہا اور قدم باہر کی سمت بڑھا دیئے۔
دنیا اجنبی تھی۔
لوگ ظالم اور بے پرواہ تھے۔
اور یہ وہ دنیا تو ہرگز نہیں تھی جہاں وہ رہنا چاہتا تھا۔ یہ تو رہنے کے قابل ہی نہ تھی۔ اس کی آنکھوں میں درد تھا جو بڑھتا ہی جا رہا تھا۔
ایک کے بعد ایک رشتے دار سے انکار سننے کے بعد جب اُس کی ہمت بالکل ختم ہو گئی تو اسے ''وہ'' یاد آیا..... اس کے بچپن کا دوست، میٹرک تک اس کا کلاس فیلو اور پھر دنیا کے میلے میں گم جانے والا......

✦✦✦

وہ رات عجب رات تھی۔
وہ بھاگتا رہا،
مدد کیلئے،
پناہ کیلئے،
اور پھر دو دن بعد اس نے اس زمین کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے چھوڑ دیا،
تین سال بیت گئے،
اس نے کسی سے رابطہ نہ رکھا،
اُسے اجازت ہی نہ تھی،
ابا میاں نے اسے گھر سے ہی نہیں ان کی زندگیوں سے بھی بے دخل کر دیا تھا۔ تین سال تک وہ چھپا رہا، کسی کو اُس کی کوئی خیر خبر نہ تھی۔ کسی سے اُس کا کوئی رابطہ نہ تھا۔
اماں، ابا میاں، فریا آپا تینوں کو کبھی معلوم نہ ہو سکا کہ اُسے زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔

(باقی آئندہ)

کیا کر رہا تھا؟

اور وہ شخص وہی تھا جو اُسے گھر سے در بدری کا پروانہ دلا چکا تھا۔

وہ شخص اویس لغاری تھا۔

مگر اُس نے مرتے دم تک ماں کو نہیں بتایا اور اماں فیروز کو ایک بار دیکھنے کو تڑپتی اس دنیا سے رُخصت ہوگئیں۔ مگر

اس کی زبان پہ لگا قفل نہ ٹوٹا،

اور جب ابا میاں گئے تو اس نے منشی امام کو گھر سے نکال دیا، وہ اس واقعے کے کسی کردار کو اپنے ارد گرد نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس نے منشی امام کو اس لئے بھی نکالا تھا کہ کبھی نہ کبھی کوئی انہیں سچائی نہ بتا دے، اُس کا خیال تھا ایسا کرنے سے ان کے اندر کا وہ خوف (کہ کہیں کسی کو سچ نہ پتہ چل کہ نورِ نذر کا اصل قاتل اویس تھا) ہمیشہ کیلئے ختم ہو جائے گا اور کسی حد تک اس نے اس پہ قابو بھی پا لیا تھا۔

وہ جانتا تھا کہ فیروز دبئی تھا، اور وہ وہاں کیا کام کرتا تھا، کس کے ساتھ رہتا تھا، کس سے رابطے میں تھا اس کے پاس ساری اطلاعات تھیں۔ اور اُس نے اس بات کو یقین بنایا تھا کہ اُس کی واپسی کی کوئی بھی راہ کھلی نہ رہ جائے،

اُسے اماں اور ابا میاں کے جانے کے بعد دراصل خوف کسی کا بھی نہیں تھا۔ مگر کہیں نہ کہیں فریا سے وہ ڈرتا تھا۔

فریا؟

اُس کی معذور بہن!

جس نے کئی سال پہلے شادی کیلئے انکار کر دیا تھا، اور ابا میاں کیا کمال کے باپ تھے انہیں لگتا تھا کہ ان کی بیٹی کبھی نہ کبھی اپنے فیصلے کو بدل لے گی جبھی انہوں نے اپنی جائیداد میں لمبا چوڑا حصہ اُس کے نام کیا تھا، یہ سوچ کر کبھی تو کوئی نہ کوئی اس کی دولت کے واسطے اُس سے شادی کو تیار ہو جائے گا،

اور دوسری طرف فریا تھی۔

اُسے کسی چیز سے کوئی غرض نہ تھی۔ مدت ہوئی اس نے راہِ سلوک اختیار کر لی تھی۔ اور جائیداد میں اپنا حصہ ایک ویلفیئر ٹرسٹ کے حوالے کر دیا تھا، یہ سب ابا میاں کے جانے کے بعد ہوا تھا۔

اُن کے بعد یہ اویس تھا جس نے انہیں ابا میاں کی وصیت پڑھ کر سنائی تھی۔ ابا میاں نے فیروز کو جائیداد سے کچھ نہیں دیا تھا، واضح طور پر عاق بھی نہ کیا تھا مگر یوں تھا کہ کہیں بھی اس کے حصہ میں کچھ نہیں رکھا گیا تھا۔

جبکہ فریاد کے نام اچھا خاصا حصہ تھا، فریا نے جب سارا حصہ ایک ویلفیئر ٹرسٹ کے نام کرنے کا فیصلہ کیا تو یہ اویس ہی تھا جس نے اس کی مدد کی تھی۔ وہ پانچ لوگ تھے جو کسی ٹرسٹ کے کرتا دھرتا ہے۔ انہوں نے فریا کو یقین دلایا تھا کہ اس زرِ کثیر سے وہ کئی یتیموں کی سرپرستی کریں گے اور کئی غریب اور نادار بچیوں کی شادیاں کروائیں گے،

فریا کو اور کیا چاہیے تھا؟

اُس نے خوشی خوشی اور معاہدے پر دستخط کر دیئے تھے۔

وہ اگر جان جاتی کہ یہ ترکہ اور ساری دولت ان دستخطوں کے بدلے میں وہ سارا ترکہ دراصل اویس کے اکاؤنٹس میں چلا گیا تھا تو شاید صدمے سے اس کا ہارٹ فیل ہو جاتا،

دولت اور طاقت کی یہ ہوس ایسی اندھی کھائی تھی جس میں ہر گزرتے دن کے ساتھ اویس گہرائی میں گرتا چلا جا رہا تھا مگر وہ بالکل بے خبر تھا۔

✦✦✦

اور یوں!

اویس ہر طرح سے کامیاب رہا اور اس نے فیروز کو پاکستان سے مکمل طور پر دور رکھا، فیروز کو پاکستان میں ہونے والی کسی بات کی کوئی خبر نہ تھی اور نہ ہی پاکستان میں رہنے والوں کو اس کی کوئی خبر تھی۔

یہ دراصل اویس کی (نام نہاد شہادت) پہ ہوا جب چیزیں فریا کے ہاتھ سے نکل گئیں، وہ اس سارے پریشر کو ہینڈل ہی نہ کر سکی، اس نے ہی اویس کے کاغذوں سے فیروز کو ڈھونڈا اور اُسے واپس آکر سب سنبھالنے کا کہا تھا۔

اور یوں یہ کہانی اپنے اختتام کو پہنچتی ہے۔

✦✦✦

آیئے! اب موجودہ زمانے میں واپس آتے ہیں، جہاں صفا اور فیروز شادی کر چکے ہیں۔ اور صفا اویس کو خُفیہ ایجنسیوں کے حوالے کر چکی ہے۔

✦✦✦

لب پہ کسی اجڑی ہوئی
جاگیر کا ماتم
ہر لفظ میرا حلقۂ زنجیر کا ماتم
دل میں کہیں بجھتے ہوئے ارمانوں
کا نوحہ
آنکھوں میں کسی یاد کی تصویر کا ماتم
ہر سوچ میں سنگین فضاؤں کا فسانہ
ہر فکر میں شامل ہوا تحریر کا ماتم
جب سے ہوا معلوم کہ یہ چاند ہے پتھر
کرتا ہوں میں اب چاند کی تسخیر کا ماتم
ہر حرف مرا کربِ مسلسل کی گھٹن میں
کرتا ہے میرے خانۂ دلگیر کا ماتم

اُس نے کمرے میں آکر چاروں طرف نگاہ دوڑائی، پھر اُسے احساس ہوا کہ اُس کے سینے میں عجیب سی گھٹن بھر گئی تھی۔

وہ اویس لغاری کو اپنے منطقی انجام تک پہنچا کر بھی خوش نہ تھی،

"انتقام خوشی نہیں دیتا۔"

آج اُسے بخوبی احساس ہوا تھا کہ وہ اپنے ہر زخم کا بدلہ لے کر بھی خوش نہ تھی،

وہ صفا تھی،

ایک لوئر مڈل کلاس سے تعلق رکھنے والی عام سی لڑکی، جس کی تعلیم وتربیت کا کوئی اہتمام نہیں کیا گیا تھا، جس کے ماں باپ نہیں تھے۔ اُس نے زندگی میں سب کچھ عجیب دیکھا تھا،

اویس کا اس کی زندگی میں آنا اور پھر یہ سب ہونا؟

ایسا عجیب تھا کہ ابھی تک اسے بھروسہ نہیں ہوتا تھا کہ یہ سب کسی فلم کی داستان نہیں تھا بلکہ حقیقت تھا۔

باجوہ صاحب نے اُسے یقین دلایا تھا کہ سب کچھ اس کی مرضی کے مطابق ہوگا، جو وہ چاہے گی وہی ہوگا۔

یہاں یہ بات سمجھ لینا ضروری ہے کہ صفا بنیادی طور پر نہ تو کوئی مجرمانہ ذہن رکھنے والی لڑکی تھی اور نہ ہی تربیت یافتہ جاسوس، بلکہ وہ عام سی لڑکی تھی،

اُسے جیسے جیسے ہدایات ملتی گئی تھیں وہ عمل کرتی گئی،

اور اب جبکہ ختم ہو چکا تھا۔

اُس کی اس کمرے کے ساتھ بہت تلخ یادیں تھیں۔ اُس نے نفرت بھری نظر اُس کمرے پہ ڈالی اور باہر نکل گئی۔ اُسے اب یہاں واپس نہیں آنا تھا۔ اُس کے پاس کئی پلان تھے اپنی اگلی زندگی گزارنے کیلئے۔

اُس کی زندگی میں اب اویس اور اُس سے جڑی چیزوں کی کوئی جگہ نہیں تھی۔

✧✧✧

عمر گزرے گی امتحان میں کیا
داغ ہی دیں گے مجھ کو دان میں کیا
خامشی کہہ رہی ہے کان میں کیا
آ رہا ہے میرے گمان میں کیا
دل کہ آتے ہیں جس کو دھیان بہت
خود بھی آتا ہے اپنے دھیان میں کیا
وہ ملے تو یہ پوچھنا ہے مجھے
اب بھی ہوں میں تیری امان میں کیا
یوں جو تکتا ہے آسمان کو تو
کوئی رہتا ہے آسمان میں کیا
ہے نسیم بہار گرد آلود
خاک اُڑتی ہے اس مکان میں کیا
یہ مجھے چین کیوں نہیں پڑتا

ایک ہی شخص تھا جہان میں کیا
ہال میں سکتہ طاری تھا
اور بجیل مراد کی آواز گونج رہی تھی، وہ خوبصورت دل میں اُترتی آواز، لب و لہجے کا اُتار چڑھاؤ اور جذبات کا رچاؤ۔"
یوں لگتا تھا جیسے اُس نے دل پرو دیا ہوا تھا۔
یہ مقامی سطح پر ہونے والا ایک مشاعرہ تھا جس میں اسٹیج سیکرٹری کے فرائض وہ سرانجام دے رہا تھا۔ سب سے آگے والی قطار میں حاجرہ نظر آ رہی تھی۔ سنہری چمکتی آنکھوں والی لڑکی اور اُس کے ساتھ سبھی بیٹھی تھیں۔ جن کے چہرے پہ ایک دلکش مسکراہٹ تھی اور وہ انتہائی حوصلہ افزاء انداز میں اُسے دیکھ رہی تھیں۔
وہ "واپس" آ چکا تھا۔
ایک ایسا شخص جو تقریباً خود کو مار چکا تھا۔
وہ واپس زندگی کی طرف لوٹ آیا تھا۔
اور اس سب میں سب سے بڑا ہاتھ اُس کی "ماں" کا تھا۔

✦✦✦

یہ سردار ہاشم اور گلِ لالہ کی شادی سے چند دن بعد کا تذکرہ تھا، اُن دونوں کو کھانا پیش کیا گیا تھا۔ سردار ہاشم گہری نظروں سے اُس کا جائزہ لے رہا تھا۔ اُس نے تھوڑا سا سلاد ڈالا اور پھر ساری ڈشز پہ نظریں دوڑا رہی تھی، وہ سارے مرغن کھانے تھے، اور شاید وہ مرغن غذاؤں کی عادی نہیں تھی جبھی اُس نے تھوڑا سا سالن اپنی پلیٹ میں ڈالا اور چند نوالے بمشکل نگلے، پھر سر جھکا کر سلاد ٹونگنے لگی۔ ہاشم نے خاموشی سے کھانا ختم کیا، وہ کچھ سوچنے پہ مجبور تھا۔

✦✦✦

یہ ذکر ہے رات کے کھانے کا
وہ عالیہ کے ساتھ تھا۔
عالیہ خاموشی سے اپنی پلیٹ پہ جُھکی ہوئی تھی، اُس نے دیکھا وہی سارے کھانے تھے جنہیں وہ بہت رغبت سے کھا رہی تھی، وہ سب جو شائد گلِ لالہ کو پسند نہیں تھا۔
"عالیہ" اُس نے کہا۔
عالیہ نے نظریں اُٹھا کر اُسے دیکھا، مگر بولی کچھ نہیں۔
"ہمارے گھر کے باورچی خانے میں ان کھانوں کے علاوہ کیا بن سکتا ہے؟" اس کا لہجہ سادہ سا تھا۔
عالیہ نے کڑی نظروں سے اُسے دیکھا۔
"کیوں؟ شہر سے آئی لڑکی کو ہمارے پکوان پسند نہیں آئے؟" اُس کا لہجہ زہر میں بجھا ہوا تھا۔
ہاشم نے چونک کر اُسے دیکھا، اُسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ اتنی جلدی بات کی تہہ تک پہنچ جائے گی۔
"ایسی تو کوئی بات نہیں"۔ اُس نے آہستگی سے کہا۔
"سچ بولنا اور سچ سننا سیکھیں سردار صاحب! میں نے خود کئی بار دیکھا ہے، وہ کھانا بہت کم کھاتی ہے

اور بعض دفعہ تو کھاتی بھی نہیں"۔ وہ حقیقت بتاتے ہوئے بولی۔
"اُس پہ اتنی نظر رکھ کر تمہیں کیا ملے گا؟" وہ افسوس سے بولا۔
"اذیت"۔ اُس کے یک لفظی جواب نے ہاشم کو ایسی چپ لگائی کہ وہ مزید کچھ نہ بولا۔

✧✧✧

جو درخت اُگاتا ہے
ہمیں ایک سیب دے دیتا ہے
ہم خنجر سے سیب کے
دو ٹکڑے کر دیتے ہیں
ہم کسی سے پوچھے بغیر
زندہ رہتے ہیں
اور کسی کو بتائے بغیر
محبت کرتے ہیں......

وہ ڈریسنگ روم میں کھڑی ایک کے بعد ایک لباس نکال کر دیکھ رہی تھی، وہ سب بہت بھاری لباس تھے۔ اُس کی پسند اور دلچسپی سے بہت پرے تھے۔

اس کے ہونٹ کاٹتے ہوئے ساری الماری دوبارہ سے چھان ماری مگر ظاہر ہے اُس کی تلاش بے کار تھی۔ وہاں اُس کے مطلب کا کوئی بھی لباس نہیں تھا۔

پھر جیسے مجبوراً اُس نے ایک زرد پھولوں والی لمبی سی فراک منتخب کی، اس پہ گلے اور دامن پہ بہت خوبصورت کڑھائی تھی، وہ دوسرے ملبوسات کی نسبت قدرے کم بھاری تھا۔

یہ تقریباً روز کا معمول تھا۔

یہاں دکھ بھی اس کی پسند کا نہیں تھا۔ کچھ بھی اس کی مرضی کا نہیں تھا۔

سردار ہاشم نے دیکھا،

رات وہ اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے اپنے کندھے دبا رہی تھی، جو بھاری لباس پہن کر یقیناً تھک گئی تھی، وہ بڑی دلگرفتی سے اپنے پاؤں کو دیکھ رہی تھی، جہاں فینسی جوتے پہننے سے نشان بن گئے تھے، سفید پیروں پہ بھورے نشان بہت عجیب اور بھدے لگ رہے تھے، وہ ڈریسنگ کے اسٹول پہ بیٹھی اپنے پیر دبا رہی تھی۔ یہ سارا منظر ایک بار پھر سردار ہاشم کو کچھ سوچنے پہ مجبور کر رہا تھا۔

یہ لڑکی عجیب طرح سے اُس پر اثر انداز ہو رہی تھی۔

✧✧✧

وہ خوابگاہ میں تھا، بستر پر دراز اس کی نظر گُل لالہ کے موبائل پہ پڑی، وہ چونکا، وہ جیسے بھول چکا تھا کہ وہ آج کے دور کی یونیورسٹی پڑھنے والی لڑکی تھی، اُس کے پاس موبائل ہونا کوئی اتنی حیرت انگیز بات نہ تھی۔

ایک اضطراب کے عالم میں اُس نے فون اٹھالیا۔ فون کو چھوتے ہی اس کی اسکرین جاگ اٹھی، اسے حیرت ہوئی گُلِ لالہ کے فون پر کوئی پاس ورڈ نہیں لگا ہوا تھا، اُس نے تصاویر والا خانہ کھولا، ایک

بے ساختہ سا تجسس تھا جو اُس سے یہ سب کروا رہا تھا۔
اس کی گیلری میں بے شمار تصاویر تھیں، تقریباً ہر تصویر میں اس نے لمبی فراک کے نیچے چوڑی دار پاجامہ اور کھسہ پہن رکھا تھا، کچھ کے نیچے کولہاپوری چپل تھی (آرام دہ جوتے اور سادہ لباس) کوئی چیز بھی ہاشم کے اندر کلک ہوئی تھی کہیں جیسے کوئی پوائنٹ نوٹ ہوا تھا۔
باقی تصاویر میں کثرت سردار تبریز کی تھی۔ کچھ تصاویر میں سردار محمد عالم بھی نظر آرہے تھے۔ اس کی اور تبریز کی تصاویر سے واضح ہوتا تھا کہ وہ اپنے بھائی کے بہت قریب تھے اور حیرت کی بات تو یہ تھی کہ وہ اتنے دن گزرنے کے بعد بھی بہن سے ملنے نہ آیا تھا۔
سردار ہاشم کو اس وقت اندازہ نہیں تھا کہ سردار تبریز نے دھوکے بازی سے گُلِ لالہ کو اس کی زندگی میں شامل کیا تھا۔ اب کس منہ بہن سے ملنے آتا؟
جبکہ اس نے کئی بار سحر سے بات کی تھی جس سے اُسے پتہ چلا تھا کہ سحر اور تبریز شمالی علاقہ جات میں سیر و تفریح کیلئے گئے ہوئے تھے۔

✧✧✧

بہت دشوار ہے میرے لئے
اس کرب کو سہنا
نہیں ممکن مگر اس درد کا
اب آنکھ سے بہنا
اگر فرصت ہو تو سُن لو
جنہیں پوروں سے چُنتے تھے
وہ آنسو رُلتے جاتے ہیں
جسے تم جان کہتے تھے
اگر وہ جان ہی نہ ہو
تو پھر پھولوں کی خوشبو
لے کر آنا بھی تو کیا آنا
جو دنیا میں کسی کا غم
نہ بانٹے ساتھی وہ کیسا
اور پلکوں کے گھنی جھالر
کے گرتے ہی
اسے رونا، بلانا، وقت کو
الزام دے دینا
بڑی فرسودہ باتیں ہیں
اور تم تو جانتے ہو گے
گرا آنسو، گیا لمحہ

کبھی واپس نہیں آتا۔

بجیل مراد کے کمرے کا منظر تھا۔

جہاں مختلف لوگ موجود تھے اور اس کمرے کی ری ماڈلنگ اور رینویشن زورِ ب تھے، پُرانی نشانیاں، پرانے درد، پرانا پینٹ اور پُرانا بجیل سب بدلے جا رہے تھے۔

سیمی بھی بہت ایکٹولی سب چیزوں کی نگرانی کر رہی تھیں۔

''بجیل جان! میرے خیال سے یہ پردے بہت بجیں گے، آسمان کا رنگ بہت Soothing ایفکٹ ڈالتا ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟'' انہوں نے محبت سے بجیل کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''جی مام، آپ صحیح کہہ رہی ہیں، اس کے ساتھ پینٹ کون سا سوٹ کرے گا؟''

وہ خوشدلی سے ماں سے مخاطب تھا۔

جواباً وہ پینٹ کلر والی کاپی اُٹھا کر اُسے بتانے لگی کہ اُن کے خیال میں مناسب کیا رہے گا؟

وہ ہر چیز کے متعلق اُس کی رائے لے رہی تھیں۔ اگرچہ زیادہ تر چیزوں کے متعلق وہ مکمل طور پر ماں پہ انحصار کر رہا تھا مگر اس کے باوجود وہ اُسے رائے میں شامل رکھ رہی تھیں۔ مقصد صرف اُسے مصروف رکھنا تھا۔

ان دونوں کو پتا تھا کہ بقا مصروفیت میں ہی تھی۔

''میڈم! یہ آپ کا کوریئر آیا ہے۔'' ملازم نے ایک باکس اس کے حوالے کیا۔ دونوں نے چونک کر دیکھا۔

سامنے سے حاجرہ چلی آ رہی تھی۔

اس کے لبوں پہ شاندار مسکراہٹ تھی اور بھوری آنکھیں چمک رہی تھیں۔

ابتدائی سلام دعا کے بعد وہ خوشدلی سے بولی۔

''آنٹی! بجیل کے روم کی ڈیکوریشن کیلئے ایک چھوٹا سا گفٹ''۔

اُس کے انداز پہ سیمی بے ساختہ مسکرائیں، وہ آگاہ تھیں کہ بجیل کی زندگی میں اس لڑکی کا عمل دخل بڑھتا ہی جا رہا تھا مگر یہ لڑکی انہیں پسند تھی جبھی انہیں اچھا لگ رہا تھا۔

✦✦✦

تم نے میرے کندھے پہ سر رکھا
کہ میرا ساتھ تمہارے لئے کتنا
اہم ہے
اور میں نے؟
میں نے تمہارے سر پہ سر رکھ دیا
کہ تمہارا وجود میرے لئے کتنا ضروری ہے؟

رات تاریک اور گہری تھی،

اس کے ہاتھ میں گرم چائے کا مگ تھا،

جو آج بڑی چاہت سے اس نے خود بنائی تھی۔

اس کے ساتھ سردار ہاشم کھڑا تھا۔ وہ دونوں اس وقت ایبٹ آباد میں تھے، جہاں ان کا اپنا ریسٹ ہاؤس تھا، "گلِ لالہ!" اُس نے پکارا۔

وہ دونوں اس وقت بالکونی میں کھڑے تھے جہاں سے ایبٹ آباد کا حسین نظارہ آنکھوں کو تراوٹ بخش رہا تھا، گلِ لالہ نے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا۔

"تم نے پوچھا نہیں میں تمہیں یہاں لے کر کیوں آیا ہوں؟" سردار ہاشم نے اس کے چہرے کا جائزہ لیا۔

"کیا مجھے پوچھنا چاہیے؟" وہ حاضر جوابی سے بولی۔

سردار ہاشم کے چہرے پہ ہلکی سی مسکراہٹ جھلکی، مگر وہ فوراً ضبط کر گیا۔

"تمہارے نزدیک میں اتنا ڈکٹیٹر ہوں کہ تمہیں بولنے کی اجازت نہیں دوں گا؟" اُس نے شگفتگی سے پوچھا۔

"آپ بہت سخت مزاج ہیں"۔ وہ بے ساختہ بولی۔

سردار ہاشم نے ایکدم چونک کر اُسے دیکھا"

"اچھا؟ وہ کیسے؟" وہ متجسس ہوا۔

"یہ تو مجھے نہیں پتا۔ مگر سب آپ سے ڈرتے ہیں۔" وہ اُسی سکون سے چائے کے گھونٹ پیتی اُسے بے سکون کر گئی۔

اس نے بے ساختہ گل کا بازو پکڑ کر اُسے اپنے طرف کھینچا۔

اس کا ہاتھ لرزا اور تھوڑی سی چائے چھلک گئی۔

ہاشم نے اُسے بازو کے گھیرے میں لے لیا۔

"سب کا تو مجھے بھی نہیں پتا۔ مگر کیا تم ڈرتی ہو؟" اس سرگوشی میں پوچھا۔

گل نے چائے کا کپ ریلنگ پہ رکھ دیا، اُسے خدشہ ہوا کہ وہ اُس کے ہاتھ سے گر نہ جائے۔

اُس نے سر اُٹھا کر اسے دیکھا۔

"یہ سوال اب مجھ سے وہاں کھڑے ہو کر بھی کر سکتے تھے۔" اس نے ہاتھ سے اُس کی جگہ پہ اشارہ کیا، انداز اتنا بے ساختہ تھا کہ ہاشم کے دل کو کچھ ہوا۔

"پھر مجھے پتا کیسے چلتا کہ تم مجھ سے ڈرتی ہو یا نہیں"۔ وہ مسکرایا، ایسی جان لیوا مسکراہٹ، گلِ لالہ نے خود کو اُس کے اثر میں محسوس کیا۔

"تو پھر کیا نتیجہ نکالا آپ نے؟" وہ چہرہ اُٹھا کر بولی، آنکھیں اُس کی آنکھوں میں ڈال کر، لہجے میں اعتماد۔

"یہی کہ سردار ہاشم نے کہنا شروع کیا، "ایک لڑکی ہے گل لالہ"

لالے کے پھول سی، جو پسند کے پکوان نہ پکنے پہ کھانا نہیں چھوڑتی، جو من پسند لباس نہ ہونے پہ شکوہ نہیں کرتی، جو غیر آرام دہ جوتوں میں شکایت نہیں کرتی، بس زندہ رہنے کی اپنی سی کوشش جاری رکھتی ہے، شاید اُس کی یہی کوشش مجھے بھا گئی، شاید اس کی یہی ادا مجھے پسند آ گئی"۔

وہ اُس کے بالوں پہ ہونٹ رکھے دھیرے دھیرے بول رہا تھا، اور تاریک اور گہری رات میں

کہیں کہیں تارے چمک رہے تھے۔

✧✧✧

ہمیں اندازہ رہتا ہے
ہمیشہ دوست دشمن کا
نشانی یاد رکھتے ہیں
نشانہ یاد رکھتے ہیں

گلِ لالہ کو بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ سردار تبریز نے اُس کے لئے جو کانٹوں کی فصل بوئی تھی اُس کا خمیازہ بہت سے لوگ بھگتیں گے، تبریز نے شادی کے ابتدائی عرصے میں ہی اُس سے کُرید کُرید کر سردار ہاشم کے اثاثہ جات کے متعلق ساری تفصیل پوچھ چکا تھا مگر وہ بالکل لاعلم تھی، جس پہ تبریز سوائے دانت کچکچانے کے اور کچھ نہیں کر سکا تھا۔

اُس نے آنکھیں بند کر کے یہ چال چلی تھی مگر ہاتھ کچھ نہیں آیا تھا۔

دوسری طرف سردار محمود گل لالہ کو لے کر شدید غم و غصے کا شکار تھے، وہ اُسے بے حد یاد کر رہے تھے، دوسرے انہیں کہیں نہ کہیں یہ احساس تنگ کرتا تھا کہ انہوں نے گلِ لالہ کے ساتھ زیادتی کر دی تھی۔ وہ بے قصور تبریز کی جنگ میں ماری گئی تھی۔

اپنے اس پچھتاوے کا اظہار وہ کئی بار تبریز کے آگے کر چکے تھے۔ مگر اُس کی کان پہ جوں تک نہ رینگی تھی۔ وہ سب کچھ بُھلا کر اپنی زندگی میں مگن تھا۔

مگر انہی دنوں سردار محمود کی طبیعت خراب رہنے لگی، انہیں دل کا مسئلہ ہو گیا تھا۔ ڈاکٹرز نے بائی پاس تجویز کیا تھا۔

مستزاد یہ کہ سحر امید سے ہوئی تو پہلی بار تبریز کو واقعی بہانہ مل گیا کہ وہ گلِ لالہ کو لے آئے۔"

اور اگر سردار ہاشم کی بات کی جائے تو سردار ہاشم کو اس بات سے قطعاً کوئی فرق نہ پڑتا تھا کہ تبریز کبھی بہن سے ملنے کیوں نہ آیا تھا۔ اُس کے نزدیک یہ نارمل بات تھی، وہ خود مہینوں اپنی بہن کے گھر نہیں جا پاتا تھا۔

مگر اُسے حیرت تب بھی نہ ہوئی جب تبریز اُسے لینے آیا، وہ ہر چیز بُھلائے اپنے بھائی کی مہمان داری میں مگن تھی، پہلی بار اُسے تھوڑا حسد ہوا۔ وہ یقیناً اپنے بھائی سے بے حد محبت کرتی تھی، جبھی اُس کے اجازت مانگنے پہ اُسے ہاں کہتے ہی بنی۔

پھر وہ تبریز کے ساتھ چل گئی، سردار ہاشم کو اندازہ نہیں تھا کہ اُس کے بعد پیش آنے والے واقعات اتنے بھیانک ہوں گے۔ جب وہ چلی گئی تو اُس کے بعد اُس نے سردار ہاشم سے کوئی رابطہ نہیں کیا۔ یہاں تک کہ سحر کی ڈلیوری کا دن آن پہنچا۔

آپا اور عالیہ نے سحر کے ہونے والے بچے کیلئے ڈھیروں تیاریاں کی تھیں۔ وہ سب دشمنیاں بُھلائے دل سے سردار تبریز کی خوشی میں شریک ہونا چاہتے تھے۔

سب سے خاص تیاری عالیہ نے کی تھی۔ اگرچہ وہ جانتی تھی کہ وہ خود اس خوشی سے محروم رہے گی مگر اُس نے سحر کی ساری تیاری کی تھی جس میں سحر کے ساتھ جوڑے، ننھے مہمان کے اکیس جوڑے،

کھلونے، جھولے، چھوٹے چھوٹے بستر، ململ، رنگ برنگی اونی ٹوپیاں، جرابوں کے جوڑے چھوٹے چھوٹے سوئیٹر اور بے شمار ال بلا شامل تھا۔

اگرچہ سردار ہاشم کا بالکل دل نہیں تھا کہ وہ عالیہ کو لے کر گلِ لالہ کے گھر جاتا مگر بہرحال وہ اُسے سحر کی خوشیوں میں شامل ہونے سے نہیں روک سکتا تھا۔

مقررہ دن آپا کو گلِ لالہ کی فون کال آئی تھی کہ وہ اُسے لے کر ہاسپٹل جا رہے تھے۔

اس کے بعد وہ سارا قافلہ پوری تیاری کے ساتھ چل پڑا۔ وہ سب اس بات سے آگاہ نہیں تھے کہ قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

✦✦✦

لوگ پتھر پھینکیں گے
تم وہ پھول دیکھنا
جو میں بھیجوں
لوگ نفرت کریں گے
تم میری نظروں سے
خود کو دیکھنا!
لوگ بُرا برتاؤ کریں گے
تم ویسا برتاؤ قبول کرنا
جیسا میں تمہارے ساتھ رکھتی ہوں
تم لوگوں کی باتوں کو مت سُننا
وہ سب یاد رکھنا!
جو میں کہتی رہتی تھی
جو میں کہتی رہتی تھی

اُس کا فون بار بار بج رہا تھا۔ مگر وہ ذہنی طور پر وہاں حاضر کب تھا۔ اُس کے دماغ میں شرارے چھوٹ رہے تھے۔ اُس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اُڑتا ہوا جائے تو گلِ لالہ کا حشر کر دے۔

وہ ہاسپٹل سے کچھ ہی دور تھا جب مسلسل بجتے فون سے تنگ آ کر اُس نے فون اُٹھا لیا۔

دوسری طرف گلِ لالہ تھی۔

وہ مسلسل چیخ رہی تھی، بلند آواز میں رو رہی تھی۔ اور شاید کچھ کہہ بھی رہی تھی۔

تبریز نے غائب دماغی سے اُس کی فون کال سُنی، اُسے بات سمجھنے میں دِقت ہو رہی تھی۔

اُس نے خود کو بلند آواز میں چلاتے سُنا۔

"کیا کہہ رہی ہو؟ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی لالی" ۔ وہ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"ہاسپٹل سے باہر آ کر بات کرو، وہاں سگنلز نہیں ہوتے۔" وہ اونچی آواز میں چلا رہا تھا۔

مگر لالی تھی کہ سمجھ ہی نہیں رہی تھی بس روئے چلی جاتی تھی۔

جو چند لفظ اُس کی گفتگو میں تبریز کو سمجھ آئے، وہ لفظ نہیں بم تھے، جو اُس پہ پھٹے اور قیامت ڈھا گئے۔

''سحر..... موت..... بچہ..... زندہ..... بیٹا..... سحر..... مر گئی، سحر چلی گئی..... لالہ..... بھابھی نہیں رہی.....'' اُس نے بے ساختہ گاڑی کا اسٹیئرنگ سنبھالنے کی کوشش کی مگر وہ اُس کے ہاتھ سے چھوٹتا چلا گیا..... گاڑی ایک دھماکے سے گرین بیلٹ کی باڑ سے لگی، اور اُس کے ساتھ والی سیٹ پہ پڑا وہ ایسڈ کا جار ٹوٹ گیا..... گاڑی میں ہر طرف تیزاب کی تیز سڑانڈ، دھواں اکٹھا ہوتا گیا۔

اُس کا سر بُری طرح سیٹ کی پشت سے ٹکرایا..... آنکھوں کے آگے تارے ناچ گئے، سائیڈ والی کھڑکی کا شیشہ دھماکے سے ٹوٹا اور کرچیاں ہر سو پھیل گئیں۔

اُس کے حواس جاتے رہے۔ اُس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔

✧✧✧

یہ منظر بہت تکلیف دہ تھا۔

جوان موت،

سحر ثناء کی میت،

تبریز کی دگرگوں حالت،

اور سب کے بے پناہ غم و اندوہ ایسے لگ رہا تھا جیسے ظلم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہو۔

یقین تو سردار ہاشم کو بھی نہیں آیا تھا۔

بُری حالت عالیہ کی تھی جو کتنے چاؤ اور محبت سے سحر کے جوڑے بنا کر لائی تھی، جس کے ایک ایک ٹانکے میں اس کی محبت تھی۔

آپا کو..... جنہیں وہ اکیلا کر گئی۔

اور اگر اس سب میں کوئی بے پرواہ تھا تو وہ گُلِ لالہ تھی۔ جس کا سارا دھیان اُس ننھے بچے کی طرف تھا۔ جو بلک بلک کر منہ کھولتا تھا اور اُس کی بھوک مٹانے کی خاطر وہ کچن میں کھڑی چھوٹے سے فیڈر میں دودھ ڈال رہی تھی۔

اُس رات وہ سوئی تو پہلی بار اُسے وہ خواب آیا..... جو آنے والے خوابوں کا ایک تسلسل تھا۔

اُس نے خواب میں دیکھا.....

✧✧✧

دروازہ بہت دیر سے بج رہا تھا۔

اُس نے بمشکل آنکھیں کھولنے کی کوشش کی۔

رات وہ خواب آور گولیوں کی بھاری مقدار کھا کر سویا تھا اور اب اس کا سر پھٹ رہا تھا۔

اُس نے لڑکھڑاتے قدموں پہ وزن ڈالنے کی کوشش کی مگر وہ بُری طرح ناکام ہو گیا۔

چند لمحے خالی الذہنی کے عالم میں آنکھوں پہ ہاتھ رکھے بیٹھا رہا، جبکہ دستک مسلسل ہو رہی تھی۔

''کس کی موت آئی ہے؟'' وہ شدید بے زاری سے بڑبڑایا اور اُٹھا، اب کی بار قدم لڑکھڑا رہے تھے مگر وہ کسی طرح دروازے تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ دروازہ کھولتے ہوئے اُس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اُس نے دروازہ کھولا تو سامنے جبار کھڑا تھا۔

''سردار صاحب! بڑے سردار صاحب آپ کو کھانے کی میز پہ یاد کر رہے ہیں۔ اُن کا حکم ہے کہ

آپ فوراً تشریف لائیں۔'' جبار نے نظریں جھکا کر مؤدبانہ انداز میں کہا۔

''جبار! مجھے سونے دو...... مجھے تنگ مت کرو'' ۔ وہ دھاڑا، مگر آواز زیادہ بلند نہیں تھی۔ کمزوری کے باعث اُس سے بولا ہی نہیں گیا۔

''سردار صاحب آپ دو دن اور دو راتوں سے سو رہے ہیں۔'' وہ جیسے یاد دلا رہا تھا۔

تبریز کے اُوپر جیسے حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔

وہ تو اپنے تئیں ایک رات کیلئے سویا تھا۔ صدمہ اس قدر جانکاہ تھا کہ اس سے ضبط نہیں ہو رہا تھا۔ مگر یہ جبار کیا کہہ رہا تھا۔ اُسے یقین نہیں آیا۔

''تمہارا دماغ ٹھیک ہے؟ کیا بک رہے ہو؟'' اس نے حیرت سے کہا۔

مگر جبار جواب دینے کی بجائے اُسے سہارا دیتا اندر لے آیا۔ پھر اس کی گھڑی اُٹھا کر اُس کی طرف بڑھائی۔

وہاں ۱۱ دسمبر کی تاریخ چمک رہی تھی۔

اُسے یاد آیا...... سحر نور دسمبر کو اُسے چھوڑ کر گئی تھی۔ جب اُس کی میت کو کندھا دینے کے بعد لحد تک پہنچا کر وہ واپس آیا تو ہر چیز سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔

جبھی وہ ڈھیر ساری گولیاں کھا کر سو گیا اور اب جبار اسے بتا رہا تھا کہ سحر کو گئے تین دن ہو گئے۔

''وہ چلی گئی؟''

اُس نے خود سے سوال کیا۔

''وہ کہاں چلی گئی!''

اُس کی ساری چالبازیوں اور نفرتوں کے باوجود...... وہ اُس کی بیوی بن کر اُس کی زندگی میں آ گئی تھی۔

اُس کی سازشوں کے باوجود وہ اُس سے محبت کرتی رہی۔

''وہ لڑکی کیسے چلی گئی؟

وہ اُس سے محبت کرنے والی، اس کا دم بھرنے والی،

وہ اس کی ہمسر،

وہ اس کی دمساز،

اُس کی سحر ثنا؟

اُسے ایک خوبصورت اور تندرست بیٹے کا تحفہ دے کر خدا حافظ کہہ کر چلی گئی،

اور اب وہ اکیلا تھا۔

حقیقت کا تپتا سورج اُس کے دماغ پہ دستک دے رہا تھا، اور زمین اُس کے پیروں کے نیچے سے سرک رہی تھی۔ وہ جو سب کچھ جانتے ہوئے بھی اپنی محبت پہ یقین رکھتی تھی،

کیسے ایک لمحے میں اُس سے بچھڑ گئی۔

یکا یک اس کی آنکھیں جلنے لگیں۔

اُس کا دل چاہا وہ ڈھیر سارا روئے،

اُس نے جبار کو واپس جانے کا اشارہ کیا۔

وہ اگرچہ جانا نہیں چاہتا تھا مگر اُس کے حکم کے آگے بھی مجبور تھا، جبھی باہر نکل گیا۔
اور وہ دروازہ بند کر کے اُسی سے ٹیک لگا کر زمین پہ بیٹھتا چلا گیا۔
اُس کے ہاتھ بند مٹھیوں کی صورت اُس کے ہونٹوں پہ تھے۔
اور آنکھوں سے سیال مادہ بہہ رہا تھا۔
وہ سِسک سِسک کر رہ رہا تھا۔
وہ سحر کو پکار رہا تھا۔
وہ درد سے دہرا ہوتا زمین پہ گر گیا تھا۔
اُسے رونا تھا۔
اُسے سمندر جتنا رونا تھا۔
اتنا رونا تھا کہ اُس کا سارا غم آنسوؤں میں بہہ جائے اور دوبارہ اُسے کبھی سحر ثناء کی یاد نہ آئے۔
وہ ایک ایسے ہما پرندے کی مانند تھا جو اپنی راکھ سے دوبارہ جنم لے گا۔
اور پھر وہ سب نے ایک عجیب منظر دیکھا۔
وہ شام کا وقت تھا۔
جب اُس کے کمرے کا دروازہ کھلا۔
سیاہ شلوار قمیص پہ دھاری دھار واسکٹ پہنے، بالوں کو جمائے، مونچھیں اکڑائے وہ تر و تازہ دکھائی دیتا تھا۔
بس اُس کی آنکھیں تھیں جو کثرت گریہ سے سُرخ تھیں اور اس بات کی صاف چغلی کھائی تھیں کہ وہ غم ''منا'' چکا تھا۔ رات کے کھانے پہ وہ میز پہ موجود تھا۔
سردار محمود عالم نے سکون محسوس کرتے ہوئے بیٹے کو دیکھا۔
''کھانے کے بعد مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے بابا''۔ اُس نے بڑی رغبت سے اپنی پلیٹ میں کھانا ڈالتے ہوئے کہا۔ لہجہ بالکل نارمل تھا۔
سردار محمود نے ہلکا سا مسکرا کر سر ہلا دیا۔

✧✧✧

وہ بڑی مگن سی ننھے بچے سے کھیلنے میں مگن تھی۔
جب اُس کا فون بج اُٹھا۔ اُس نے پھونک کر دیکھا۔
''سردار ہاشم کالنگ''۔
اُسے حیرت ہوئی۔ جب سے وہ یہاں آئی تھی وہ آج پہلی بار کال کر رہا تھا۔
اُس نے کال اُٹھالی۔
''السلام علیکم''۔ وہ آہستہ سے بولی۔
''وعلیکم السلام''۔ وہ اپنی مخصوص جاندار آواز میں بولا۔
''کیسے ہیں آپ؟'' وہ سادہ سے انداز میں حال پوچھ رہی تھی۔
''ٹھیک ہوں اور تم؟'' اُس نے بھی رسم پوری کی۔

یوں جیسے وہ دونوں ہمیشہ سے یونہی باتیں کرنے کے عادی ہوں۔

"میں بھی ٹھیک ہوں"۔ وہ بولی۔

"کیا کر رہی ہو؟"

"مصروف ہوں"۔

"کس کے ساتھ؟" بے ساختہ پوچھا۔

"چھوٹے بے بی کے ساتھ"۔

"بچے پسند ہیں تمہیں؟"

"جب سے یہ ملا ہے تب سے پسند ہیں"۔ وہ ہلکا سا ہنسی۔

"گھر واپس کب آؤ گی؟" اُس کے انداز میں کچھ ایسا تھا جس نے گلِ لالہ کو چونکا دیا۔

"اتنی جلدی کیا ہے؟" وہ بے ساختہ بولی۔

ہاشم کو حیرت ہوئی۔

"جلدی؟" وہ دہرا کر بولا۔

"ہاں" گل نے کہا۔

"تین ماہ بعد تمہیں فون کر رہا ہوں تمہیں لگتا ہے یہ جلدی ہے؟" سردار ہاشم نے جتا کر کہا۔

وہ جواباً خاموش رہی۔

"آ جاؤں گی"۔ کچھ دیر بعد وہ بولی۔

"ٹھیک ہے۔ تمہاری مرضی جب مرضی آؤ"۔ سردار ہاشم نے کہا۔

"آپ کیا کر رہے تھے؟" گلِ لالہ نے بات بدلنے کی خاطر پوچھا۔

"سرداری...... سرداری کر رہا تھا"۔ وہ بے ساختہ بولا۔

"گل کی ہنسی اتنی اچانک اور غیر متوقع تھی کہ وہ خفت زدہ ہو گیا۔

"وہ تو آپ ہمیشہ ہی کرتے ہیں"۔ وہ بھی جان بوجھ کر چڑانے والے انداز میں بولی۔

"اچھا...... تم پر تو کبھی نہیں کی"۔ سردار ہاشم نے بھی کاؤنٹر اٹیک کیا۔

وہ چند لمحے خاموش رہی۔

"صحیح کہہ رہے ہیں"۔ اس کا لہجہ آہستہ تھا۔

"ہوں"۔ وہ مختصر بولا۔

"جلد واپس آ جاؤں گی"۔ اُس نے کہا۔

"بہتر"۔ ہاشم نے جواب دیا۔

"اللہ حافظ"۔ گل نے کہا۔

"اللہ کی امان"۔ ہاشم نے کہا۔

اور فون بند ہو گیا۔

فون تو بند ہو گیا مگر اُس کے آگے سوچوں کے کئی در وا کر گیا۔ اُسے آج بھی وہ دن روزِ روشن کی طرح یاد تھا جب وہ ایک جذباتی لمحے کی لغزش کا شکار ہو کر حاجرہ کی کال پہ بجیل سے ملنے چلی گئی تھی۔

مداوا ممکن نہیں

عنبرین ابدال

حالب جیسے ہی لاؤنج میں داخل ہوا، سب اُس کی طرف متوجہ ہو کر مسکرا کر اسے دیکھنے لگے۔

"کیا بات ہے؟ خیر تو ہے جو یوں سب مجھے دیکھ کر مسکرا رہے ہیں۔" حالب نے سلام کرنے کے بعد اپنی چھوٹی بہن سمرہ کے برابر صوفے پہ بیٹھتے ہوئے اُس کی جانب جھک کر سرگوشیانہ انداز میں استفسار کیا۔

"جی بالکل، سب کی خیر ہے۔ مگر آپ کی خیر نہیں......" سمرہ نے آنکھیں مٹکا کر معنی خیز لہجے میں سسپنس کری ایٹ کرتے ہوئے کہا۔

"کیوں میں نے کیا کیا؟" حالب نے حیران ہو کر لاؤنج میں بیٹھے تمام افراد کی طرف دیکھا۔ سمرہ پھر سے مسکرا کر بڑے بھیا کی طرف دیکھنے لگی۔ اب کے حالب چڑ ہی گیا۔

"مما کیا بات ہے۔ سب مجھے دیکھ کر عجیب ساری ایکٹ کیوں کر رہے ہیں؟" حالب نے کنول بیگم کی جانب رُخ موڑ کر خود ہی پوچھ لیا۔

ناولٹ

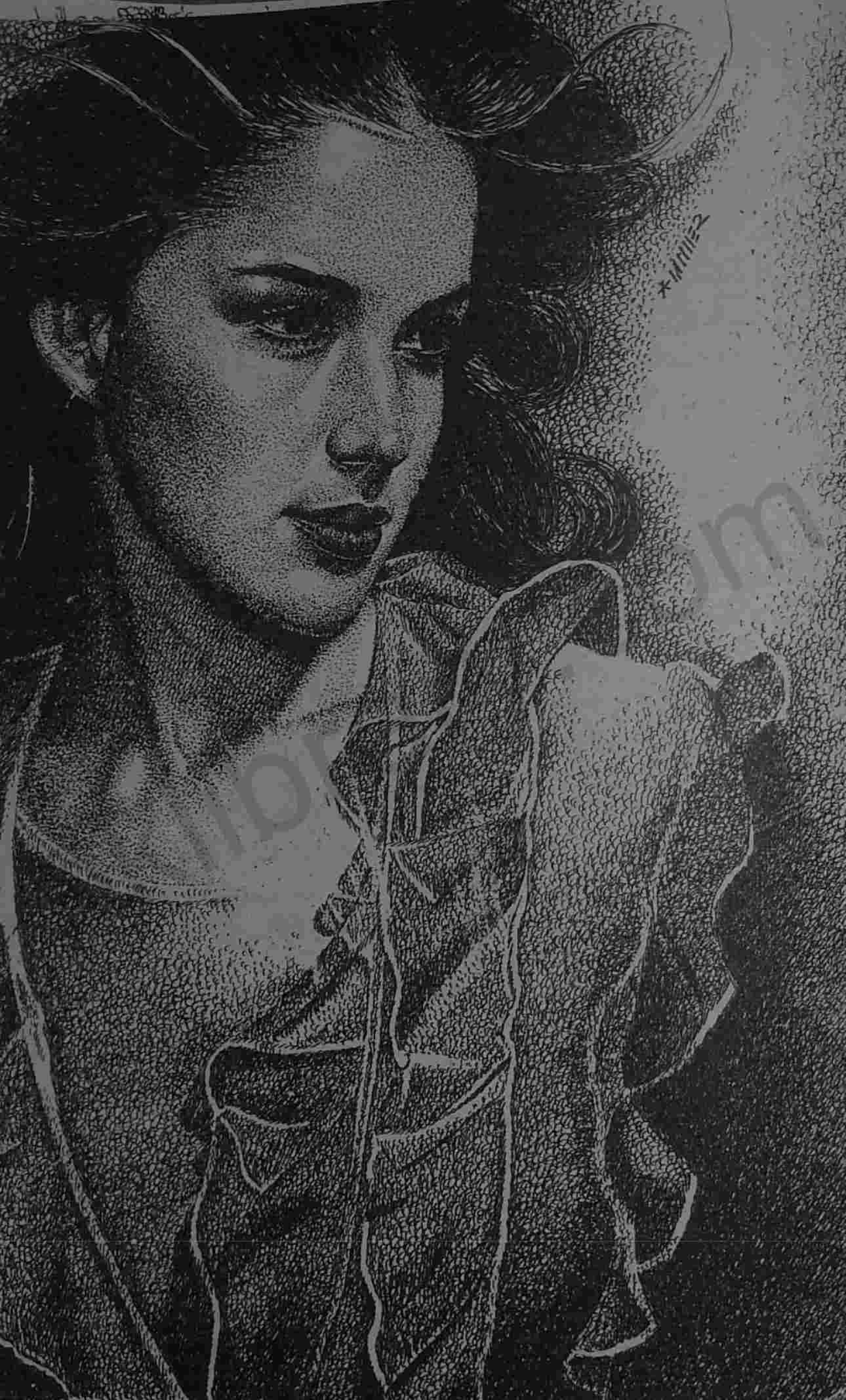


"ادھر آؤ مائی ینگ مین۔" اشفاق صاحب نے حالب کو اپنے پاس صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ حالب انہیں نا سمجھی سے دیکھتے ہوئے اُٹھ کر ان کے پاس آ بیٹھا۔

"ہمارا تو ابھی کوئی ارادہ نہیں تھا۔ مگر تمہارے بھیا کا خیال ہے۔ اب تمہیں قید کر دینا چاہیے۔" اشفاق صاحب نے ہنستے ہوئے حالب کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"مطلب؟" حالب نے نافہم تاثرات سے اپنے بڑے بھائی احسن کی جانب دیکھا۔

"بھئی بس کرو۔ میرے بیٹے کو مزید تنگ مت کریں۔" آخرکار کنول بیگم کو حالب کی معصوم صورت پہ ترس آ ہی گیا۔ اور وہ حالب کی حمایت میں میدان میں اتر آئیں۔



"اُرے مما، یہ تو زیادتی ہے۔" احسن نے دہائی دی۔

"کوئی زیادتی نہیں ہے جب سے حالب آیا ہے سب اُسے مل کر تنگ کیے جا رہے ہیں۔ اب مزید میرے بیٹے کو تنگ نہ کیا جائے۔" کنول بیگم نے محبت بھری نظروں سے حالب کو دیکھتے ہوئے تحکم آمیز لہجے میں کہا۔

"آخر ہوا کیا ہے؟ مجھ غریب کو کوئی یہ تو بتا دے۔" حالب نے بے چارگی سے دہائی دیتے ہوئے کہا۔

"کچھ نہیں ہوا۔ سوائے اس کے تمہارے بابا اور بھیا کا خیال ہے۔ تمہارے لئے یشفین کو جلد از جلد مانگ لیا جائے۔ اس سے پہلے کہ کوئی اور سوال کرے۔ ہم یشفین کو اپنے گھر لانا چاہتے ہیں۔ تمہاری دلہن بنا کر......!" کنول بیگم نے آخر کار بلی تھیلے سے باہر نکال ہی دی۔

"جی......" حالب ہونق چہرہ لیے سب کو حیرت سے دیکھنے لگا۔

"صبح تو میں آپ کو اور باقی سب کو بالکل ٹھیک ٹھاک حالت میں چھوڑ کر یونیورسٹی گیا تھا اور اب اچانک سے یہ بات آپ سب کے ذہن میں کہاں سے آ گئی۔" حالب حقیقتاً حیران ہوا۔

"بس خیال آنا تھا۔ آ گیا تھا۔ اب تو بتاؤ برخوردار تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں یا کسی اور لڑکی کے ساتھ وعدے وعید تو نہیں کر رکھے۔" اشفاق صاحب نے حالب کی پشت کو سہلاتے ہوئے ہلکے پھلکے لہجے میں استفسار کیا۔

"نہیں بابا، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" حالب نے شرمندہ ہوتے ہوئے آہستگی سے کہا۔

"یعنی ہم یشفین کے لئے دست سوال کریں۔ تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔" احسن نے دریافت کیا۔

"یشفین......" حالب نے زیر لب کہا۔ اُس کے تصور میں من موہنی پیاری سی شرمائی لجائی یشفین کا سراپا گھوم گیا۔

"اگر تمہیں کسی بھی طرح اعتراض ہے۔ یا کوئی اور پسند ہے تو تم ہم سب کو فرینکلی بتا سکتے ہو۔ کوئی زبردستی نہیں ہے۔" احسن نے فدویانہ انداز میں کہا تو حالب اپنے خیالوں سے چونک کر اُسے دیکھنے لگا۔

"نہیں بھیا! مجھے کوئی اور پسند نہیں ہے۔ جیسے آپ لوگوں کی مرضی ہے۔ میری بھی وہی مرضی ہے۔ بھابھی پلیز مجھے کھانا تو دے دیں۔" حالب نے کہہ کر سمعیہ کی طرف رُخ کر کے کہا۔

"دیکھا...... میں نے کہا تھا ناں! حالب بھیا کبھی بھی یشفین کو انکار نہیں کریں گے۔" سمرہ نے نعرہ لگا کر پرجوش لہجے میں اشفاق صاحب اور احسن سے کہا۔

"بھئی سمرہ تو بڑی پیرنی ہے۔ بابا دعائیں وغیرہ کروالیا کریں۔" احسن نے شرارتی انداز میں اشفاق صاحب کی جانب جھک کر کہا تو اشفاق صاحب قہقہہ لگا کر ہنس دیے۔ کنول بیگم نے اُٹھ کر حالب کو اپنے گلے سے لگا لیا۔ وہ سب مسکرا رہے تھے۔ حالب بھی اطمینان بھری مسکراہٹ لبوں پہ سجائے بیٹھا تھا۔

ماں باپ کی خوشی سے بڑھ کر اور کیا سعادت ہوگی۔ اور پھر بھلا کون یشفین کو انکار کرسکتا ہے۔ معصوم سی بھولی چہرے والی یشفین حالب کے تایا کی سب سے چھوٹی بیٹی تھی۔ حالب کو وہ اچھی تو لگتی ہے مگر اس نے کبھی اس "اچھی" لگنے والے کا تذکرہ یشفین سے نہیں کیا

تھا۔ پہلی وجہ ایک تو وہ خود ابھی پڑھ رہا تھا اور دوسری وجہ یشفین کا خود بھی انتہائی محتاط رویہ تھا۔ ایک دو بار حالب کے دل میں آیا بھی کہ وہ اسے بتائے۔ مگر ابھی اُس کے دل کی بات زبان تک بھی نہیں آئی تھی کہ اس کے گھر والوں نے خود یشفین کا نام لے لیا۔

”یشفین اشتیاق۔“ حالب نے دل ہی دل میں اس کا پورا نام لیا اور اپنے لبوں پہ آنے والی بے ساختہ مسکراہٹ کو چھپانے کی غرض سے سیل فون پہ جھک گیا۔

کچھ لوگ بہت خوش قسمت ہوتے ہیں۔ جنہیں ان کی پسند بنا کسی رکاوٹ کے مل جاتی ہے۔ حالب کو اپنا آپ انہی خوش قسمت لوگوں میں لگ رہا تھا۔ ایک دم حالب کا فون بج اُٹھا۔ دوسری جانب اس کا بچپن کا دوست عمار تھا۔

”سمرہ مجھے کھانا میرے کمرے میں دے جاؤ۔“ حالب نے سمرہ سے کہا اور فون آن کر کے اپنے کان سے لگا لیا اور سیڑھیوں کی جانب بڑھ گیا۔

✦✦✦

اگلے کئی روز گھر میں رشتے کی بات ہوتی رہی۔ اشفاق صاحب اور کنول بیگم بیٹے اور بہو کے ہمراہ جا کر سوال کر آئے تھے۔ اشفاق صاحب تو جیسے خود یہی چاہتے تھے۔

”اس سے بڑھ کر اور کیا بات ہوگی۔ ہم دونوں بھائیوں کا رشتہ اور مضبوط ہو جائے گا۔ احسن کا رشتہ تم نے کنول کی بھانجی سے کر لیا اور حالب میرا داماد بن جائے گا۔“ اشتیاق صاحب تو خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔

”ٹھیک ہے بھابھی آپ ہمیں سوچ سمجھ کر جواب دے دیجئے گا۔“ کنول بیگم نے اپنی جیٹھانی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

''یہ کیسی بات کی کنول۔ جواب کے لئے ہم نے تو ٹائم مانگا ہی نہیں۔'' اشتیاق صاحب نے مصنوعی خفگی سے کہا۔

''ارے بھئی ہاں ہے ہاں......!'' اشتیاق صاحب نے پرجوش لہجے میں کہا اور کھڑے ہو کر اشفاق صاحب کی طرف بانہیں پھیلا کر بڑھ گئے۔

''میں کل ہی عامر اور عابد کو بلواتا ہوں۔'' اشتیاق صاحب نے اشفاق صاحب کے گلے لگنے کے بعد کہا۔

''اور صبا کو بھی۔'' رفعت بیگم نے اپنی بڑی بیٹی کا نام لیا۔

''ہاں ہاں...... سب کو بلاتا ہوں۔ شادی تو بچوں کی پڑھائی مکمل ہونے کے بعد ہی ہوگی۔ تب تک ہم منگنی کی رسم ادا کر لیتے ہیں۔ کیا خیال ہے؟'' اشفاق صاحب نے ناصحانہ انداز میں کہا۔

''بالکل ٹھیک کہا آپ نے بھائی صاحب۔ حالب کا ماسٹر مکمل ہو جائے گا اور تب تک یشفین بھی اپنا گریجویشن مکمل کر لے گی۔ ہم دونوں بس یشفین کی وجہ سے یہاں بندھے بیٹھے تھے۔ دونوں بیٹے پہلے ہی اپنی اپنی جاب کے سلسلے میں دوسرے شہر ہیں اور عرفان امریکا...... کتنے سال ہو گئے عرفان کو بلاتے مگر ہم دونوں یشفین کی ذمہ داری سے سبک دوش ہو کر ہی جانا چاہتے تھے۔ صبا اپنے گھر خوشحال ہے۔ اور اب یشفین تو جا ہی اپنوں میں رہی ہے۔ اشتیاق صاحب ہمیں تو کوئی پرواہ نہیں رہی۔'' رفعت بیگم نے ہنستے ہوئے تفصیلی انداز میں کہا تو سب مسکرا دیے۔

''چلیے! بیگم صاحبہ خوش ہی ہوتی رہیں گی یا ہم سب کا منہ بھی میٹھا کروائیں گی۔'' اشتیاق صاحب نے کہا تو رفعت بیگم اپنے ماتھے پہ ہاتھ مارتی اُٹھ کھڑی ہوئیں۔

''میں بس ابھی آتی ہوں۔'' وہ کہہ کر کچن کی جانب بڑھ گئیں۔

✧✧✧

وہ سب ہنستے مسکراتے گھر لوٹے تو حالب لاؤنج میں یہاں سے وہاں چکر پہ چکر لگائے جا رہا تھا۔ بے تابی اُس کے ہر انداز سے عیاں تھی۔ حالب نے سمرہ کو کتنے ہی میسجز کیے، یہ پوچھنے کے لئے تایا اور تائی نے کیا جواب دیا ہے۔ مگر سمرہ کے اداس ایموجیز دیکھ کر حالب کے پاؤں تلے زمین ہی نکل گئی۔

''انکار کر دیا مگر کیوں؟'' حالب نے اضطرابی انداز میں دریافت کیا۔

''یہ تو ہم آپ کو گھر آ کر ہی بتائیں گے۔'' سمرہ کا ٹیکسٹ آیا۔ تب سے حالب پریشانی میں چکر پہ چکر لگائے جا رہا تھا۔

''اور اب......!'' حالب ٹھٹھک کر رُکا۔ سب کی خوشی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔ اشفاق صاحب نے آتے ہی حالب کو اپنے گلے سے لگا لیا تو کنول بیگم نے کتنے ہی نوٹ اُس پر سے صدقے کے وارے۔

''لو بھئی تم بھی ہماری طرح بامشقت عمر قید کے لئے تیار ہو جاؤ۔'' احسن نے شرارتی انداز میں کہا۔

''کیا مطلب میرے ساتھ شادی آپ کے لئے بامشقت عمر قید ہے۔'' سمیعہ نے کمر پہ ہاتھ رکھ کر خشمگیں نظروں سے اپنے شوہر نامدار کو گھورا۔

''نن...... نہیں۔ وہ میں ایسے ہی کہہ رہا تھا۔'' احسن نے ڈرنے کی اداکاری کی تو سب مسکرا دیے۔ سمرہ خوشی سے آ کر حالب کے گلے

لگ گئی۔

''مجھے تنگ کر رہی تھی۔'' حالب نے ہنستے ہوئے اُس کے سر پر ہلکی چپت لگاتے ہوئے کہا تو سمرہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

''بدتمیز، اگر صدمے سے میرا ہارٹ فیل ہو جاتا تو......'' حالب نے منہ بنا کر کہا۔

''اللہ نہ کرے۔ کیسی بدشگونی والی باتیں کر رہے ہیں۔'' سمرہ نے حالب کے سینے سے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے خفگی سے کہا۔

''سنیں۔'' سمرہ نے سرگوشیانہ انداز میں حالب کو پکارا۔

''جی سائیں۔'' حالب نے جیب سے اپنا سیل فون نکالتے ہوئے ایک نظر سمرہ پہ ڈالتے ہوئے کہا۔

''یشفین کی پکس بنا کر لائی ہوں۔ اُف اتنا شرما رہی تھی اور شرماتے ہوئے تو اور بھی غضب ڈھا رہی تھی۔ اگر آپ نے اپنی ہونے والی بیگم کی پکس دیکھنی ہے تو مجھ سے رابطہ کر سکتے ہیں۔'' سمرہ نے اپنی جانب اشارہ کرتے ہوئے گردن کو ہلاتے ہوئے کہا۔

''دِکھاؤ۔'' حالب نے اپنا سیل فون جیب میں واپس رکھتے ہوئے سمرہ سے کہا۔

''ایسے ہی......'' سمرہ نے حیرانی سے دریافت کیا۔

''اور کیسے؟'' حالب نے ناسمجھی سے اس کی جانب دیکھا۔

''آج کل تو سانس لینے پر بھی ٹیکس لگ رہا ہے اور ایسے ہی، میرا مطلب ہے مفت میں ہی اتنی قیمتی چیز کو دیکھنے کے لئے رقم ادا کیے بنا ہی کہہ رہے ہو دکھاؤ۔ میں ابھی بھابھی کے ساتھ کچن میں چائے کا انتظام کروانے جا رہی ہوں۔ آپ نے پکس دیکھنی ہے تو ٹیکس دے دیجئے گا۔'' سمرہ نے ادائے بے نیازی سے کہا اور کچن میں چلی گئی۔ بعد میں حالب نے کتنی ہی منتیں ترلے کیں۔ مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔

آخر کار طوہاً کرہاً حالب کو پورے تین ہزار دے کر سمرہ سے پکس اپنے واٹس ایپ پہ سینڈ کروانا پڑی۔ پنک اور میرون کلر کے سوٹ میں ملبوس لمبے بالوں میں ڈھیلی سی چٹیا بنا کے سرخ و سفید یشفین ہونٹوں پہ مسکراہٹ سجائے، سر جھکائے بیٹھی تھی۔ ایک تصویر میں یشفین آنکھیں اٹھائے، آنکھوں میں ڈھیروں جگنوؤں کی چمک لئے حالب کو اپنی طرف دیکھتے ہوئی محسوس ہوئی۔ حالب کھل کر مسکرا دیا۔

''تمہارے ساتھ میری زندگی بہت اچھی اور خوبصورت گزرنے والی ہے۔'' حالب نے یشفین کی تصویر کو دیکھتے ہوئے کہا اور لائٹ آف کر کے آنکھوں پہ بازو رکھ کر لیٹ گیا۔ اُسے صبح یونیورسٹی بھی تو جانا تھا۔

✦✦✦

''یار کیا کمال کی لڑکی ہے۔ بلکہ یوں کہو کہ کیا جادو ہے جو ایک بار کسی پہ چل گیا۔ سمجھو بندہ گھائل مائل سب کچھ ہی ہو گیا۔'' عمار نے حالب کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے بتایا۔

''انفارمیشن کا شکریہ۔ مگر مجھے اس کمال کی لڑکی سے ملنے کا کوئی شوق نہیں۔ نہ اپنے اوپر کسی کا جادو چلوانے کا دل ہے۔ کیوں تم نے میرے گھر والوں سے میری جوتوں سے تواضع کروانی ہے۔'' حالب نے منہ بنا کر کہا۔

''حد ہی ہو گئی۔ وہ لڑکیاں ہو کر نہیں ڈر رہیں۔ اور تم لڑکے ہو کر لڑکیوں کی مانند نہ صرف شرما رہے ہو۔ بلکہ ڈرنے کی کامیاب ترین ایکٹنگ بھی کر رہے ہو۔'' عمار نے حالب کی مردانگی کو للکارا۔

"تم کچھ بھی کہو۔ مجھے تمہاری اِن مَنہ جبیں، دِل نشین، نازنین میں ذرا بھر بھی انٹرسٹ نہیں ہے۔ تم روزانہ بلاوجہ اپنا اور میرا ٹائم اور دماغ دونوں ضائع کر رہے ہو۔" حالب نے زچ ہو کر کہا۔

"یونہی چلو۔ دیکھو تو سہی۔ کیسی کیسی لڑکیاں ہیں۔ مجھے پکا یقین ہے۔ تم نے ایک بار اس لڑکی کو دیکھ لیا تو روز ہی جانے کی ضد کیا کرو گے؟" عمار نے حالب کو ننھے بچے کی طرح پچکارا۔ جو سکول جانے پہ آمادہ ہی نہیں ہو رہا تھا۔ حالب عمار کو گھور کر رہ گیا۔

"ایک بار میرے کہنے پہ چلو۔ جسٹ دو ہزار ہی تو ہیں۔ دو ہزار روپے میں فل انٹرٹینمنٹ مل جائے گی۔ یہ کوئی مہنگا سودا تو نہیں ہے۔ بالکل سیو جگہ ہے۔ لیکن اُس لڑکی کی ٹائمنگ تین بجے تک ہوتی ہے۔ وہ بھی ایک ہفتے میں تین یا چار دن کی۔ لیکن یار وہ لڑکی واقعی میں نشہ ہے۔ نشہ...... یوں لگتا ہے ہاتھ لگایا تو موم کی گڑیاں پگھل جائیگی۔" عمار کو اس گھر کا نہ جانے کہاں سے پتہ چلا تھا۔ وہ ہفتے میں ایک بار ضرور اس گھر میں جاتا تھا۔ چاہے اس کے لئے اُسے حالب سے ادھار پیسے ہی کیوں نہ لینے پڑتے۔

اور اب وہ حالب کو ساتھ لے جانے کی ضد کر رہا تھا۔

"ساری کی ساری لڑکیاں کالج گرلز ہیں۔ لیکن جو بات شفا میں ہے۔ مت پوچھو اس میں کیسی شفا ہے......؟" عمار نے ایک آنکھ دبا کر کہا۔

"چلو میں نہیں پوچھتا، اٹھو اور چلو کلاس کا ٹائم ہو رہا ہے......" حالب نے پیپسی کا آخری گھونٹ بھرتے ہوئے کہا اور اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ دونوں ماس کمیونی کیشن میں ماسٹرز کر رہے تھے۔

"یار چھوڑ نا پیریڈ کہیں بھاگا جا رہا ہے یا ہم۔ کل پیریڈ لے لیں گے۔" عمار نے اپنے دونوں بازو بلند کر کے کسلمندی سے کہا۔

"اُٹھو" حالب نے اُس کا بازو پکڑ کر اُٹھایا تو عمار منہ بنا کر اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"اللہ تیرے جیسا دوست کسی دشمن کو بھی نہ دے۔ میں تمہیں رنگین پریوں کی باتیں سنا رہا ہوں۔ اور تم مجھے سر اظہر کے بور ترین پیریڈ میں زبردستی گھسیٹ کر لے جا رہے ہو۔" عمار نے دُہائی دی۔

"چلو۔" حالب نے اُس کی کمر پہ اپنے ہاتھوں سے زور لگا کر آگے کی جانب دھکیلتے ہوئے کہا۔

"یار بس وہ لڑکی ناں! اپنی یک نہیں بنانے دیتی۔ اگر تم اس کی تصویر دیکھ لیتے تو تم میری منتیں کرتے۔ میرے پاؤں پکڑ لیتے کہ ایک بار لے چلو۔" عمار نے گردن موڑ کر حالب سے کہا۔ عمار کے دِل اور دماغ دونوں پہ وہ لڑکی بُری طرح سوار ہو چکی تھی۔

"معاف کر دے میرے بھائی۔ تو کوئی اور بات بھی کر لے۔" حالب نے اب کے اُس کے سامنے سچ میں ہاتھ باندھ دیے۔ عمار نے خفگی سے حالب کو دیکھا اور لمبے لمبے ڈگ بھر کر کلاس روم کی جانب چل پڑا۔ حالب بھی تیزی سے بھاگ کر عمار کے برابر آیا۔ کچھ بھی تھا عمار حالب کو بے حد عزیز تھا۔ وہ اس کا کالج فرینڈ تھا۔ اور ان دونوں کی دوستی چند سالوں میں فقید المثال بن چکی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم تھا۔ کلاس روم میں داخل ہونے تک عمار کی ناراضی دم توڑ چکی تھی اور وہ دونوں پہلے کی طرح باتوں میں مصروف ہو چکے تھے۔

✦✦✦

منگنی کی تاریخ طے ہوتے ہی گھر ہنگاموں سے جاگ اُٹھا تھا۔ رشتے داروں کو بلاوے دیئے گئے۔ اور منگنی سے دو دن پہلے ڈھولک بھی رکھ لی گئی۔ تایا جان کے دونوں بیٹے بمعہ فیملی کے پہنچ چکے تھے تو صبا بھی اپنی سسرالی فیملی کے ساتھ وارد ہو چکی تھی۔ ان کے گھر کی آخری شادی تھی۔ اور یہاں سے حالب کے بعد بس سمرہ ہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا۔ منگنی کی نہیں شادی کی تاریخ رکھی گئی ہے۔ سب بہت خوش تھے۔ حالب کی خوشی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔ یشفین تیار ہو کر اتنی خوب صورت لگ رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جنت سے کوئی حور اُتر آئی ہے۔ وہ شہزادیوں کی تمکنت کے لئے حالب کے برابر آن بیٹھی۔ حالب کی نظریں بے ساختہ اُس کا طواف کر رہی تھی۔ اُس کا دِل چاہ رہا تھا۔ وہ یشفین کو لے کر کہیں دور، کہیں دور لے جائے اور اُسے اطمینان سے بیٹھ کر دیکھتا رہے۔ مگر ہائے رے، اس دِل کے ارمان......

"بھیا جی کنٹرول۔" سمرہ نے حالب کے کان میں سرگوشی کی تو حالب جھینپ گیا۔ اور سر جھٹک کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔

"عمار کی شفا بھی کیا ہوگی، یشفین کے سامنے۔" نہ جانے کیوں حالب کے دِل میں خیال آیا اور پھر اُس نے لاحول ولاقوۃ پڑھ کر خود کو ڈانٹا۔

"شفا سے یاد آیا عمار کیوں نہیں آیا" حالب کو دفعتاً اُس کی غیر موجودگی کھلی تو اُس نے اپنے کوٹ سے سیل فون نکالا اور عمار کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔

"بیٹا جی منگنی کی رسم ادا ہونے والی ہے...... اس کو اندر رکھ لو۔" اشتیاق صاحب نے شگفتگی سے حالب سے کہا۔

"تایا جی میں اپنے دوست کو فون کر رہا ہوں۔" حالب کہہ کر فون کی طرف متوجہ ہوا۔

"ہاں یار کہاں ہے؟ کیا؟ کب؟ چل ٹھیک ہے۔ میں بعد میں فون کرتا ہوں۔" حالب نے کہہ کر فون بند کیا۔ اور اُسے اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں ڈال دیا۔

منگنی کی رسم ادا کرنے کے بعد سب نے ڈھیروں پکس بنا ڈالیں۔ خوشی تھی۔ قہقہے تھے۔ سب کچھ اس چھوٹی سی رسم میں سمو گیا تھا۔ یوں یشفین کی انگلی میں حالب کے نام کی انگوٹھی سج گئی تھی۔

✦✦✦

منگنی سے اگلے دن ہی حالب سمرہ کے پیچھے پیچھے تھا اور وہ آگے آگے۔

"سمرہ کی بچی۔ یشفین کا نمبر دے دو ناں......!" حالب نے آخر کار اُسے جا ہی لیا۔

"ایسے ہی نہیں ملتا نمبر۔" سمرہ نے حالب کو انگوٹھا دِکھاتے ہوئے کہا۔

"اور کیسے ملتا ہے؟" حالب نے اُسے گھورا۔

"پیسے لگتے ہیں۔ یشفین کا نمبر مفت میں تھوڑی ملے گا۔" سمرہ نے کمر پہ ہاتھ رکھ کر گردن دائیں سے بائیں جانب گھمایا۔

"دیکھو، ہر بات میں جگا ٹیکس وصول کرنا اچھی بات نہیں ہے۔" حالب نے انگلی اُٹھا کر اُسے وارن کیا۔

"جی یہ بات آپ کو بھی پتا ہونی چاہئے۔ ہماری فیملی میں شادی سے پہلے بات چیت کرنا، ایک دوسرے کے گھر آنا جانا۔ بے شک وہ گھر سگے تایا کا ہی کیوں نہ ہو۔ اس بات کی اجازت نہیں ہے۔ اور آپ مجھے کہہ رہے ہیں، ٹیکس وصول کرنا اچھی بات نہیں ہے۔ اچھی بات تو

منگیتر کا فون نمبر مانگنا نہیں۔ اب کیا اچھی بات ہے اور کیا بری؟ اس کا فیصلہ آپ خود کرلیں۔ اور حتمی فیصلے پہ پہنچ جانے کے بعد ہی مجھ سے رابطہ کیجیے گا۔'' سمرہ نے ادائے نیازی سے کہا اور ابرو اچکانے لگی۔

''چلو ٹھیک ہے۔ میں سوچتا ہوں۔ تم تب تک میرے اور اپنے لئے مزیدار سی چائے بنا کر میرے کمرے میں آجاؤ۔'' حالب نے فدویانہ انداز میں کہا اور سمرہ کے اثبات میں سر ہلانے پر اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

✧✧✧

''جی تو آپ نے کوئی فیصلہ کرلیا۔ مابدولت کو ہزاروں کام ہوتے ہیں۔'' سمرہ نے چائے کی چھوٹی ٹرے ٹیبل پر رکھتے ہوئے عجلت بھرے انداز میں کہا۔

''بڑی لالچی بہن ہو۔ بھائی کی مدد کرنے کے بجائے نخرے پہ نخرے دکھاتی چلی جارہی ہو......'' حالب نے سمرہ کو گھورتے ہوئے کہا۔

''جی نہیں۔ لالچی کہہ کر آپ میرا دل توڑ رہے ہیں۔ اس خوبی کو موقع شناس کہا جاتا ہے۔ آپ کا فون نمبر لے کر بھلا ہو جائے گا اور میرا فون نمبر دے کر۔'' سمرہ نے اپنی چھوٹی سی ناک چڑھاتے ہوئے کہا۔

''او کے ٹھیک ہے۔ یہ لو ایک ہزار اور نمبر دو۔'' حالب نے اپنی پینٹ کی جیب سے والٹ نکالتے ہوئے اُس میں سے ایک ہزار کا نوٹ نکالا اور سمرہ کی جانب بڑھا دیا۔

''ایک ہزار۔'' صدمے سے سمرہ کا منہ پورے کا پورا کھل گیا۔

''مجھے پتا ہے زیادہ پیسے ہیں لیکن چلو تم میری چھوٹی بہن ہو عیش کرو۔'' حالب نے جیسے حاتم تائی کی قبر پر لات مارتے ہوئے فراخدلانہ انداز میں کہا۔

''ایکسیوزمی۔ میں آپ سے چندہ نہیں لے رہی ہوں۔ پورے پانچ ہزار کا نوٹ دیں گے تو ہی نمبر ملے گا۔'' سمرہ نے صدمے کی سی کیفیت سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔

''کیا پاگل ہوگئی؟ پانچ ہزار وہ بھی ایک فون نمبر کے لیے۔ رہنے دو میری بہن۔ مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' حالب نے کہتے ہوئے اپنا والٹ بند کیا اور واپس اپنی پینٹ کی جیب میں رکھ لیا۔ سمرہ آتے ہوئے پیسے واپس جاتے ہوئے دیکھ کر سٹپٹا ہی گئی۔

''اچھا نہ آپ کی نہ میری۔ آخری آفر ہے۔ تین ہزار دے دیں۔'' سمرہ نے جلدی سے اپنی ڈیمانڈ کم کردی۔

''ابھی بھی بہت زیادہ ہیں......'' حالب لاپروائی سے کہتا ہوا اُس کے برابر آبیٹھا۔

''کیا ہے دے دیں۔ چھوٹی بہن نہیں ہوں آپ کی۔ اور جو اتنے مزے کی چائے پلائی ہے اس کا ہی لحاظ کرلیں۔'' سمرہ جذباتی بلیک میلنگ پہ اتر آئی۔

''بالکل بھی نہیں ۔ دو ہزار سے ایک روپیہ...... نہ کم نہ زیادہ۔ منظور ہے تو بولو۔'' حالب نے انگلی اُٹھا کر حتمی لہجے میں کہا۔ تو سمرہ نے یہ پیسے ہاتھ سے نہ جانے دینے میں ہی عافیت جانی۔ دو ہزار لینے کے بعد سمرہ نے حالب کو یشفین کا نمبر دے دیا۔

''چلو فٹافٹ میرے کمرے سے نکلو۔'' حالب نے یشفین کا نمبر سیو کرنے کے بعد سمرہ کو چٹکی بجا کر اپنے کمرے سے جانے کا کہا۔

''ایویں...... میں تو نہیں جا رہی۔ میں تو یہی بیٹھوں گی۔'' سمرہ نے پاؤں بیڈ کے اوپر کرتے ہوئے لاپروائی سے کہا۔

''ارے جاؤ۔ زبردستی یہ کیا؟'' حالب نے اُسے گھورا۔
''جی بالکل...... زبردستی ہے۔'' سمرہ نے ناک چڑھائی۔
''بھیا کرو ناں فون۔ دیکھتے ہیں ناں یشفین کیا کہتی ہے؟'' سمرہ تھوڑا سا آگے ہو کر آلتی پالتی مار کر بیٹھتے ہوئے پرجوش لہجے میں بولی۔
''تمہارے سامنے فون کروں؟'' حالب نے استفہامیہ لہجے میں سمرہ کی طرف دیکھتے ہوئے دریافت کیا۔
''تو آپ کو میرے سامنے فون کرنے میں کوئی مسئلہ ہے کیا؟ ابھی منگنی کو ایک دن کیا گزرا، آپ تو بدل ہی گئے ہیں۔'' سمرہ نے ناراضی بھرے لہجے میں کہتے ہوئے منہ بنا کر حالب کی جانب دیکھا۔ حالب اور سمرہ میں تین سال کا فرق تھا۔ لیکن حالب ہمہ وقت سمرہ کی سہیلی بنے اُس کی شرارت میں، ہر کام میں ساتھ دیتا۔ سمرہ کبھی حالب کا میک اپ کر رہی ہے۔ تو کبھی دونوں مل کر اپنی گڑیا کی شادی کے ملبوسات سلائی کر رہے ہیں۔ بقول سمرہ کے حالب اُس کی بہن ہے۔ بہن کی کمی حالب نے کبھی محسوس ہونے ہی نہیں دی۔
گزرتے وقت نے دونوں کی ترجیحات کو تو بدل دیا تھا مگر دونوں بہن بھائی کی محبت کو کم نو ہیں کیا تھا۔ سمیعہ بھابھی کے آجانے سے سمرہ کو بہن پلس دوست مل گئی تھی تو حالب کی جان چھوٹی تھی۔
''اب کر بھی لیں۔'' سمرہ نے خفگی بھرے لہجے میں کہا تو حالب اپنے خیالوں سے چونک گیا۔
''نہیں میں فون کر ہی نہیں رہا۔'' حالب نے سیل فون اپنے برابر بیڈ پہ رکھتے ہوئے کہا۔
''میری بات سنیں۔ آپ جو خود اکیلے میں بات کرنا چاہتے ہیں۔ مگر فکر مت کریں۔ میں نہیں ٹلنے والی۔'' سمرہ نے اب کے بیڈ پہ لیٹتے ہوئے ضدی لہجے میں کہا۔
''اوکے۔ لیکن تم بولو گی نہیں۔'' حالب جانتا تھا۔ سمرہ اُس کی جان نہیں چھوڑنے والی۔ فون کر لینے میں ہی عافیت تھی۔ ورنہ اگر سمرہ ناراض ہو جاتی۔ پارٹی الگ دینی پڑتی اور اس کی منتیں ترلے الگ کرنے پڑتے۔
''اوکے...... ڈن'' سمرہ فوراً اُٹھ بیٹھی۔
حالب نے یشفین کا نمبر ڈائل کیا۔ تین چار بیل کے بعد یشفین نے کال پک کر لی۔
''ہیلو۔'' ایئر فون سے یشفین کی مدھر آواز اُبھری۔ حالب نے فون کان سے ہٹا کر سمرہ کی جانب دیکھا۔
''بات کریں۔'' سمرہ نے اشارے سے کہا اور حالب کے کان سے فون لگا دیا۔
''میں حالب بول رہا ہوں'' حالب نے آہستگی سے کہا۔ دونوں جانب ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔ حالب کو سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا۔ وہ یشفین سے کیا بات کرے؟ اوپر سے سمرہ اشاروں پہ اشارے کیے جا رہی تھی۔
''میں فرینکلی آپ سے ایک بات کرنا چاہتی ہوں۔'' اِس سے پہلے کہ حالب کچھ بولتا۔ یشفین کی بات گونجی۔
''ہاں ضرور۔'' حالب نے جلدی سے کہا۔
''مجھے شادی سے پہلے فون پہ بات کرنا پسند نہیں ہے۔ اور نہ ہی ہماری فیملی میں اس بات کی اجازت دی جاتی ہے۔ بابا کو تو بالکل بھی یہ چیزیں پسند نہیں ہیں۔ آپ پلیز میری بات کا برا مت منانا۔'' یشفین نے شائستگی سے کہا۔

حالب کو انجانی سی خوشی کے احساس نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ یشفین واقعی ہی بہت اچھی اور عام لڑکیوں سے ہٹ کر تھی۔ وہ جیسی خود انمول تھی۔ اُس کی سوچ اس سے بھی کہیں زیادہ قیمتی تھی۔ حالب کے اندر تفاخر بھر آیا۔ اُسے اپنی خوش قسمتی پہ یقین نہیں آ رہا تھا۔ آج کے دور میں ایسی سوچ کہاں ملتی ہے؟

''اگر آپ کو میری بات کا برا لگا تو ایم سوری۔'' یشفین حالب کی خاموشی کو ناراضی سمجھ رہی تھی۔ اس کی شرمندگی بھری آواز حالب کے کانوں سے ٹکرائی۔

''نہیں نہیں...... ایسی بات نہیں ہے۔ ان فیکٹ مجھے تمہاری سوچ جان کر بے حد اچھا لگا ہے۔ مجھے تمہاری بات سن کر بہت اچھا فیل ہو رہا ہے۔ مجھے بات نہ کرنے سے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔'' حالب نے ناصحانہ انداز میں کہا۔

''تھینک یو۔'' یشفین نے کہہ کر فون بند کر دیا۔

''یہ کیا بات ہوئی۔ آپ دونوں کس قدر ان رومینٹک کپل ہو۔'' سمرہ نے منہ بسور کر کہا۔

''اچھی بات ہے ناں! باتیں کرنے سے کیا ملے گا؟ میں تو سوچ رہا ہوں۔ تمہیں یشفین سے خوب دوستی اور گپ شپ کرنی چاہئے۔ تم سے بھی دو سال چھوٹی ہے۔ مگر اُس کی سوچ کتنی اچھی اور میچور ہے۔'' حالب واقعی میں یشفین کا گرویدہ ہو گیا تھا۔

''اگر بات نہیں کرنی تھی۔ مجھ سے نمبر کیوں لیا تھا؟'' سمرہ نے آنکھیں نکالیں۔

''تمہیں جگا ٹیکس دینے کے لئے فون نمبر لیا تھا۔'' حالب کہہ کر ہنس پڑا۔

''واقعی یار بندے کی پرائیویسی ختم ہو جاتی ہے۔ ہر وقت کی ٹوں ٹوں وبالِ جان بنی رہتی ہے۔ کہاں ہو؟ کیا کر رہے ہو؟ کیوں کر رہے ہو؟ بندہ جواب ہی دیتا رہ جائے۔ تھنک گاڈ، مجھے تو پہلی کال پہ ہی عقلِ سلیم آ گئی۔'' حالب نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر کہا اور اپنے منہ پر پھیر لیے۔

''چلو بھاگو! عمار کا فون آ رہا ہے۔ مجھے اُس سے بات کرنی ہے۔ ان فیکٹ اُس کی کلاس لینی ہے۔ منگنی میں نہ آ کر اُس نے جو گناہ کیا ہے اس کا کفارہ ادا کروانا ہے۔ بھاگو۔'' حالب کے فون پہ عمار کی کال آ رہی تھی۔ طالب نے موبائل کی اسکرین کو دیکھا اور سمرہ کی ٹیل پونی کھینچتے ہوئے اُسے اپنے کمرے سے جانے کا کہا۔

''بھیا!'' سمرہ منہ بناتی بیڈ سے اتر گئی۔

''ہیلو...... یار میں تجھ سے سخت ناراض ہوں۔'' سمرہ نے اپنے عقب میں حالب کی آواز سنی اور دروازہ بند کر کے سمعیہ بھابھی کے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔

✦✦✦

''یار تم بھابھی سے بات نہیں کرتے؟'' وہ دونوں کے ایف سی میں بیٹھے تھے جب عمار نے حالب سے سوال کیا۔

''نہیں......'' حالب نے برگر کھاتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔

''کیوں؟'' عمار حیران ہوا۔

''کیوں کا کیا مطلب۔ نہیں کرتے بات تو نہیں کرتے۔ سیدھی بات ہے۔ یشفین کو شادی سے پہلے بات کرنا پسند نہیں۔ میں نے اوکے کر دیا۔''

''ہیں...... یہ بھابھی کون سے دور کی لڑکی ہیں۔ آج کے دور میں کون سی لڑکی ہے جسے اپنے منگیتر سے بات کرنا پسند نہیں۔'' عمار کو حالب کی بات پہ یقین نہیں آیا۔

''بس نہیں پسند تو نہیں پسند۔'' حالب نے

لاپروائی سے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

''تمہیں بھابھی کی بات پہ غصہ نہیں آیا؟'' عمار نے استفسار کیا۔

''غصہ کس بات کا یار۔ وہ میری فیملی ہے۔ اور مجھے اپنی فیملی کا ماحول پتا ہے۔ ہماری فیملی میں ان باتوں کو قطعی پسند نہیں کیا جاتا۔ ہاں اگر یشفین انکار نہ کرتی تو کبھی کبھار بات ہو جاتی۔ لیکن اُس نے منع کر دیا۔ مجھے اچھا لگا ہے اُسے اپنی فیملی کی روایات اچھے سے پتا ہے۔ اور میں نے بھی سوچا اس طرح کی شادیوں میں وہ مزہ نہیں رہتا جو ارینج میرج میں ہوتا ہے۔ پہلے ہی باتیں، وعدے کرلو۔ بعد میں پورے نہ کر پاؤ۔ تو آخر میں بجتی ہے لڑائی۔ اگر دیکھا جائے ہمارے معاشرے میں انڈرسٹینڈنگ کے نام پہ باتیں اور ملنا جلنا جتنا عام ہو چکا ہے۔ اتنی ہی زیادہ غلط فہمیاں بڑھ رہی ہیں۔ رشتوں میں عزت کی جگہ تو تکار نے لے لی ہے۔ سکون کی جگہ بے چینی در آئی ہے۔ مجھے تو ٹائم سے عقل آ گئی شکر ہے میری لائف میں تو سکون ہی سکون ہے۔'' حالب نے ہاتھ اٹھا کر ناصحانہ انداز میں کہا تو عمار قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

''کہہ تو تم ٹھیک رہے ہو یار۔ فکر مت کرو، تمہارے تجربے سے میں بھی مستفید ہوں گا۔ پر ہائے کیا کروں؟ میری اماں جی کو نہ جانے کب خیال آئے۔ ان کا بیٹا بڑا ہو گیا ہے۔'' عمار نے حسرت بھرے لہجے میں کہا۔ اب کے ہنسنے کی باری حالب کی تھی۔

''اچھا تم نے پریزنٹیشن تیار کرلی۔'' حالب نے ہنستے ہوئے عمار سے پوچھا۔ اب وہ دونوں یونیورسٹی میں ہونے والی اپنی پریزنٹیشن کے بارے میں باتیں کرنے لگے تھے۔

✦✦✦

چند دن بعد عمار کو پھر سے وہ لڑکی یاد آ گئی۔

''چل ناں یار تجھے شفا سے ملواتا ہوں۔'' عمار نے حالب کی منت کی۔

''مجھے تمہاری بیمار یا شفا سے ملنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔'' حالب نے قطعیت بھرے لہجے میں کہا۔

''یار میں تجھے صرف ملنے کا کہہ رہا ہوں چل ناں، میری خاطر...... میری دوستی کی خاطر۔'' عمار منہ ہاتھ دھو کر ہی نہیں بلکہ نہا دھو کر حالب کے پیچھے پڑ گیا تھا۔

''یار مجھے رتی بھر انٹرسٹ نہیں۔'' حالب نے زچ ہو کر کہا۔

''تو میں نے کب کہا ہے۔ تجھے انٹرسٹ ہے۔ تو بس ایک بار اس لڑکی سے مل تو سہی۔ یار لڑکی ہے یا حسن کا مجسمہ۔ یوں لگتا ہے جیسے کانچ کی بنی ہے۔ ہاتھ لگاتے ہی ٹوٹ جائے گی۔ میں بھی فیصلہ نہیں کر پایا۔ اُس کی غلافی آنکھیں زیادہ پیاری ہیں یا آنکھوں پہ سایہ کی ہوئی پلکیں۔ یوں لگتا ہے جیسے کسی پینٹر نے اُس کی پلکوں کی نوک بنائی ہے۔ اس کی سفید رنگت میں گھلی گلابیاں...... اُس کے تراشیدہ لب۔ میں کبھی فیصلہ نہیں کر پایا۔ اُس کا کیا چیز زیادہ خوبصورت ہے۔'' عمار نے جذب کے سے لہجے میں کہا تو حالب بے ساختہ اسے دیکھنے لگا۔

''اتنی خوبصورت ہے......'' حالب کے لبوں سے بے ساختہ نکلا۔

''بہت یار...... حسن کی دیوی ہے۔'' عمار کی آواز آئی۔

''کیا یشفین سے بھی زیادہ خوبصورت ہے؟'' حالب نے بڑبڑا کر کہا۔

''میں تمہیں ابھی یشفین کی تصویر دکھاتا ہوں۔'' حالب نے سکرین لاک آن کیا۔ مگر

گیلری تو خالی پڑی تھی۔ رات ہی حالب کے فون کا ڈیٹا ریموو ہوا تھا۔
''شٹ یار...... '' حالب نے زیر لب کہا۔
''رات ہی پورے موبائل کا ڈیٹا ریموو ہوا ہے۔'' حالب نے منہ بنا کر عمار کو بتایا۔
''چل پھر دکھا دینا، آؤ ناں، چلتے ہیں۔ بس ایک بار چلو...... پھر میں تمہیں کبھی نہیں کہوں گا'' عمار نے ضدی لہجے میں کہا آج نہ جانے کیوں وہ حالب کے پیچھے ہی پڑ گیا تھا۔
''ٹھیک ہے۔ پر ایک بار کا مطلب ایک بار ہی ہے۔ حالب نے ہاتھ اُٹھا کر کہا۔
اُسے عمار کی ضد کے آگے ہتھیار ڈالنے ہی پڑے۔
''یہ شفا کیا چیز ہے؟ دیکھنا ہی پڑے گا'' پورے یونی کی لڑکیوں کو گھاس نہ ڈالنے والا عمار اس شفا کے سامنے چاروں شانے چت پڑا ہوا تھا۔ حالب نے گہرا سانس لے کر سوچا۔ اور عمار کے ساتھ چلنے کی حامی بھرلی۔
''سچ۔'' عمار خوشی سے حالب سے لپٹ گیا۔
''چل جلدی سے آجا۔'' عمار نے بائک کو کک لگاتے ہوئے، سٹارٹ کرتے ہوئے حالب سے کہا۔ تو حالب اُس کے پیچھے بائیک پہ بیٹھ گیا۔ بائیک مین روڈ پہ خراٹے بھرتی جا رہی تھی۔
''یار مجھے کچھ ٹھیک نہیں لگ رہا۔'' حالب نے تذبذب بھرے لہجے میں عمار سے کہا۔ عمار نے بائیک سڑک کے کنارے پہ روکی تو حالب بائیک سے نیچے اتر آیا۔
''یار حالب تم اتنے ڈرپوک ہو گے۔ میں نے یہ کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ تم چھ فٹ کا لڑکا ہوتے ہوئے ڈر رہے ہو اور وہ نرم و نازک تتلیاں ہو کر نہیں ڈرتیں۔'' عمار نے منہ بنا کر کہا اور اپنے فون سے نمبر ڈائل کرنے لگا۔
''ہیلو میڈم جی کیسی ہو؟'' عمار نے فون اپنے کان سے لگائے ہوئے کہا۔
''آج شفا جی ہیں؟ میرے دوست کے ساتھ میٹنگ کروانی ہے۔ اُسے تیار رکھیں۔ ہم دس منٹ تک پہنچ رہے ہیں۔'' عمار نے بات کرنے کے بعد فون بند کر کے اپنی پاکٹ میں رکھ لیا۔
''کیا ارادہ ہے پیارے؟'' عمار نے ابرو اچکائے۔
''وہاں کا ماحول کیا ہے؟'' حالب نے سوال کیا۔
''بے حد صاف ستھرا اور پرسکون ماحول ہے۔ یہ لوگ گھر رینٹ پہ لیتے ہیں۔ جو کالج کی لڑکیاں اپنی مرضی اور خوشی سے یہ کام کرنا چاہتی ہیں۔ ان کی ممبر بنی ہوتی ہیں۔ کوئی زور زبردستی والا سسٹم نہیں ہے۔ دو ہزار فیس لیتے ہیں۔ ایک ہزار میڈم رکھ لیتی ہے۔ اور ایک ہزار لڑکی لیتی ہے۔ میڈم بھی خوش۔ لڑکی بھی خوش اور ہم بھی خوش۔'' عمار نے ہنستے ہوئے حالب کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے اسے تفصیل سے آگاہ کیا۔
''کون سے کالج اور یونیورسٹی کی لڑکیاں ہوتی ہیں؟'' حالب نے ناسمجھی سے عمار سے استفسار کیا۔
''یار یہی ہمارے ارد گرد کے کالجز اور یونیورسٹی کی لڑکیاں ہوتی ہیں۔ گھر سے کالج جانے کے بہانے نکلتی ہیں اور یہاں آجاتی ہیں۔ کالج ٹائم تک رکتی ہیں۔ پھر گھر واپس۔ ہفتے میں دن اور ٹائمنگ بدل بدل کر آتی ہیں۔ اسی لئے تو میں نے میڈم نگینہ سے شفا کے

بارے میں پوچھا۔ اگر وہ ہی نہ ہوئی تو پھر کیا فائدہ ہوگا تمہارے جانے کا اور میری منتیں کرنے کا۔" عمار نے حالب کے کندھے پہ ہاتھ مار کر کہا اور بائیک اسٹارٹ کرنے لگا۔

"یار شفا کو دیکھ کر میں اکثر سوچ میں پڑ جاتا ہوں۔" عمار نے بائک چلاتے ہوئے گردن پیچھے کی جانب موڑتے ہوئے حالب کو دیکھا۔

"تم کس سوچ میں پڑ جاتے ہو؟" کیوں؟" حالب نے حیرانی سے استفہامیہ لہجے میں پوچھتے ہوئے کہا۔

"یار، اس لڑکی کو یہ فیلڈ سوٹ نہیں کرتی۔ دیکھنے میں تو اتنی معصوم اور پاکیزہ لگتی ہے۔ مگر......" عمار نے بات اَدھوری چھوڑی اور بائیک چند منٹ بعد ایک گھر کے سامنے روک لی۔

"چلو اترو پیارے۔" عمار نے ہنس کر کہا تو حالب بائیک سے نیچے اتر آیا۔ اور ارد گرد کا جائزہ لینے لگا۔ بائیک لاک کر کے عمار حالب کی جانب مڑا۔

"چلو آؤ۔" عمار نے کہہ کر گیٹ کے پاس لگی بیل پہ انگلی رکھ دی۔ دروازہ چند لمحوں کے بعد ہی کھل گیا۔

"عمار بھائی آپ۔" وہ کوئی بارہ تیرہ سال کا لڑکا تھا۔ جو دروازے سے سر نکالے عمار کو دیکھ کر بولا۔

"اندر تو آنے دو۔ یا یہی سے واپس ہو جائیں" عمار نے اسے دروازے میں براجمان دیکھ کر طنز کیا۔

"ارے نہیں، نہیں عمار بھائی۔" وہ جلدی سے دروازے سے ہٹتے ہوئے بولا۔

چھوٹے سے صحن کو عبور کر کے وہ دونوں لکڑی کا دروازہ کھول کر اندر آ گئے۔ سامنے ہی لاؤنج تھا۔ جس کے ایک کونے میں بچھے تخت پہ بھاری بھر کم ایک عورت بیٹھی تھی۔

"آؤ......آؤ عمار صاحب۔ اس بار تو بہت دنوں کے بعد آپ نے آنے کا شرف حاصل کیا۔ ہم سے دِل بھر گیا یا کوئی اور جگہ پسند آ گئی۔" وہ عورت آنکھیں گھماتی معنی خیز ہنسی ہنسی۔ تو اُس کے پان سے رنگے دانت نظر آنے لگے۔

"مصروفیت تھی میڈم جی۔" آپ کے پاس کوئی ایک بار آ جائے۔ اُسے کسی دوسری جگہ جانے کا ہوش ہی کہاں رہتا ہے......" عمار نے ہنستے ہوئے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ اور تذبذب میں گھرے حالب کا ہاتھ تھام کر اپنے برابر بٹھالیا۔

"یہ صاحب کون ویسے؟" میڈم نگینہ نے ابرو اچکا کر حالب کے بارے میں عمار سے استفسار کیا۔

"یہ میرا دوست حالب ہے۔ آ نہیں رہا تھا۔ بڑی ضد کر کے لایا ہوں۔" عمار نے پاس بیٹھے حالب کی ٹانگ پہ ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

"چلو کوئی بات نہیں۔ اب ایک بار آ گئے ہیں تو اب ضد کر کے بھی واپس نہیں جائیں گے۔" میڈم نگینہ قہقہہ لگا کر ہنس دی۔

"کیا پئیں گے آپ ٹھنڈا یا گرم؟" میڈم نگینہ نے اب کے براہِ راست حالب کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

"نن...... نہیں، کچھ نہیں۔" حالب نے تھوک نگلتے ہوئے آہستگی سے کہا۔

"میڈم جی یہ پیسے لیں اور میرے دوست کو کمرے میں بھیجیں۔ آپ کی شفا کی اتنی تعریفیں کی ہیں۔ ناامیدی تو نہیں نہ ہوگی۔" عمار نے پیسے میڈم نگینہ کے پاس رکھتے ہوئے

دریافت کیا۔

''آپ فکر ہی مت کریں۔ آپ کبھی ناامید ہو کر یا کبھی ناخوش ہو کر گئے ہیں یہاں سے، جو ہم آپ کے دوست کو جانے دیں گے۔ شفا تیار ہے۔ اے نوری......!'' میڈم نگینہ نے وہی لاؤنج میں موجود نوری کو پکارا جو کہ لاؤنج میں پڑی چیزوں کی ڈسٹنگ کر رہی تھی۔

''جی میڈم۔'' نوری نگینہ بیگم کی آواز پہ بجلی کی سی تیزی سے بولی۔

''چل صاحب کو شفا کے کمرے میں چھوڑ کر آ......'' میڈم نے پان کا ٹکڑا اپنے منہ میں رکھتے ہوئے نوری کو حکم دیا۔

''آئیں صاحب۔'' نوری نے ڈسٹنگ کا کپڑا ایک جانب رکھتے ہوئے حالب کی جانب مسکراتے ہوئے کہا۔

''نہیں...... میں نہیں جا رہا۔ عمار چل ہم یہاں سے چلتے ہیں۔'' حالب کہتے ہوئے صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''کیا ہو گیا ہے یار؟ کچھ نہیں ہوتا۔'' عمار نے حیرانی سے اُٹھتے ہوئے حالب سے کہا۔

''میں نے کب کہا ہے کچھ ہوا ہے۔ بس مجھے اچھا نہیں لگ رہا۔ تم چلو۔'' حالب نے کہتے ہوئے عمار کو بازو سے پکڑ کر کھینچا۔

''یہ کیا بات ہوئی؟ اب آ گئے ہو تو یوں جانے کا فائدہ؟ ایک بار لڑکی دیکھ لو۔ اگر پسند نہ آئی تو پھر ہم چلتے ہیں۔'' عمار نے ناصحانہ انداز میں کہا۔

''عمار یار......'' حالب نے کچھ کہنا چاہا۔

''ارے صاحب، اتنا گھبرا کیوں رہے ہو؟ پیسے تو دے دیے ہیں۔ ایک نظر لڑکی کو دیکھ لو۔ اگر دل نہ مانا یا موڈ نہ بنا تو واپس آ جانا۔ ہمارے دھندے میں نہ لڑکی کے ساتھ کوئی زبردستی ہے اور نہ ہی کسٹمر کے ساتھ کوئی ضد کی عادت۔'' میڈم نگینہ نے پان کی پیک اگلدان میں پھینکتے ہوئے لگاوٹ بھرے لہجے میں حالب سے کہا۔

''جا نوری...... صاحب کو شفا کے کمرے میں چھوڑ کر آ۔ اب کے نگینہ بیگم نے نوری کو مخاطب کیا۔ مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق حالب کو نوری کے پیچھے سیڑھیاں چڑھنا پڑی۔ لیکن جانے سے پہلے عمار سے کہنا نہ بھولا۔

''میں بس لڑکی کو دیکھ کر آ رہا ہوں۔'' حالب نے انگلی اٹھا کر عمار سے کہا تو اُس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

سیڑھیاں عبور کر کے دائیں جانب بنے کمرے کی جانب نوری بڑھ گئی۔

''آپ جائیں شفا جی اندر ہی ہیں۔'' نوری نے رُخ موڑ کر حالب سے کہا اور دروازہ ناک کر کے کھول دیا۔ حالب نے ایک نظر نوری پہ ڈالی اور کمرے میں داخل ہو گیا۔ پیچھے سے دروازہ بند ہونے کی آواز آئی۔ حالب نے سرعت سے پلٹ کر دیکھا۔ دروازہ تب تک لاک ہو چکا تھا۔

✧✧✧

''آپ نے آتے آتے بڑی دیر کر دی۔'' وہ لڑکی رُخ موڑے کھڑی تھی۔ اُس کے آبشار جیسے سلکی بال اُس کی کمر تک آ رہے تھے۔ حالب کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ لڑکی کو کیا جواب دے۔

''آپ بولتے نہیں ہیں؟'' وہ کہہ کر استہزائیہ انداز میں ہنسی۔

''لوگ کہتے ہیں آپ کو دیکھ کر ہماری زبان کہیں کھو جاتی ہے۔ لگتا ہے آپ تو پہلے ہی شکار ہو چکے ہیں؟'' وہ لڑکی ابھی بھی رُخ موڑے

کھڑی تھی۔ اب کے وہ کھلکھلا کر ہنسی تھی۔ حالب کو یوں لگا، کتنی ہی خوبصورت اور مدھر دھنیں فضا میں گونجی تھیں۔ پہلی بار حالب کے دِل میں اس لڑکی کو دیکھنے کی چاہ شدت سے جاگی تھی۔

"کیا بات ہے؟ اگر دِل نہیں ہے تو میرا اور اپنا ٹائم کیوں ضائع کرنے آئے ہو۔" وہ لڑکی اب کے خفگی سے کہتی پلٹی تو جیسے پتھرا گئی تھی۔ ساکت ہو گئی تھی۔ حالب جو سر جھکائے کھڑا تھا۔ اُس کی خاموشی کو محسوس کر کے سر اُٹھا کر اپنے سامنے دیکھا۔ آسمان اُس کے سر پہ آن گرا تھا یا زمین اُس کے قدموں تلے سے کھسک گئی تھی۔ اسے یوں لگا جیسے پوری کی پوری چھت اُس کے سر پہ آن گری تھی۔ وہ آنکھیں پھاڑے اپنے سامنے نک سک سے تیار یشفین عرف شفا کو دیکھ رہا تھا۔ حالب کو لگا کہ وہ خواب دیکھ رہا ہے۔ وہ بار بار اپنے سامنے بت بن کے کھڑی یشفین کو زور زور سے آنکھیں کھول کر، بند کر کے دیکھ رہا تھا۔ اُسے اپنی بینائی پہ یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ بار بار اپنی آنکھیں مسل مسل کر یشفین کو دیکھ رہا تھا۔

"تم یہاں؟" کتنی ہی دیر کے بعد حیرت کے پہاڑوں کے بوجھ تلے، حالب کے منہ سے سرسراتی آواز میں نکلا۔

اُس کے مقابل کھڑی یشفین کا تو کاٹو تو لہو نہیں والا حال تھا۔ اُس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا ایک دِن وہ اِس طرح اور اِس جگہ پکڑی جائے گی۔

یشفین کو اس لمحے وقت بہت ظالم لگ رہا تھا۔ اُس کے سینے میں اٹکی سانس اس کے اندر گھٹن کو بڑھا رہی تھی۔ وہ سر تا پا پیر لرز رہی تھی۔

"واقعی تم ہو......؟" حالب آگے بڑھ آیا۔ اُس نے یشفین کے پاس آ کر اس کے چہرے پر ہاتھ رکھا۔ جیسے وہ خود کو یقین دِلا رہا تھا کہ اُس کے سامنے یشفین حقیقت میں کھڑی تھی یا اُس کی نظروں کا دھوکا تھا۔

یشفین گرنے کے سے انداز میں بیڈ پہ بیٹھ گئی۔ حالب کو سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ وہ کیا بولے؟ کیا کہے یا پھر کیا کرے؟ وہ پاس پڑی کرسی پہ بیٹھ گیا۔ اُسے یوں لگ رہا تھا اُس کی جان نکل رہی ہے۔ حالب نہیں جانتا تھا۔ اُس دن کا اختتام اس قدر بھیانک حقیقت سے اُسے روشناس کروائے گا۔ کتنی ہی دیر خاموشی کے سکے وقت کے تھال میں لمحوں کی صورت گرتے رہے۔ حالب کو تب احساس ہوا جب روتی ہوئی یشفین اُس کے قدموں میں آ بیٹھی۔ وہ اُس کے پاؤں تھامے بیٹھی تھی۔

"خبردار، اگر تم نے مجھے ہاتھ بھی لگایا۔" حالب نے نفرت آمیز لہجے میں اپنے پاؤں یشفین کے ہاتھوں کی قید سے آزاد کرواتے ہوئے دھاڑتے ہوئے کہا۔

"ایسے مت کرو حالب...... پلیز مجھے معاف کر دو۔ پلیز تم یہ بات کسی کو مت بتانا، حالب۔" یشفین ملتجی لہجے میں حالب کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے بولی۔

"میرے سامنے سے دفع ہو جاؤ۔" حالب یشفین کی جانب جھک کر دھیمی آواز میں چلایا۔ اُس کا دِل چاہ رہا تھا، یشفین کو اسی وقت مار کے یہیں پھینک جائے۔

"پلیز حالب کسی کو نہیں بتانا۔ بابا تو مجھے جان سے مار دیں گے۔" ضبط کی طنابیں ٹوٹنے لگی تھیں۔ حالب نے پوری قوت سے یشفین کو تھپڑ دے مارا۔ یشفین اُلٹ کر اوندھے منہ زمین پر گری تھی۔

"تم واقعی اس قابل ہو کہ تمہیں جان سے مار دینا چاہیے۔" حالب نے غرا کر کہا اور یشفین

کا بازو دبوچا اور اُسے اپنے مقابل لا کھڑا کیا۔

"کیوں کیا تم نے یہ سب؟ تمہارے پاس کس چیز کی کمی تھی۔ پیسے کی کمی تھی۔ نہ ہی عزت کی۔ اس کے باوجود تم یہ کام...... بتاؤ مجھے یشفین ورنہ، میں تمہیں یہیں مار کر جاؤں گا۔ تمہارے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا۔" حالب نے غصے سے پاگل ہوتے ہوئے یشفین سے استفسار کیا۔ اُس کے ہاتھوں کی گرفت یشفین کے بازو پہ اتنی زیادہ تھی کہ وہ تڑپ کر رہ گئی۔

"بولو۔" حالب نے روتی ہوئی یشفین کو زور سے جھٹکا دیا۔

"ایسے ہی، بس ایسے ہی۔ مجھے یہ کام اچھا لگتا تھا۔" یشفین نے سسکیوں کے درمیان بامشکل بولتے ہوئے کہا۔ اسے لگا تھا اگر وہ نہ بولی، حالب سچ مچ اُس کا گلا دبا دے گا۔

"اچھا لگتا ہے۔" حالب زیرِ لب بڑبڑایا۔

"تمہیں کسی بھی چیز کا خیال نہیں۔ نہ خاندان کا، نہ اُس کی عزت کا، نہ معاشرے کا اور نہ ہی خود کا اور نہ میرا۔ تمہارے اس خوب صورت چہرے کے پیچھے اتنا بھیانک چہرہ چھپا ہے یہ تو ہم میں سے کوئی سوچ ہی نہیں سکتا۔" حالب کے لہجے میں یاسیت در آئی۔ اُس کی براؤن کانچ سی آنکھوں میں اپنی محبت اور منگیتر کی اصلیت ٹوٹے کانچ کی انی کی طرح چبھن دے رہی تھی۔

"پلیز حالت مجھے معاف کر دو۔" یشفین نے حالب کے سامنے ہاتھ باندھتے ہوئے کہا۔ حالب سرعت سے دروازے کی جانب بڑھا۔

"دروازہ کھلواؤ۔" حالب نے غصے سے لاکڈ دروازے کو ٹھوکر ماری اور پلٹ کر چلایا۔

"حالب میری بات......" یشفین حالب کو اپنی طرف بڑھتا دیکھ کر سہم گئی۔

"مم...... میں کہتی ہوں۔" یشفین نے دو قدم پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔ اُس نے پلٹ کر سینٹرل ٹیبل سے اپنا سیل فون اٹھایا اور نہ جانے کس کو بیل دی۔ دو منٹ کے بعد ہی دروازہ کھل گیا تھا۔

"حالب میری بات......" یشفین نے ہاتھ اٹھا کر حالب کو روکنا چاہا۔ مگر وہ کمرے سے جا چکا تھا۔ یشفین روتے ہوئے وہیں زمین پہ بیٹھ گئی۔

✧✧✧

حالب نوری کو ایک جانب کرتے ہوئے آندھی طوفان کی طرح سیڑھیاں اتر کر لاؤنج میں آیا۔

"تمہیں کیا ہوا ہے؟" عمار جو صوفے پہ ٹانگیں پھیلائے بیٹھا تھا۔ حالب کو غصے بھرے انداز میں آتے دیکھ کر سیدھا ہو کر بیٹھا۔ اُس سے پہلے کہ وہ حالب سے کچھ پوچھتا۔ حالب کچھ بھی کہے بنا لاؤنج سے نکل کر گیٹ پار کر گیا۔

عمار اُسے آوازیں دیتا رہ گیا۔ مگر حالب تو کب کا وہاں سے جا چکا تھا۔ غصہ، دکھ، شرمندگی نجانے کیا کیا تھا جس نے حالب کے دل و دماغ کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ حالب ماؤف ذہن اور بکھرے حواس کے ساتھ نہ جانے کتنی دیر تک چلتا رہا۔ اتنا کہ وہ تھک کر سڑک کے کنارے بیٹھ گیا۔

"یشفین ایسے کر سکتی ہے۔" اُسے ابھی تک یقین نہیں ہو رہا تھا۔ حالب کو لگ رہا تھا۔ وہ ایک بھیانک خواب تھا۔ جو اُس نے کھلی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ عمار فون پہ فون کئے جا رہا تھا۔ اس پہ مستزاد یشفین کے ڈھیروں معافی طلب کے میسجز۔ حالب نے اپنا سیل فون ہی بند کر دیا۔ اُس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ خود کو مار دے۔ وہ خود

پہ غصہ تھا۔ وہ کیوں اس گھر میں گیا تھا۔ حالب اپنا سر دونوں ہاتھوں میں پکڑے بیٹھا تھا۔ کتنی ہی دیر سڑکوں کی خاک چھاننے کے بعد گھر آیا تھا۔ وہ خاموشی سے دروازہ کھول کر گھر میں داخل ہوا تھا وہ اس وقت کسی کا بھی سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مگر جو ہم چاہیں وہی ہو، ویسا تھوڑی ہوتا ہے۔

حالب سرعت سے لاؤنج عبور کر کے سیڑھیوں کی جانب بڑھا ہی تھا۔ جب اُس کے عقب میں سمیعہ کی آواز آئی۔

''حالب تم کہاں تھے؟ کب سے خالہ تمہیں کال پہ کال کیے جا رہی ہیں۔ مگر تمہارا فون مسلسل آف جا رہا۔ سب اتنا پریشان ہو رہے ہیں۔ مگر تمہیں تو پروا تک نہیں۔'' سمیعہ نے حالب کو ڈانٹ پلاتے ہوئے خفگی بھرے لہجے میں کہا۔

''آج کا دن ہی منحوس ہے۔'' حالب نے کڑھ کر سوچا اور پلٹ کر سمیعہ کو دیکھا جو اس سے چند قدم کے فاصلے پہ کھڑی خشمگیں نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

''بھابھی میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ میرے سر میں بہت درد ہے۔ میں سونے جا رہا ہوں۔ پلیز مجھے کوئی بھی ڈسٹرب نہ کرے۔ آپ مما اور سمرہ کو بھی کہہ دینا۔'' حالب کہہ کر دو دو سیڑھیاں پھلانگتا اوپر چلا گیا۔

''ارے سنو تو......'' سمیعہ حالب کو آوازیں ہی دیتی رہ گئی۔

''حالب بھی ناں! ہر وقت ہوا کے گھوڑے پہ سوار رہتا ہے۔ پاگل۔'' سمیعہ بڑبڑا کر سر جھٹک کر کچن کی جانب بڑھ گئی۔

✧✧✧

حالب ساری رات سگریٹ پہ سگریٹ پھونکے گیا۔ مگر بے چینی، اضطرابی تھی کہ کم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ کمرے میں یہاں سے وہاں چلتے چلتے اُس کے پاؤں شل ہونے لگے تھے۔

''کیوں یشفین نے یہ سب کیا؟'' وہ کتنی ہی بار یہ سوال خود سے کر چکا تھا۔ مگر اُس کے پاس نہ تو اس سوال کا جواب تھا اور نہ کوئی جواب دینے والا۔

حالب ٹیرس پہ چلا آیا۔ چاند کالے آسمان پہ بڑے طمطراق سے براجمان تھا۔ کالی چادر پہ ہزاروں ٹمٹماتے ستارے خوب بھلے لگ رہے تھے۔ نہ جانے کیوں حالب بے اختیار آنسوؤں سے رونے لگا۔ اتنا بڑا دھوکا، اتنی حسین شکل کے پیچھے، اتنا کریہہ روپ تھا۔ کس چیز کی کمی تھی؟ کیوں یشفین نے یہ سب کیا؟ وہ ٹیرس سے ٹیک لگا کر اپنے گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹے بیٹھا پھوٹ پھوٹ کے رو رہا تھا۔ چاند بھی سر نیہوڑے حالب کو روتے دیکھ کر اداس ہو گیا تھا۔ پوری رات آنسو حالب کی آنکھوں کے ہم سفر رہے۔ دور آسمان پہ موجود چاند ساری رات حالب کا غم گسار رہا تھا۔ صبح کی سپیدی نمودار ہوئی۔ ہر چیز پر سے رات کی سیاہی کے بادل چھٹنے لگے۔ حالب نے اپنا سر اُٹھا کر اپنے گرد پھیلتی روشنی کو دیکھا۔ اُس کی آنکھیں ابھی بھی لبالب آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ درد تھا، دکھ تھا، اذیت تھی کہ پھر بھی حالب کے وجود کو جکڑے بیٹھی تھی۔ حالب بامشکل اُٹھ کر کھڑا ہوا اور بیڈ پہ گرنے کے سے انداز میں لیٹ گیا۔ اگلا پورا دن وہ سر منہ لپیٹے لیٹا رہا۔ وہ ناراض تھا۔ یشفین سے، خود سے، عمار سے۔ سمرہ کتنی ہی بار حالب کے کمرے کے چکر لگا چکی تھی۔

''حالب میرے بچے کیا ہوا ہے؟ کیوں

اس طرح لیٹے ہوئے؟" کنول بیگم نے حالب کے گھنے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے محبت بھرے لہجے میں استفسار کیا۔ ماں کی فکر مندی پہ حالب کو اُٹھ کر بیٹھنا ہی پڑا۔

"کچھ نہیں ہوا مما۔ بس سر میں درد ہے۔" حالب نے اپنے چہرے پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے جیسے اپنی پریشانی کو مٹایا۔

"حالب کیا ہوا ہے؟ مجھے سچ سچ بتاؤ۔" کنول بیگم نے ایش ٹرے کی جانب دیکھا۔ جو کہ سگریٹوں کے انبار سے لبالب بھری ہوئی تھی۔ حالب نے ماں کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا تو جی بھر کے شرمندہ ہوا۔

"کیا بات ہے حالب؟" کنول بیگم نے رسانیت بھرے لہجے میں دریافت کیا۔ حالب چند ثانیے ماں کو دیکھتا رہا جیسے کسی بات کا فیصلہ نہ کر پا رہا ہو۔

"کیا بات ہے حالب...... ماں کو تو بتاؤ ناں!" کنول بیگ نے حالب کے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔ تو وہ چونک کر غائب دماغی سے ان کا چہرہ دیکھنے لگا۔

"میں تمہارے بابا کو بلاتی ہوں۔ وہی تم سے پوچھیں گے...... تمہیں کیا ہوا ہے؟" کنول بیگم نے اب خفگی سے کہتے ہوئے کہا اور اُٹھ کھڑی ہوگئی۔ حالب بجلی کی تیزی سے بیڈ سے اترا اور کنول بیگم کو کندھے سے تھام کر واپس بیڈ پہ بٹھایا اور خود ان کے قدموں میں بیٹھ گیا۔

"مما مجھے......" حالب رُکا۔

"کیا؟" کنول بیگم نے اُلجھن آمیز نظروں سے حالب کو دیکھا۔

"مما مجھے یشفین سے شادی نہیں کرنی ہے۔" حالب نے سر جھکا کر کہا۔

"کیا......؟" کنول بیگم کو یقین نہ آیا۔

"مما مجھے یشفین سے شادی نہیں کرنی......" حالب نے اب کے مضبوط لہجے میں سر اُٹھا کر ماں کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"تمہارا دماغ خراب ہوگیا ہے۔ تمہارے بابا تمہاری جان نکال دیں گے۔ منگنی تماشا تھوڑی ہے۔ ہم نے تم سے باقاعدہ تمہاری مرضی پوچھ کر یہ رشتہ طے کیا تھا۔ اور اب تم......" کنول بیگم نے غصے سے اپنے گھٹنوں پہ حالب کے رکھے ہوئے ہاتھوں کو جھٹکا اور اُٹھ کر کھڑی ہوگئی۔

"آپ بس تایا کو انکار کر دیں۔ آج ہی...... ابھی...... اسی وقت۔" حالب کہہ کر رُکا نہیں۔ اپنے کمرے سے ہی نہیں گھر سے بھی نکل آیا۔ وہ جانتا تھا۔ اُس کا انکار طوفان برپا کر دے گا اور وہ طوفان کے لئے ذہنی طور پر خود کو تیار کر چکا تھا۔ پہلے تو مشتاق صاحب اور احسن نے اسے پیار سے سمجھانے کی کوشش کی۔ پھر ڈانٹ ڈپٹ کر اُسے اپنا فیصلہ بدلنے کا کہا۔ لیکن اس دن مشتاق صاحب کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔

"تمہیں اُس معصوم لڑکی سے آخر مسئلہ کیا ہے؟" مشتاق صاحب چلائے۔

"بس مجھے شادی نہیں کرنی۔" حالب نے آہستگی سے کہا۔

"میں تمہیں کبھی بھی معاف نہیں کروں گا حالب۔ وہ میرے بھائی کی بیٹی ہے۔ یعنی میری بھی بیٹی جیسی ہے۔ اگر تمہاری بہن کے ساتھ کوئی یوں کرے گا۔"

"بابا پلیز۔" حالب نے اپنی مٹھیاں بھینچی۔ وہ نہ تو کسی کو کچھ بتا سکتا تھا اور نہ ہی کچھ کہہ سکتا تھا۔

"تمہیں اس معصوم لڑکی کے ساتھ ایسی زیادتی نہیں کرنے دوں گا۔" مشتاق صاحب غصے سے چلائے۔

"معصوم۔" حالب دِل میں کراہا۔

"وہ معصوم ہم سب سے چھپ کر کیسا کھیل کھیل رہی ہے۔ آپ کو پتا چل جائے تو آپ خود انکار کردیں۔" حالب نے دِل میں سوچا۔

عجیب سی کشمکش آن گھیری تھی۔ حالب یشفین کی اصلیت سب کے سامنے عیاں کر کے اس کو سب کی نظروں سے گرانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا، تایا کو یشفین کے اس روپ کی خبر بھی ہو گئی۔ وہ اُسے اُسی وقت گولی مار دیں گے۔

سب گھر والے ایک طرف ہو گئے تھے۔ حتیٰ کہ سمیرہ نے بھی حالب سے بات چیت بند کر دی تھی۔ وہ کب گھر آتا ہے۔ کب جاتا ہے؟ کیا کرتا ہے؟ کسی کو بھی پروا نہیں تھی۔ حتیٰ کہ کنول بیگم بھی ان سے سخت ناراض تھیں۔ حالب گھر میں آتا، وہ رُخ موڑ کر اپنے کمرے میں چلی جاتیں۔

"یا اللہ! یہ تم کس آزمائش میں ڈال دیا ہے آپ نے۔" حالب بوجھل دِل کے ساتھ سوچتا۔

"کاش میں پہلے ہی انکار کر دیتا۔ کاش میں یشفین کو اس جگہ نہ دیکھتا۔ کاش یشفین ایسا نہ کرتی۔" کتنے ہی کاش حالب کے گرد گھیرا ڈالے رکھتے تھے۔

انہی دِنوں حالب نے باہر جانے کی تگ و دو شروع کر دی تھی۔

"شاید میری دوری ہی میرے اپنوں کو میرے قریب لے آئے۔" حالب دُکھی دِل سے سوچتا اور آنکھیں موند لیتا۔

✦✦✦

بہت دِنوں سے یشفین کی کال آ رہی تھی۔ وہ مسلسل اگنور کر رہا تھا۔ مگر تنگ آ کر حالب نے ایک دِن فون ریسیو کر ہی لیا۔

"حالب پلیز خدا کے لیے فون بند نہ کرنا۔" یشفین کی منت آمیز آواز حالب کے کانوں سے ٹکرائی۔

"مجھے تم سے کوئی بھی بات نہیں کرنی یشفین۔" حالب نے کرختگی سے کہا۔

"بس ایک بار مجھ سے بات کر لو۔ مجھ سے مل لو۔" یشفین نے ملتجی لہجے میں کہا۔

"مل لوں۔ مگر کیوں؟ مجھے تم سے ملنے میں ذرہ بھر بھی انٹرسٹ نہیں ہے۔" حالب نے نفرت سے کہا۔

"بس ایک بار حالب۔ میں شام کو وہیں تمہارا انتظار کروں گی۔" یشفین نے آہستگی سے کہا۔

"اپنے ٹھکانے پر" حالب تلخی سے کہہ کر ہنسا تو یشفین کتنی ہی دیر بول نہیں پائی۔

"ٹھیک ہے۔ میں شام کو وہی آ جاؤں گا۔" حالب نے سر جھٹک کر کہا اور فون بند کر دیا۔

حالب بائیک لیے کتنی ہی دیر بنا مقصد سڑکوں پر پھرتا رہا۔ شام کے چار بجے تو حالب نے بائیک کا رُخ اس گھر کے راستے کی جانب موڑ دیا۔ حالب نے بائیک ایک جانب کھڑی کر کے لاکڈ کی اور بیل پہ ہاتھ رکھ دیا۔ اُسی لڑکے نے دانت نکوستے ہوئے حالب کو دیکھا اور اندر آنے کے لیے راستہ چھوڑ دیا۔ حالب لاؤنج میں آیا تو سامنے ہی میڈم نگینہ تخت پہ بیٹھی ٹی وی پہ پنجابی گانے سننے میں مصروف تھی۔ میڈم نگینہ کی نظر حالب پہ پڑی تو اُس نے تڑپ کر لی پر چلتے گانے کی آواز کو بند کیا اور خشمگین نظروں سے حالب کو دیکھنے لگی۔

"ارے او لڑکے تم آج پھر آ گئے۔ اُس دِن

کیا ہوا تھا؟ کوئی بھوت نظر آ گیا تھا کیا؟ جو خود تو سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے ہی تھے۔ ساتھ میں میری لڑکی کو بھی ڈرا گئے تھے۔ چلو شاباش جاؤ یہاں سے...... ''میڈم نگینہ نے چٹکی بجا کر حالب سے کہا۔

''آنے دیں میڈم۔ میں نے ان کو بلایا ہے۔'' اس سے پہلے کہ حالب میڈم نگینہ کو کوئی جواب دیتا۔ یشفین نہ جانے کس کونے سے نکل کر آ گئی تھی۔

''آؤ۔'' یشفین نے حالب سے کہا اور خود سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ حالب خاموشی سے یشفین کے تعاقب میں سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ یشفین اُسے اُسی کمرے میں لے آئی تھی۔ جہاں حالب چند ماہ پہلے آیا تھا۔ حالب بے اختیار اپنے سامنے بیٹھی یشفین کو دیکھ رہا تھا۔ وہ اتنی سادہ اور معصوم لگ رہی تھی کہ کوئی بھی اُسے دیکھ کر یقین نہیں کر سکتا تھا کہ وہ اس کام میں......

''کیا دیکھ رہے ہو؟'' یشفین نے آہستگی سے اپنا جھکا ہوا سر اٹھا کر حالب سے پوچھا۔ تو حالب چونک گیا۔ چند ثانیے حالب لب بھینچے یشفین کو دیکھتا رہا اور پھر گہرا سانس لیا۔

''دیکھ رہا ہوں چہرے کیسے دھوکا دیتے ہیں؟'' حالب نے یشفین کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔

''حالب میں تم سے معافی مانگنا چاہتی ہوں۔'' یشفین نے نظریں جھکا کر اپنی مخروطی انگلیوں کو مروڑتے ہوئے کہا۔

''معافی اور مجھ سے۔ وہ بھی کس بات کی یشفین؟'' حالب نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ یشفین یکدم اُٹھ کر حالب کے قدموں میں آ بیٹھی۔

''مجھے معاف کر دو حالب میں اِن دو ماہ سے عالم نزع میں ہوں۔ شرمندہ ہوں۔ بے کل...... بے چین ہوں۔ تم بہت اچھے ہو۔ تم چاہتے تو یہ بات سب کو بتا سکتے تھے میرا یہ بھیانک روپ سب پر عیاں کر سکتے تھے۔ مگر تم نے ایسا کچھ بھی نہیں کیا تم نے مجھے میرے گھر والوں کو دنیا کے سامنے رسوا نہیں کیا۔ تمہاری یہ اچھائی میری شرمندگی کو اور بھی بڑھا گئی ہے۔ بلکہ یوں کہوں تو مجھے خود سے نفرت کرنے پر مجبور کر گئی ہے۔ مجھے گھن آنے لگی ہے۔ خود سے بھی اور اپنی سوچ پہ بھی۔'' یشفین زمین پہ بیٹھی روتے ہوئے حالب سے کہہ رہی تھی۔ آنسوؤں سے اُس کا پورا چہرہ تر بتر تھا۔ وہ ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ پشیمانی اُس کے ہر انداز سے جھلک رہی تھی۔ اپنی غلطیوں کا احساس اُسے کچوکے لگا رہا تھا۔

حالب کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ اُس نے یشفین کو اپنے دِل کی پوری رضامندی سے اپنے نام کی انگوٹھی پہنائی تھی۔ وقت اُسے عجیب سے دوراہے پہ لے آیا تھا۔ حالب کرسی سے اتر کر یشفین کے مقابل آ بیٹھا۔

''تم نے ایسا کیوں کیا یشفین؟ تمہیں کس چیز کی کمی تھی جو تم یہاں اس جگہ چلی آئیں۔ ایک بار بھی تمہیں اپنا، اپنی عزت کا، اپنے گھر والوں کا...... اپنے خاندان کی عزت کا خیال نہیں آیا۔ میں یہی جاننے تمہارے پاس آیا ہوں۔ ہمارے گھروں کے ماحول ایسے نہیں ہیں۔ معاشرے میں ہمارا اچھا مقام ہے۔ اگر بھی میری جگہ تمہیں کوئی اور یہاں دیکھ لیتا تو تم کیا کرتیں۔ تمہیں کبھی ڈر نہیں لگا۔ کبھی تایا جان سے اپنے بھائیوں کے غصے سے خوف نہیں آیا۔'' حالب کے لہجے میں تاسف در آیا تھا۔ بے بسی تھی۔

"کیسے آئی تھی تم یہاں...... کس کے ساتھ آئی تھی؟" حالب نے سوال کیا۔

"اپنی دوست کے ساتھ آئی تھی وہ لڑکیوں کو راضی کرتی ہے۔ میں جب پہلی بار اُس کے ساتھ یہاں آئی تھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا۔ یہاں یہ کام ہوتا ہے۔ میں اکثر اُس کے ساتھ یہاں آتی۔ یہاں آنے والے لوگ مجھے دیکھتے تو دس

میں چاہتا ہوں وہ تمہیں ایک بار ضرور دیکھے۔ میں اُس دن نکلنے ہی لگی تھی جب عمار کا فون آیا تھا۔ مجھے بھی عمار کے دوست سے ملنے کا تجسس تھا۔ کاش تم نہ آتے۔ کاش میں نہ رُکتی۔ کاش حالب میرا پردہ رہ جاتا۔" سرخ ناک آنسوؤں سے لبالب بھری آنکھیں۔ کپکپاتے ہونٹ۔ حالب کو یشفین اس لمحے بہت ہی قابلِ ترس لگ رہی تھی۔

"کاش یشفین تم اتنی ہی پاکیزہ ہوتی۔ جتنی تم دیکھنے میں لگتی ہو۔ ایک کالج کی دوست کی دوستی کا اثر اتنا تھا کہ تم اپنے ماں باپ کی تربیت کو بھول گئی۔ تمہیں یاد ہی نہیں رہا۔ تم تین بھائیوں کا غرور ہو۔ ان کا مان ہو۔ تمہیں ایک بار بھی میرا خیال نہیں آیا۔ میں نے دِل سے تم سے رشتہ جوڑا تھا۔ میرے دِل کے آئینے میں پہلی بار تمہارا عکس پڑا تھا۔ مجھے تو ابھی تک یقین نہیں آتا کہ تم یہ کام کرتی ہو۔ مگر میرے یقین کرنے سے یا نہ کرنے سے حقیقت کہاں بدل جائے گی۔" حالب نے کہتے ہوئے ہنکارا بھرا۔

"میرے دِل کے تار بھی تم سے جڑنے لگے تھے۔ اِسی لئے تو میں نے یہ سب چھوڑنے کا فیصلہ کیا تھا۔" یشفین نے درد بھری آواز میں کہا۔

"مجھے معاف کر دو حالب۔ چچا جان آئے تھے۔ بابا سے بہت معافی مانگ رہے تھے کہ تم یہ رشتہ نہیں کرنا چاہتے۔ سب بکھر جائے گا۔ سب دور ہو جائیں گے۔ مجھے پتا ہے۔ میری غلطی ہے۔ میرا گناہ ہے۔ پر میں یہاں پھر سے کبھی نہیں آؤں گی۔ میں گھر میں قید ہو کر رہوں گی۔ تم مجھ سے شادی سے انکار مت کرو۔" یشفین نے حالب کے قدموں پہ ہاتھ رکھا۔

حالب کرنٹ کھا کر اُٹھ کھڑا ہو گیا۔

دس ہزار دینے پر بھی راضی ہو جاتے۔ ضد کرتے۔ ماریہ نے مجھے کہا۔ مزہ ہے...... پیسہ ہے۔ اور پھر سب سے بڑی بات آپ کی اپنی مرضی ہے۔ جب چاہو آؤ اور جب چاہو چلے جاؤ۔ میں بس ایسے ہی ایڈونچر کے لئے راضی ہوئی۔ مگر بعد میں مجھے خود بھی اچھا لگنے لگا۔ اور تم سے منگنی ہونے کے بعد میں نے بہت سوچا۔ اس کام کو چھوڑنے کا۔ اُس دن...... "یشفین رُکی اور اپنے ہاتھوں کی پشت سے آنسو صاف کرنے لگی۔

"اُس دن۔" یشفین نے آنسو صاف کرنے کے بعد سر اُٹھا کر حالب کی طرف دیکھا۔ جس کے چہرے پہ کرب صاف نظر آرہا تھا۔

"اُس دن میں یہاں آخری بار آئی تھی۔ لیکن میری قسمت مجھے دغا دے گئی۔ آخری کسٹم تم نکلے۔ جس کے لئے میں نے یہ سب چھوڑنے کا فیصلہ کیا تھا۔" یشفین نے کہا اور اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ آنسو موتیوں کی لڑی کی صورت میں اُس کے گالوں سے گر کر اُس کا دامن بھگو رہے تھے۔ کتنی ہی دیر دونوں چپ بیٹھے رہے۔ لمحوں کی اس خاموشی کو یشفین نے توڑا۔

"تمہارا دوست اکثر تمہاری باتیں کیا کرتا تھا۔ مگر اُس نے کبھی تمہارا نام نہیں لیا۔ وہ مجھے اکثر کہتا، میرا دوست یہاں آنا نہیں چاہتا۔ مگر

"شادی اور تم سے؟" حالب نے حیرانی سے بڑبڑا کر کہا۔

"میرے گھر والے مجھ سے سخت ناراض ہیں۔ بابا نے مجھے عاق کردینے تک کی دھمکی دی ہے۔ لیکن میں اتنا اعلیٰ ظرف نہیں ہوں یشفین کہ تمہیں سب جانتے ہوئے اپنالوں۔ تم آج جو میرے قدموں میں بیٹھی ہوتا! تم یہاں تھیں۔"

حالب نے اپنے دل پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"میں اس یشفین سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ وہ تو سیپ میں چھپے موتی کی مانند تھی۔ اور یہ یشفین تو سرراہ پڑی کسی خوب صورت چیز کی مانند ہے۔ جسے ہر کوئی آتے جاتے پیسے دے کر دل بہلاتا ہے۔ اور واپس رکھ کر آگے بڑھ جاتا ہے۔" حالب نے رندھی ہوئی آواز میں کہا اور جانے کے لئے پلٹ گیا۔ کمرے سے نکلنے سے پہلے حالب نے رُخ موڑ کر زمین پہ بیٹھی تہی دامن لڑکی کو دیکھا۔ یشفین نے سر اُٹھایا۔

"عزت سے بڑھ کر کوئی قیمتی شے نہیں۔ یہ بڑی انمول چیز ہے۔ اِس کی قدر کرو۔ اگر خدا نے تمہارا پردہ رکھ لیا ہے۔ تم بھی اپنا پردہ رکھ لو۔ لوٹ آؤ، اِس سے پہلے کہ مزید خسارے تمہاری جھولی میں آکر گر جائیں۔ کچھ خساروں کے مداوے ممکن نہیں ہوتے۔ ابھی بھی بہت دیر نہیں ہوئی ہے۔ حالب کی آنکھوں سے دو آنسو گرے اور اُس کے دامن میں کھو گئے۔ حالب نے سرعت سے کمرے کا دروازہ کھولا اور گھر سے نکل آیا۔

یشفین پھوٹ پھوٹ کر رودی۔

"خسارہ میرے دامن میں جگہ بنا چکا ہے۔ حالب تمہیں کھونے سے بڑھ کر کیا نقصان ہوگا۔ دِل نے پہلی بار تمہارے نام پہ دھڑکنا شروع کیا تھا۔ میں نے خود اپنے ہاتھوں سے اپنے دِل کا خون کردیا۔ کچھ خسارے کے تاوان چاہ کر بھی نہیں بھرے جاسکتے۔" یشفین نے تڑپ تڑپ کر روتے ہوئے سوچا۔

اُس کے پاس کچھ نہیں بچا تھا۔ نہ عزت...... نہ محبت۔ اُس سے بڑھ کر تہی دامن کون تھا؟

✦✦✦

محبت کی مہربانی

قرۃ العین سکندر



کشف اس وقت بے افسردگی لیے کارنس میں سجی اپنی اور دلاور کی تصویر دیکھ رہی تھی۔ وہ سرخ ریشمی جوڑے میں ملبوس چہرے پر مشرقی مسکان سمیٹے دلاور کے کندھے سے کندھا ملائے پوری خوشی سے مسکرا رہی تھی۔ شادی کو دس سال کا طویل عرصہ ہو چکا تھا مگر ابھی کل کی ہی بات لگتی تھی۔ مگر اس کی تنہائی اور محرومیاں اسے آگاہی دلاتی رہتی تھیں کہ وہ کس قدر اکیلی ہو گئی ہے۔

ماضی کا کوئی دکھ اس کی آنکھ سے آنسو بن کر ڈھلکا تھا۔ اس نے اتنے برس کرب و اذیت میں تنہا گزارے تھے۔

''یہ دیکھو کشف میرا ویزا اور تقرر نامہ آ گیا ہے۔ اب ہمارے حالات بدل جائیں گے۔ خوشیاں اور آسودگیاں ہمارے گھروندے کا حصار کیے رکھیں گی۔''

دلاور بے حد جذب کی کیفیت سے دوچار کہہ رہا تھا۔ وہ بے حد اداسی سے اس کو دیکھ کر رہ گئی تھی۔ دلاور سے اس کی شادی کو ابھی سال کا عرصہ ہی مکمل ہونے والا تھا۔ اس کی اور دلاور کی خوشی کا ایک سال مکمل ہوا تھا اور پرسوں ان کی شادی کی سالگرہ تھی۔ پہلی سالگرہ پہلی خوشی پہلی چاہت کی پہلی اینٹ۔

مگر اسی خوشی کی دستک سے پہلے ہی غم نے اپنا تعارف کروا دیا تھا وہ دل گرفتگی سے دلاور کے چہرے پر بکھری ہوئی خوشی کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی بڑی بڑی جھیل جیسی آنکھوں میں خوف جیسے منجمد ہو کر رہ گیا تھا۔

احساس تنہائی، جدائی اور اذیت ناک رتجگوں کا خوف۔ بچھڑ جانے کا خوف وہ یک ٹک اس کے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔

''کیا بات ہے کشف تمہیں خوشی نہیں ہوئی ہے؟''

وہ قدرے تحیر سے اس کے چہرے پر رقم حزن وملال کے سائے دیکھ رہا تھا۔ متعجب سا اس سے سوال کر رہا تھا۔ اور وہ سر جھکا گئی تھی۔ سر جھکاتے ہی دو آنسو اس کے گالوں کو بھگو گئے تھے۔

''پگلی یہ کیا تم بجائے خدا کا شکر بجا لانے کے اداس وملول ہو رہی ہو۔ یہ تقرر نامہ نہیں ہے بلکہ ہمارے سنہرے دنوں کی شروعات ہے۔ اب کبھی مہنگائی کا عفریت اور سفید پوش کا بھرم ہمارے دلوں کو چھو کے نہیں لگائے گا۔ ہم اپنی ہر خواہش پر تمنا پوری کر لیں گے۔ آسمان کی وسعتوں کی چھو لیں گے۔ کھلی فضا میں اونچی پروان ہمارا نصیب ہوئی تم دیکھ لینا۔''

دلاور کے چہرے پر پھیلی خوشی اور اس کے لہجے میں دبا دیا جوش اس کے اندرونی جذبات کا غماز تھا۔

''میری خوشی تو صرف آپ ہیں دلاور! میں نے کب زیادہ کی تمنا کی ہے۔ میرا ہر سکھ ہر خوشی پر اطمینان آپ کی منزل بن جاتا ہے۔''

وہ گہرا سانس لے کر بولی تھی۔ دلاور نے اس کے چہرے پر بکھرے موتی اپنے ہاتھوں کی پوروں سے چن لیے تھے۔

کیا تم جانتی ہو پورے بارہ ہزار ریال کی نوکری ہے۔ کوئی مذاق نہیں ہے۔ طعام وقیام کی ذمہ داری بھی کمپنی ہو گی۔ جانتی بھی ہو کہ بارہ ہزار ریال رقم کتنی ہوتی ہے۔ پورے پاکستانی کرنسی کے دو لاکھ روپے بنتے ہیں۔ سوچو ہر ماہ کتنی رقم میں اندازہ ہو سکتی ہے۔ اور ہمارے ہر تشنہ خواب تعبیر پا جائیں گے۔''

وہ اسے دیکھ کر بھی ان دیکھا کر گیا تھا۔ ورنہ اس کے چہرے پر لکھا لفظ جدائی اور اس کے بعد اس کے جذبات کو بخوبی سمجھ لیتا۔ وہ جان لیتا کہ وہ اس کے دم قدم سے زندہ ہے۔ وہ اس کی جدائی کا طوق گلے میں ڈال کر شاید جی نہ پائے گی۔

''اماں کا خیال رکھنا''

وہ اسے مزید نجانے کیا سمجھاتا رہا تھا۔ اس کی بابت ذمہ داریوں سے آگاہی دلاتا رہا تھا۔ مگر اب اس کا دھیان کہیں اور جا ہی نہیں رہا تھا۔ اس کی ساری حسیات اس کا دماغ اس کی جدائی کے ایک نکتے پر جا کر جیسے پتھر ہو کر سن سا ہو چلا تھا۔

''اچھا یہ سب جانے دو فی الحال تو اچھی سی چائے بنا دو۔ میرا سر درد کر رہا ہے اور اب یہ بسوری ہوئی صورت گم کرو۔''

وہ اچانک ہی بے حد تلخ سا ہو گیا تھا۔ اسے ہمیشہ سے سنہرے مستقبل کی تمنا رہی تھی۔ شادی کے بعد بھی وہ مستقل اس جستجو میں لگا رہا تھا کہ کوئی اپنے سنہری موقع میسر ہو اور وہ جو محنت اپنے ملک میں کر رہا ہے۔ بیرون ملک موقع میسر ہوا اور وہ محنت کرے۔

اور اب اس کا خواب شرمندہ تعبیر ہونے جا رہا تھا۔ بالآخر انتی کاوشوں اور تمناؤں کے بعد اس کو ایک اطالوی فرم میں اس کی حسب منشا ملازمت مل گئی تھی۔ جس کی بہ ظاہر اسے کوئی توقع ہی نہ تھی۔ مگر وہ خوش تھا اور اب وہ اپنے اور اپنے خاندان کے خواب پورے کر سکتا تھا۔ دراصل اس نے کبھی بھی کشف کی آنکھوں میں جھانکنے کی زحمت بھی نہ کی تھی۔ ورنہ وہ جان لیتا کہ اس کی آنکھ میں صرف ساتھ کی طلب تھی۔

کشف اٹھ کر کچن میں آ گئی تھی۔ اب تنہائی ملتے ہی اس کی سسکیاں تیز ہو گئی تھیں۔ اس کی سسکیوں نے باقاعدہ آنسوؤں کا روپ دھار لیا تھا۔ وہ وہیں پڑے مونڈھے پر بیٹھ کر اپنی تقدیر ماتم کناں تھی۔ شاید حرص و ہوس کی ماری کوئی اور عورت ہوئی تو اس ترقی پر خوشی سے پھولی نہ سمائی۔ مگر اس کو کبھی ان چیزوں کا حرص نہیں کر رہا تھا۔ وہ مال و متاع کی رسیا نہ تھی۔ مگر جیون ساتھی کی اک نرم مگر بھرپور مکان اس کے جیسے سبب بن جایا کرتی تھی۔

دلاور اس کی عدم موجودگی کا دورانیہ زیادہ ہو جانے کی صورت میں سیدھا خود ہی کچن میں آ گیا تھا۔ وہ غیر مرئی نقطے پر نظر میں ٹکائیں جل تھل رو رہی تھی۔ دلاور نے ایک بے زاری بھری نگاہ اس پر ڈال تھی۔

''عجیب ہی ناشکری قسم کی عورت ہو، ابھی تک چائے نہیں بنائی تم نے اور یہاں آٹھ آٹھ آنسو بہانے بیٹھ گئی ہو۔''

دلاور اب غصے میں آ چکا تھا۔ اور کشف اسے اپنے دل کی حالت کا احساس دلانا چاہتی تھی مگر اسے احساس نہیں دلا پا رہی تھی۔

دلاور کے ڈانٹنے کی دیر تھی کہ وہ دھاں دھار انداز میں رونے لگ گئی تھی۔ اُس کے آنسوؤں کی شدت سے گھبرا کر وہ وہیں اس کے پاس بیٹھ گیا تھا۔

''پگلی تمہارے لئے ہی تو جا رہا ہوں۔''

وہ اب اس کو اپنے بازوؤں کے حصار میں مقید کیے دلاسے دے رہا تھا۔

''مگر میں نے تو کبھی آپ سے کوئی تقاضا ہی نہیں کیا ہے۔''

وہ روہانسی ہو رہی تھی۔

''تم سمجھتی کیوں نہیں ہو؟''

وہ زچ کر گیا تھا۔

''سمجھ تو آپ نہیں رہے ہیں کہ اب آپ کی جو تنخواہ ہے۔ وہ بالکل معقول ہے بلکہ میں تو اس میں بھی بچت کر لیتی ہوں۔''

وہ اسے ہر صورت اپنے فیصلے سے روکنے کی خواہش مند تھی۔

''دیکھو نا سمجھی نہیں کرو۔ آج ہم دو ہیں کل کو ہم دو سے نہیں ہو جائیں گے۔ ہمارے سو طرح

کے اخراجات ہوں گے۔ ضروریات زندگی بڑھ جائیں گی۔ میں یہ سب تمہارے لئے اور ہماری آئندہ نسل کے لئے بھی تو کر رہا ہوں۔"

وہ توجیہہ پیش کر رہا تھا۔

کشف کی آنسوؤں کی شدت میں کمی واقع ہو گئی تھی۔

"دیکھو ہم کب تک اس ڈربہ نما فلیٹ میں رہیں گے۔ دو کمرے اور ایک چھوٹا سا کچن، میں چاہتا ہوں کہ ہمارا وسیع و عریض بنگلہ ہو اور ہم اس میں شان سے جئیں۔ یہ بڑا سا ایک لائبریری کا حصہ وقف ہوا۔ جہاں تم بے حد سکون سے اپنے مطالعہ کا شوق پورا کر سکو۔ میں جانتا ہوں کہ یہ سب تشنہ خواہشات تمہارے اندر رہیں؟"

دلاور نجانے اب اسے کیا کچھ باور کروانے کے درپے تھا۔ مگر وہ سوچ رہی تھی کہ کاش دلاور اس کے دل کی بات جان پاتا۔ مگر اب اس نے اپنے لبوں پر جامد چپ کی چھاپ چھوڑ دی تھی۔

"میں چاہتا ہوں کہ تمہاری یہ خوبصورت کلائیاں سونے کے کنگن سے سجی ہوں۔ تم ایک ادائے بے نیاز سے ایک بے حد پرتعیش اور شاہانہ زندگی بسر کرو۔ ایک ایسی شاندار زندگی جو کسی بھی عورت کا ایک تشنہ خواب ہو سکتی ہے۔"

وہ اسے شاید لالچ اور سبز باغ دکھا رہا تھا۔ یا شاید اپنے دل کی محروم تمنا اس کے سامنے آئینے کی صورت رکھ رہا تھا۔

"کاش آپ سمجھ سکتے دلاور میں دولت کی نہیں محبت کی بھوکی ہوں۔ میں کس مخمل پر سونے کی بجائے آپ کے کندھے کی شفقت میں سونا پسند کروں گی۔ میں سونے کے کنگن کی بجائے آپ کے نام کی وہ چند کانچ کی چوڑیاں پہننے کو ترجیح دوں گی جن میں کھنک ہو اور زندگی کی رمق بھی ہو۔ جب وہ بجنے لگیں تو دل دھڑک دھڑک اٹھیں۔"

وہ نجانے کسی اور ہی رو میں بولتی چلی گئی تھی۔ دلاور نے اب کے اس سے بحث شاید لاحاصل خیال کی تھی۔ تبھی گہری سانس لے کر اس کے اردگرد سے اپنا بازوؤں کا حصار توڑتے بولا تھا۔

"اچھا یار چائے تو بنا دو۔"

بیزاری اس کے چہرے پر صاف عیاں تھی۔ اس نے ایک سال کا یہ عرصہ پورا اس طرح ہی تو گزارا تھا۔ اس کے لب سے جو نکلا اس نے من و عن ویسا کیا تھا۔ جب اس نے دن کہا تو اس نے بھی دن کہہ دیا اور جب رات کہا تو اس نے بھی آنکھ بند کر کے اسے رات کہہ دیا تھا۔ وہ اس کے ہر رنگ میں رنگتی چلی گئی تھی۔

"میں جانے کے لئے کچھ مزید باتیں تم پر واضح کر دینا چاہتا ہوں۔ یہ فلیٹ میں نے سوچا ہے بیچ دیا جائے۔ اور اس کی رقم سے میں وہاں شروع کے چند ماہ کا وقت گزر بسر کروں گا۔ جب تک کہ میں سیٹل نہیں ہو جاتا۔ اور اس کے بعد رفتہ رفتہ رقم جمع کر کے نیا گھر بنا لوں گا۔ جب میں پاکستان لوٹوں گا تو پھر نیا گھر نیا آشیانہ ہم دونوں کا بسیرا ہوگا۔ مسکن ہوگا۔"

وہ اسے جانے سے روک نہ پائی تھی۔ اسے جانا تھا۔ سو وہ چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد اس نے یہ سالوں اور ان میں بیتے ہوئے ہر دن میں سسکتے پل کو دل نے ہر ہر سیکنڈ شمار کیا تھا۔

✦✦✦

"بہو کیا بات ہے کب سے دالان کے چکر پر چکر لگا رہی ہو؟"

حمیدہ بیگم نے بہو کو جب دسویں بار دالان میں چکراتے اور مضطرب پایا تو بالآخر پوچھ ہی بیٹھی تھی۔ وہ ٹھٹک کر رک گئی تھی۔ دلاور نے منع کیا تھا کہ اس کی آمد کی بابت فی الوقت اماں کو

کچھ نہ بنایا جائے۔

مگر یہاں تو دل کی بے چینیاں عروج پر تھیں۔

"تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"

انہوں نے کچھ تفکر سے اس کی اتری ہوئی صورت دیکھی تھی، جو جاں بلب سی تھی۔

"کچھ نہیں اماں بس دل کو گھبراہٹ سی ہو رہی ہے۔"

وہ ایک دم جیسے اپنے اندر پنپنے والے جذبات کو لفظوں کا پیرہن اوڑھانے سے قاصر سی تھی۔

"میں دیکھ رہی ہوں کہ دو دن سے دلاور کا بھی فون نہیں آیا۔ ویسے فون تو اب وہ کرتا بھی بہت کم ہے۔ مگر کم از کم اس کا دو گھڑی فون پر یہ پوچھنا رقم مل گئی۔ وہی سننا بھی اب خواب سا بن گیا۔"

حمیدہ بیگم نے ٹھنڈی آہ بھرتے دیکھا تھا۔

"اماں سب خیریت ہی ہوگی۔ آپ ناحق خود کو میری طرف دیکھ کر ہلکان ہو رہی ہیں۔"

وہ اب اپنے جذبات چاہ کر بھی چھپانے میں ناکام نہیں رہ سکی تھی۔

"پگلی اتنی ماہ و سال کا ساتھ تیرا اور دلاور کا اتنا نہیں رہا۔ جتنا میرا اور تیرا رہا ہے۔ ہم ساس بہو کم اور اب ماں بیٹی کا رشتہ زیادہ نبھا رہے ہیں۔ سچ کہوں تو دلاور کی زیادہ کمانے کی حرص نے میری ممتا کی خوشی کا بھی گلا گھونٹ ڈالا تھا۔"

حمیدہ بیگم کے جھریوں بھرے چہرے پر بلا کی تکان اتر آئی تھی۔ فسردگی ان کے چہرے پر بکھری ہوئی تھی۔

صدمے تو اس کے قلب پر نزول ہو رہے تھے۔ مگر اس وقت اپنی ماں اس کے اندر کے کرب کو ملاحظہ کر رہی تھی۔

"اماں بس دعا دیا کریں، ہم نے اس عالیشان بنگلے میں رہائش اختیار کرلی۔ وہ بوسیدہ سا فلیٹ اور کہاں یہ عالیشان بنگلہ۔ آپ کو ہر ماہ معقول رقم بھیجتے ہیں۔ میری ہر ضرورت کا خیال رکھتے ہیں۔ اور پھر کیا کرتے وہ ہم۔ ہمارے لئے بھی تو وہاں ہیں۔"

وہ نہ چاہتے ہوئے بھی دلاور کی طرف داری کرنے پر مجبور تھی۔ ورنہ وہ جو رتجگوں کا سفر تن تنہا سکتے بلکتے کاٹ رہی تھی۔ اسے ہی معلوم تھا۔ جب سارا عالم میٹھی نیند کو جاتا تھا۔ وہ درد کے دھانے پر کھڑی ہوئی خود کو بے حد تنہا اور بے بس پائی تھی۔ اس کے سر پر سائیں تھا۔ مگر مسافتوں کی اڑان بھرنا دشوار ترین مرحلہ تھا۔

"تو نا سمجھ ہے میری بچی۔ ان آسائشوں کا کوئی مول نہیں ہے۔ وہ اپنا مول ان آسائشات کے بدلے لگا رہا ہے۔ کیا میری کوئی سونا پن ان چند روپوں سے بھر سکتا ہے۔"

"کیا میرے آنگن میں بچوں کی قلقاریاں سننے کا ارمان یہ سونے کے سکے بھر سکتے ہیں؟ کیا میری ممتا کی ترستی آنکھ کو یہ عالیشان منظر اپنے ہونے سے سیراب کر سکتے ہیں؟"

نہیں میرا بچہ میری خوشی ہے۔ اور تو؟ کیا میں تجھے جانتی نہیں۔ اتنے ماہ و سال میں تو نے کیا کیا نہیں کیا ہے؟ مگر پھر بھی تیرے دل کا موتی جیسے کوئی چرا لے گیا ہے نا!"

حمیدہ بیگم کی ایک ایک بات سچی تھی سو فیصد درست تھی۔ مگر وہ کیا کر سکتی تھی۔ کچھ بھی تو نہیں۔ اب اگر وہ بھی دلاور کے خلاف کھڑی بولتی تو پھر اماں کو دلاسہ کون دیتا۔

"اماں میں چاہتی ہوں آج تو اپنے ہاتھوں سے دلاور کے پسند کے پکوان بنائے یہ جملہ جو صبح سے اس کے لب پر آتے آتے واپس لوٹ جاتا تھا۔ بالآخر لب پر آ ہی گیا تھا۔

"کیا کیا۔ میرا بچہ آ رہا ہے؟"

وہ ماں تھیں۔ ممتا کی تپش ان کے لہجہ میں عود کر آئی تھی۔ اور وہ یک ٹک جامد لب لئے۔ مسکراتی نگاہوں سے اعتراف کر گئی تھی۔ پھر حمیدہ نے تیزی سے لپک جھپک کچن کا رخ کیا تھا۔ جاتے جاتے پلٹی تھیں۔

"دمن یہ کیا۔ یہ ہلکے پھلکے رنگ پہنے کھڑی ہے۔ جا جا کر نیا کوئی سوٹ پہن لے۔ بلکہ چل آ میرے ساتھ۔"

اس وقت وہ ایک ساس کم اور ماں زیادہ لگ رہی تھیں۔

وہ شرمائی لجائی ان کے ساتھ جا کھڑی ہوئی تھی۔ انہوں نے الماری کھول کر سب سے گہرا سرخ لباس کا زرق برق سا سوٹ منتخب کیا تھا۔ وہ انکار کرنا چاہتی تھی۔ مگر حمیدہ بیگم کے جوش و خروش کو دیکھ کر چپ کر گئی تھی۔

"وہ تجھے جب چھوڑ کر گیا تھا تو تو نئی نویلی دلہن ہی تھی۔ میں چاہتی ہوں کو اپنی زندگی کا سفر کا آغاز وہیں سے شروع کرے جہاں سے تشنہ چھوڑا تھا۔"

حمیدہ بیگم نے ناصحانہ انداز اپناتے ہوئے کہا تھا۔ وہ شرما کر سر جھکا گئی تھی۔

"میں دلاور کے سارے من پسند کھانے بناتی ہوں تو بس تیار ہو جا۔"

وہ کچن کی جانب جاتے جاتے بولی تھیں۔

اس نے بھی اس لباس کو زیب تن کر لیا تھا۔ کاجل بھری آنکھوں اور لپ اسٹک سے رنگے لب اس میں زندگی کا احساس اجاگر کر گئے تھے۔ وہ اس لباس میں انتظار کا دیپ لئے بے حد سنور رہی تھی۔ اس نے قد آدم آئینے میں اپنا عکس دیکھا تو دیکھتی رہ گئی تھی۔

برسوں پہلے کی دوری نے اس کے رنگ و روپ کو کملا ضرور دیا تھا۔ مگر آج اس کے اندر کی بے چینی نے اس کے چہرے پر ایک عجب سا فسوں اور نکھار بکھیر ڈالا تھا۔ وہ مسکراتے لب لئے اپنے عکس کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے اچانک گھبرا کر وال کلاک کی جانب دیکھا تھا۔ دلاور کی آمد میں بہت کم وقت باقی تھا۔ وہ اپنے بال سنوارنے لگ گئی تھی۔ وہ کوئی عام سی لڑکی تو نہ تھی۔ بے حد حسین تھی۔ کسی شاہکار کے مجسمے کی مانند، لاکھوں میں ایک، نرم خو اور ملنسار سی۔

اس کے صبر نے اس کو اتنے ماہ و سال ثابت قدم رکھا تھا۔ سرد و گرم حالات میں بھی وہ ڈٹی رہی تھی۔ اطراف میں بسنے والے اسے آگاہی دیتے تھے کہ وہ بے مثال حسن کی مالک ہے۔ وہ اب بھی چاہے تو ہر سال دلاور کے وعدے پر آس کو پاس میں ڈھلتے دیکھتی ہوئی اب بھی اس سے الگ ہو کر اپنے لئے کسی نئی جہت کو منتخب کر سکتی ہے۔

مگر عورت اور مرد میں ایک فرق ہوتا ہے۔ پتہ ہے کیا؟

عورت اپنے دل کی زمین اسی مرد کے لئے نرم کرتی ہے۔ جس کے قدموں کی دستک اس کے دل کی بنجر زمین کو زرخیزی عطا کر جاتی ہے۔ پھر خواہ وہی شخص اس کو کرب کی انتہاؤں میں تنہا کر ڈالے، یا پھر محبت کی بھنوار میں بھگو ڈالے۔ وہ چاہتی پھر اس کو ہے۔ مگر مرد اگر عورت سے دلی طور پر لمحہ بھر کے لئے بھی دوری محسوس کرے تو پھر وہ اس عورت کو دل سے ہی بے گھر کر دیا کرتا ہے۔ وہ بھی تو ایک عورت تھی۔ اس کے دل پر رقم نام دلاور کا تھا۔

دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ وہ اپنے برف بار ہاتھوں اور سن ہوتے وجود کو لئے نک سک سے تیار دروازے کی طرف لپکی تھی۔ اس سے پہلے ہی حمیدہ بیگم جا موجود ہوئی تھیں۔ دلاور

کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ ایک سات سالہ بچی کھڑی تھی۔ دلاور کا چہرہ بے حد سنجیدگی لئے تھا۔ کشف کو اس قدر تیار دیکھ کر وہ چند لمحے کے لئے مبہوت سا رہ گیا تھا۔

سانولی سلونی سی بچی اس وقت دلاور کا ہاتھ تھامے کھڑی تھی۔

حمیدہ بیگم نے دلاور کو گلے لگا کر اس کی ڈھیروں ڈھیر بلائیں لے ڈالی تھیں۔ اس کے بعد انہوں نے اچانک ٹھٹک کر بچی کی طرف دیکھا تھا۔

''یہ بچی کون ہے دلاور''

حمیدہ بیگم کو نجانے کیوں اس بچی میں بے حد مانوسیت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ بچی ہو بہو خود دلاور کا عکس تھا۔ وہی نین نقش وہی رنگ و روپ۔ وہی عکس۔ دلاور نے ایک اچٹتی ہوئی نگاہ کشف پر ڈالی تھی۔ کشف کے چہرے پر بکھرے سوالات آنکھوں میں امڈی بے یقینی اور اضطراب عیاں تھا۔

''بیٹا دادو کو سلام کرو۔ یہ فلک ہے۔ میری بیٹی۔''

دلاور نے بے حد محبت سے فلک کے گال کو چھوا تھا۔ جو نجانے اتنی سی عمر میں بے حد سنجیدہ چہرہ لئے کیوں کھڑی تھی۔ مگر باپ کا اشارہ ملتے ہی وہ آگے دو قدم بڑھی تھی۔ اور اس نے سلام کیا تھا۔

''اسلام علیکم دادو''

حمیدہ بیگم نے تذبذب کی کیفیت میں دو چار دفعہ پہلے دلاور اور پھر اس بچی کو دیکھا تھا۔ پھر انہیں لمحہ ہی لگا تھا اور انہوں نے اس بچی کو کلیجے سے بھینچ لیا تھا۔ خشک زرد آنکھوں میں بے یقینی کے دریا لئے وہ کشف ہی تھی۔ جو کھڑی تھی۔ جہاں کی تہاں۔

پھر وہ اپنے اندر اٹھتے جوار بھاٹے کے خوف سے بھاگتی سیدھی اپنے کمرے میں جا کر اندر سے بند ہو گئی تھی۔ وہ بیڈ پر اوندھے منہ لیٹے سسک رہی تھی۔ اس کا شوہر اس سے بے وفائی کا مرتکب ہو چکا تھا۔ اس بچی سے بے خبر اس نے کتنے سال اولاد کی خوشی کو ترستے گزار دیئے۔ محض ایک شخص کے انتظار میں اور آج وہ بیٹی یہاں تھی۔

حمیدہ بیگم اس کا دروازہ مسلسل بجا رہی تھی۔

''کشف میری بچی! میرے لئے تو دروازہ کھول دے۔ میری بات تو سن۔ دیکھ وہ بہت دور سے آیا ہے۔ ایسا نہ ہو وہ لوٹ جائے۔ اب کے وہ لوٹ گیا تو پھر کبھی واپس نہیں آنے والا۔''

حمیدہ بیگم کبھی پیار سے، کبھی غصے سے کبھی نرمی سے کبھی ڈانٹ کر ہر طرح سے اسے آمادہ کرنا چاہ رہی تھیں۔ مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہو رہی تھی۔

اس کی تو نگاہوں میں دس سال کا طویل عرصہ جو اس نے کرب و اذیت میں طے کیا گردش کر رہا تھا۔

پھر حمیدہ بیگم تھک ہار کر لوٹ گئی تھیں۔ اس نے جیسے چپ سیادھ لی تھی۔ رات دھیرے دھیرے سلگ رہی تھی۔ جب اچانک ایک مانوس دستک نے اس کے دل کے تار چھیڑ ڈالے تھے۔

''کشف...... میری جان درواہ کھولو۔ میری خاطر۔''

دلاور کی آواز میں درد تھا طلب تھی، آس تھی، امید تھی اتنے برسوں سے اس ایک شخص کی اطاعت میں زندگی تمام کرنے والی کشف کیونکر ممکن تھا کہ اس کی ایک پکار پر نہال ہو کر دروازہ نہ کھول دیتی۔

وہ ساکت ذہن وقلب لئے دروازے تک آئی تھی اور اس نے کنڈی کھول کر دروازہ کھول دیا تھا۔ پھر الٹے قدموں واپس جانے لگی تھی۔ جب دلاور نے اپنے مضبوط ہاتھوں میں اس کی

کلائی تھام لی تھی۔

"کیا مجرم اور سزا وار ٹھہرانے سے پہلے مجھے اپنی صفائی میں کچھ بھی کہنے کا موقع نہیں دو گی؟"

دلاور نے بے حد قطعیت سے اس کی آنکھوں میں میں براہ راست جھانکتے ہوئے پوچھا تھا۔ کشف کی نگاہوں میں امید و بیم تھی۔

"جی اب کیا کہنا باقی رہ گیا ہے۔ کیا تاویل پیش کریں گے؟"

وہ سخت لہجہ اختیار کر گئی تھی۔ جب کرچیاں ٹوٹ کر دل میں پیوست ہو جاتی تھیں تو کرب و اذیت کے کئی پل صراط عبور کرنے پڑ جاتے ہیں۔ "فلک میری بیٹی نہیں ہے، ہاں میں نے اسے بیٹی کی طرح ہی پالا ہے؟"

دلاور کا ایک جملہ ہی اسے جیسے جاں بلب ہوتے زندگی کا ایک گھونٹ دے گیا تھا۔

بے وفائی کا ایک پل بھی اس کی جان پر سوہان روح تھا۔

"دیکھو کشف اتنے سال میں نے اور تم نے ایک دوسرے پر اعتبار کیے رکھا۔ آج اس بچی کی موجودگی نے تمہارے اعتبار کی دھجیاں اڑا دیں۔ تم مجھ سے اتنی بدگمان ہو گئی کہ تم نے مجھے صفائی کا ایک موقع تک نہ دیا۔

میں اس بچی کا دل نہیں توڑ سکتا تھا اس بچی کا جسے معلوم ہی نہیں وہ کس کی بیٹی ہے۔ میں نے اسے ماں اور باپ بن کر پالا ہے۔

وہ میری کولیگ حمنیٰ کی بیٹی ہے۔ حمنیٰ کو بلڈ کینسر تھا۔ اس کا اس دنیا میں کوئی بھی نہیں تھا۔ فلک تین سال کی تھی جب حمنیٰ نے مجھے پرپوز کیا تھا۔ میں نے واشگاف لفظوں میں اسے باور کروا دیا تھا کہ میں اپنی کشف سے بے وفائی نہیں کر سکتا۔ تب اس نے مجھے بتایا کہ اسے میری ہمراہی میں اتنا اعتبار ملا ہے کہ اس بھری دنیا میں وہ فلک کو میرے سہارے چھوڑے جا رہی ہے۔ فلک کے ننھیالی رشتے دار پاکستان میں موجود ہیں۔ دراصل حمنیٰ کی لو میرج تھی۔ جس کی وجہ سے اس کا اپنے اہل خانہ سے قطع تعلقی کا سلسلہ چل نکلا تھا۔ لیکن میں نے بہت غور و خوض کیا۔ اور اس نتیجے پر پہنچا کہ اتنے سال کا ساتھ مجھے فلک سے مانوس کر گیا ہے۔ وہ مجھے اپنی بچی کی طرح مانوس اور عزیز ہے۔"

کشف کا سر جھک گیا تھا۔ اس کے مجازی خدا نے ایک نیکی کی تھی۔ اور آج اس نیکی میں اس کا ساتھ چاہا تھا۔ مگر وہ تو روٹھ بیٹھی تھی۔

ایک ذرا سی غلط فہمی نے دل میں رنجش پیدا کر دی تھی۔

"دلاور میں آپ کی اس نیکی میں آپ کا ساتھ دوں گی۔ آپ کے ہر قدم پہ آپ مجھے اپنے ساتھ پائیں گے"۔

اس نے پر یقین لہجے میں کہا تھا پھیلا کاجل کشف کو مزید خوبصورت بنا گیا تھا۔

"کٹ کھنی بلی کی طرح تم نے آتے ہی مجھ پر پنجے تیز کرنے شروع کر دیئے۔ پگلی میں نے تو اتنے برس اس ایک دن کی آس میں گزار ڈالے۔ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے واپس لوٹ آیا ہوں۔ اپنا سارا بزنس میں نے وہاں ختم کر دیا ہے۔"

وہ اب شوخ لہجے میں بول رہا تھا۔ کشف سر جھکا گئی تھی۔

اب تک اس کی کلائی دلاور کے مضبوط ہاتھ میں مقید تھی۔

پہلے تو سنجیدہ گفتگو میں اس کو احساس ہی نہ ہوا تھا۔ مگر اب اچانک احساس ہوتے ہی اس کا سر مزید شرم سے جھک گیا تھا۔

محبت کی اپنی ہی جہت ہوا کرتی ہے اور محبت کرنے والوں کو وہ مل ہی جایا کرتی ہے۔

حاصل مطالعہ

تحریم محمود

حدیث مبارکہ

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

"سات گناہوں سے بچو۔"

اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کرنا، جادو کرنا، کسی آدمی کا ناحق قتل، سود کھانا، یتیم کا مال ہڑپ کرنا، میدان جہاد سے راہ فرار اختیار کرنا، پاک دامن عورتوں پر بدکاری کی تہمت لگنا" (دوسروں کے ساتھ احسان کرنے سے انسان بری (حادثاتی) موت سے محفوظ رہتا ہے، پوشیدہ صدقہ کرنے سے اللہ تعالیٰ کا غصہ ختم ہوتا ہے اور رشتہ داروں کے حقوق ادا کرنے سے عمر میں برکت ہوتی ہے۔)

شگفتہ رحیم، فیصل آباد

عدالت کی نگاہ میں سب برابر ہیں

امام ابو یوسف عباسی سلطنت کے پہلے دور کے مشہور قاضی القضاہ (چیف جسٹس) ہوئے ہیں، ایک دفعہ ان کی عدالت میں ایک یہودی نے خلیفہ وقت ہارون رشید کے خلاف دعوا دائر کر دیا، ہارون رشید کو مدعا علیہ کی حیثیت سے عدالت میں حاضر ہونا پڑا، یہودی (مدعی) بھی موجود تھا لیکن وہ ہارون سے پیچھے ہٹ کر ایک طرف کھڑا تھا، مقدمہ کی سماعت سے پہلے امام ابو یوسف نے یہودی سے فرمایا۔

"تم آگے آ کر مدعا علیہ کے برابر میں کھڑے ہو جاؤ، عدل و انصاف کی بارگاہ میں ایک کو دوسرے پر کوئی بڑائی حاصل نہیں، قانون عدل کے نزدیک سب لوگ برابر ہیں، آگے وہ ہو گا جسے اس کا حق آگے بڑھا دے۔"

اس مثالی کردار کے باوجود امام ابو یوسف کو اپنے منصب کی ذمہ داریوں کا کتنا احساس تھا اس کا اندازہ اس دعا سے فرمائیے جو انہوں نے بالکل زندگی کے آخری لمحوں میں مانگی۔

"اے خدا! تو جانتا ہے کہ میں نے کسی مقدمہ میں کبھی کسی کی امارت و وجاہت یا سفارش کو ترجیح نہیں دی، کسی سے ذاتی انتقام نہیں لیا، عدل و انصاف کو قائم کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔"

"اے میرے مالک! اگر اس پر بھی مجھ سے کوئی غلطی سرزد ہو گئی ہے تو تیری بخشش و رحمت کا امیدوار ہوں۔"

حمیرا رضا، ساہیوال

خلیل جبران کا کہنا ہے

"جب میں ایک شفاف آئینہ بن کر تمہارے سامنے کھڑا ہوا تو تم مجھ کو دیر تک غور سے دیکھتے رہے اور تمہیں مجھ میں اپنی صورت نظر آئی، پھر تم نے مجھ سے کہا کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں، لیکن درحقیقت تم نے مجھ میں اپنی ذات سے محبت کی ہے۔"

ماریہ عثمان، سرگودھا

کرنیں

☆ جب عقل کامل ہوتی ہے تو بولنا کم ہو جاتا ہے۔

(حضرت ابوبکر صدیقؓ)

☆ دعا مانگتے رہو کیونکہ ممکن اور ناممکن تو ہماری

کہ میں برے شعر کو تو گوارا کر لیتا ہوں مگر مشاعرے میں شعر پڑھتے وقت بعض شاعروں کی شکلوں کا مسخ ہونا میرے لئے ناقابل برداشت ہے، ایک نحیف و نزار بڑے نامی ''مشاعرہ اسٹار'' شاعر کے بارے میں فرماتے ہیں کہ جس جان کنی سے وہ اپنے مصرعوں کو اونچی سروں میں لاتے ہیں، ڈر لگتا ہے کہ خود بھی کسی مصرعے کے ساتھ نہ اڑ جائیں یا دفعتاً کمر سے ٹوٹ کر نہ گر پڑیں۔

زاہدہ اظہر، حافظ آباد

بولتے لفظ

☆ انسان کا اللہ سے قریب ترین رشتہ آنسوؤں کا ہے۔

☆ آنسو قرب کا ثبوت ہیں، جب روح کا روح سے وصال ہوتا ہے تو آپ کے آنسو آجاتے ہیں۔

☆ لوگ دوست کو چھوڑ دیتے ہیں، بحث کو نہیں چھوڑتے۔

☆ لوگ حکمراں بننا چاہتے ہیں، لیکن بنے ہوئے حکمرانوں کے خلاف نفرت رکھتے ہیں۔

☆ زبان وہ بات کہہ ہی نہیں سکتی جو سلوک سے بیان ہوتا ہے۔

☆ آپ کسی کے الفاظ یا گفتگو سن کر یہ بتا سکتے ہیں کہ وہ کس پیشے سے تعلق رکھتا ہے۔

☆ جب تک سچے لوگوں کی اکثریت نہیں ہوتی جمہوری فیصلے غلط ہیں۔

☆ بے بس کی آنکھ سے ٹپکنے والا آنسو کتنی ہی عبادتوں پر فوقیت لے جاتا ہے۔

فضہ بخاری، رحیم یار خان

بھول جاؤ

بھول جاؤ کہ اپنے ماضی میں کیا رکھا ہے

یہی نا! دو چار ملاقاتیں
اور کچھ اداس شامیں
چند ٹوٹی ہوئی امنگیں
فون کی چند بے ربط کالیں
اور کیا ہے اپنی ماضی میں
بھول جاؤ

ثمرہ شیرازی، پتوکی

ہم غافل نہیں

کچھ دنوں تو ہم لوگوں سے سائنس اور صنعت و حرفت وغیرہ کی باتیں سنتے رہے، لیکن ایک دن ہم سے رہا نہ گیا، ہم نے کہا کہ یہ کیا آپ لوگ سائنس اور ٹیکنالوجی وغیرہ کی رٹ لگائے ہوئے ہیں، ہمارے بزرگوں نے بھی اس میں بہت کام کیا ہے۔

ہمارے حکیم نے ایک صاحب کی بدہضمی کی فوراً تشخیص کر دی کہ تم نے تربوز بہت کھایا ہے، محض عقل اور قیافے کے زور سے اور محض یہ دیکھ کر مریض کے اردگرد تربوز کے چھلکے بکھرے تھے، اسٹرانومی یعنی علم ہئیت میں اب بے شک روس اور امریکہ وغیرہ کے حوصلے کھل گئے ہیں، کیونکہ ہم میدان میں نہیں رہے ہیں، ہماری توجہ دوسرے ضروری امور کی طرف ہے ورنہ ہمارے مدرسوں میں درس نظامیہ میں علم ہئیت بھی پڑھاتے تھے، ایک صاحب کو دلچسپی پیدا ہوئی، بولے کہ یہ علم ہئیت کیپلر اور کوپر وغیرہ والا؟ ہم نے استہزائیہ ہنسی ہنس کر کہا کہ یہ لوگ تو ابھی کل کی پیداوار ہیں، ہمارے حکماء نے ان سے صدیوں پہلے ستاروں اور سیاروں وغیرہ کا سراغ لگا لیا تھا، بلکہ ستارے دیکھے ہی نہیں یہ بھی تحقیق کیا کہ ان کا رفتار زمانہ پر اور لوگوں کی قسمتوں پر کیا اثر پڑتا ہے، اس موضوع پر ہمارے ہاں اب بھی بے شمار تصانیف از قسم جنتریاں موجود ہیں،

سوچ میں ہے، اللہ تعالیٰ کے لئے کچھ بھی ناممکن نہیں۔

(حضرت علیؓ)

☆ جس کا غصہ زیادہ ہے اس کے دوست کم ہیں۔

(حضرت داتا گنج بخشؒ)

☆ کسی کے گرنے پر خوش نہ ہونا، کل پتا نہیں تیرے ساتھ کیا ہو۔

(حضرت علیؓ)

☆ جب دولت کی خواہش چھوڑ دو گے تو دولت مند بن جاؤ گے۔

(حضرت عبدالقادر جیلانیؒ)

☆ عمر کی نصیحت کے لئے موت کافی ہے۔

(حضرت عمر فاروقؓ)

☆ تیرے سب سے بڑے دشمن تیرے برے ہم نشین ہیں۔

(غوث اعظمؒ)

ماروخ آصف، خانیوال

جنگ اور امن

کسی نے سقراط سے پوچھا۔

''جنگ کیا ہے؟ اور امن کیا ہے؟'' سقراط نے جواب دیا۔

''امن وہ زمانہ ہے جب جوان بوڑھوں کی لاشوں کو کندھوں پر اٹھا کر قبرستان میں دفن کرتے ہیں۔''

''اور جنگ وہ زمانہ ہے جب بوڑھے جوانوں کی لاشوں کو اپنے کمزور نحیف کندھوں پر اٹھا کر قبرستان پہنچاتے ہیں۔''

صائمہ ابراہیم، فیصل آباد

عقل مندی کی باتیں

☆ غم کتنا بھی سنگین ہو، نیند سے پہلے تک ہے۔

☆ تنکے کو بھی حقیر نہ سمجھو، ورنہ وہ تمہاری آنکھ میں پڑ جائے گا۔

☆ جب عذاب آنے والا ہو تو توبہ چھین جاتی ہے۔

☆ اگر انسان کو گناہ سے شرمندگی نہیں، تو توبہ سے کیا شرمندگی۔

☆ نصیحت کرنے والا مخلص نہ ہو تو، نصیحت بھی ایک پیشہ ہے۔

☆ ہر چیز کو عزت کے ساتھ رہنے دیا جائے تو اپنی عزت بھی قائم رہتی ہے

وفا عبدالرحمان، راولپنڈی

راز

زندگی کچھ نہیں
احساس محبت کے بغیر
جیسے جنگل کی ہوا
کس نے پہچانا اسے
دیکھتا کوئی نہیں ہے اس کو
چاہتا کوئی نہیں ہے اس کو
تیری قربت میں
یہی راز کھلا ہے مجھ پر
آدمی خاک ہے چاہت کے بغیر
زندگی کچھ نہیں احساس محبت کے بغیر

سدرہ نعیم، شیخوپورہ

مشاعرہ

مشاعرہ ایک تقریب ''ایک پروگرام'' ایک تماشے کی حیثیت سے مختلف سامعین کے ذوق اور توفیق کی سطح پر ہماری تہذیبی زندگی کی علامت سمجھا جاتا ہے، کوئی اس کا کم شوقین ہے، کوئی زیادہ، کوئی ٹکٹ بھر کر مشاعرہ دیکھتا اور سنتا ہے، کچھ لوگ ضبط اور بعض لوگ اصولاً مشاعرے سے کتراتے ہیں، مثلاً ہمارے ''مصری خان گجر'' حالانکہ خود شاعر ہیں، مگر مشاعرے کا نام سن کر خون ان کی رگوں میں جم جاتا ہے، کہا کرتے ہیں

بیاض

تسنیم طاہر

نورانور ---- فیصل آباد

پلک جھپکتے ہی دنیا اجاڑ دیتی ہے
وہ بستیاں جنہیں بستے زمانے لگتے ہیں
فراز ملتے ہیں غم بھی نصیب والوں کو
ہر اک کے ہاتھ کہاں یہ خزانے لگتے ہیں

....

خزاں میں چاک گریباں تھا میں بہار میں تو
مگر یہ فصل ستم آشنا کسی کی نہیں
میں آج زد پہ اگر ہوں تو خوش گمان نہ ہو
چراغ سب کے بجھیں گے ہوا کسی کی نہیں

....

کوچہ یار سے ہر فصل میں گزرے ہیں مگر
شاید اب جاں سے گزر جانے کا موسم آیا

فاریہ سلیم ---- شرقپور

تھا جنہیں زعم وہ دریا بھی مجھی میں ڈوبے
میں کہ صحرا نظر آتا تھا سمندر نکلا
شہر والوں کی محبت کا میں قائل ہوں مگر
میں نے جس ہاتھ کو چوما وہی خنجر نکلا

....

تھکا گیا ہے سفر اداسی کا
اور اب بھی ہے مرے شانے پر سر اداسی کا
میں تجھ سے کیسے کہوں یار مہرباں میرے
کہ تو علاج نہیں میری ہر اداسی کا

....

فراز اس شہر میں کس کو دکھاؤں زخم اپنے
یہاں تو ہر کوئی مجھ سا بدن پہنے ہوئے ہے

سارا حیدر ---- ساہیوال

چلو کہ آج کوئی بچپن کا کھیل کھیلیں ہم
بڑی مدت ہوئی بے ساختہ ہنس کر نہیں دیکھا

....

میرے احساس کے زخموں نے جگایا مجھ کو
نیند تو ٹوٹی مری خواب تمہارے ٹوٹے

....

مجھے سمیٹ سکو تو معجزہ ہو گا
بکھر گیا ہوں خلا میں وسعتوں کی طرح

ساجدہ احمد ---- ملتان

کوئی کرتا ہی نہیں ذکر وفا داری کا
ان دنوں عشق میں آسانی ہی آسانی ہے

....

باہر تو کوئی دشمن جاں اپنا نہیں تھا
یارو بھلا ہمیں اندر کے خدوخال نے مارا
آئے جو نظر چہرے بظاہر تھے فروزاں
افسوس انہی چہروں کے افعال نے مارا

....

مرتے رہے ہم لوگ سدا وقت کے ہاتھوں
ماضی نے ہمیں مارا کبھی حال نے مارا
کچھ نقش سلامت ہیں جو دیتے ہیں گواہی
گزری ہوئی صدیوں کو مہ و سال نے مارا

صفہ خورشید ---- لاہور

ہم فقیروں کو برائی سے سروکار نہیں
ہم زمانے میں فرشتوں کی طرح رہتے ہیں
لوگ کہتے ہیں برا ہم کو تو حیرت کیا ہے
کہنے والے تو خدا کو بھی برا کہتے ہیں

....

پیچ در پیچ سلسلے دل کے
مجھے تیری تجھے کس کی تلاش

....

سکون ملتا ہے رونے سے دل کو بھی آذر
شدید ہو کبھی موسم تو بارشیں مانگوں

عابدہ حیدر ---- بہاول نگر

گفتگو کرنے کا کچھ اس میں ہنر ایسا تھا
وہ میری بات کا مفہوم بدل دیتا تھا

....

جنون میں ہوش کے سب سلسلے بھی ساتھ رکھتا ہے
وفا کرتا ہے لیکن فاصلے بھی ساتھ رکھتا ہے
کوئی آب و ہوا تو راس آئے گی کبھی اس کو
محبت کی ساری منطقیں بھی ساتھ رکھتا ہے

....

دھیان رکھنا ہر اک آہٹ پر
محبتوں میں میری بدحواسیاں نہ گئیں

آصفہ نعیم ---- فورٹ عباس

اسے کہو بہت نامراد شے ہے جنوں
اسے کہو کہ مجھے ہے بہت جنوں اس کا

....

خواہشوں کی محرومیاں مت پوچھ میرے ہم نفس
کہ میری نس نس میں خوابوں کا زہر اترا ہے

....

ہم ہی کریں کوئی صورت انہیں بلانے کی
سنا ہے ان کو تو عادت ہے بھول جانے کی
جفا کے ذکر پہ تم کیوں سنبھل کے بیٹھ گئے
تمہاری بات نہیں بات ہے زمانے کی

فریحہ اسلم ---- میاں چنوں

پانی پہ بھی ریت پہ تڑپی چنی گئی
بنتی رہی ہے دکھ کا کبھی عنوان محبت
ہم نے پڑھے ہیں اتنے فسانے کہ بس
لگتا ہے ہر فسانے کی ہے جان محبت

....

رشتوں کو توڑنے میں ذرا احتیاط کرنا
رخ اپنا موڑنے میں ذرا احتیاط کرنا
ایسا نہ ہو کہ ایک دن پچھتاؤ ہر گھڑی
تم مجھ کو چھوڑنے میں ذرا احتیاط کرنا

....

اپنا آنچل سنبھال کر چلنا
چھیڑ خانی ہوا کی عادت ہے

مہین آفریدی ---- ایبٹ آباد

دل کو تمہاری یاد کے آنسو عزیز تھے
دنیا کا کوئی درد سمونے نہیں دیا
ناصر یوں اس کی یاد چلی ہاتھ تھام کر
میلے میں اس جہاں کو کھونے نہیں دیا

....

جو لگ چکی ہے گرہ دل میں کھل نہیں سکتی
تو لاکھ ملتا رہے ہم سے دوستوں کی طرح

....

مختصر لفظوں میں ہے اب یہ مزاج زندگی
رابطہ سب سے ہے مگر واسطہ نہیں

راحیلہ فیصل ---- سرگودھا

ہر چارہ گر کو چارہ گری سے گریز تھا
ورنہ ہمیں جو دکھ تھے بہت لادوا نہ تھے

....

وہ ریت کر کے میرے خواب کی زمینوں کو
میرے وجود میں دریا تلاش کرتا ہے
گنوا کے مجھ کو کسی حد خوش گمانی میں
وہ شاید اب کوئی مجھ سا تلاش کرتا ہے

....

تم نے گم کر دیا تھا دانستہ
اب بھرے شہر میں مجھے ڈھونڈو

آمنہ خان ---- راولپنڈی

حنا کی محفل

عین غین

سعدیہ جبار ---- ملتان

س: ع غ جی کیا کر رہے ہیں؟

ج: تم کیا کر رہی ہو۔

س: لو یہ کیا بات ہوئی الٹا ہم سے سوال؟

ج: چلو بتا ہی دیتے ہیں کیا یاد کرو گی۔

س: اب بتا بھی دیں؟

ج: مجھے بے صبرے لوگ پسند نہیں ہیں صبر سے کام لو۔

س: آپ عیدالاضحیٰ پر کیا پسند کرتے ہیں؟

ج: سب کچھ پسند ہے آپ مرضی جو بھیج دیں۔

س: ہم تو حلوہ پوریاں بنائیں گے کیسے بھیجوں مشکل ہو جائے گی۔

ج: ویسے ہی تمہاری نیت نہیں ہے بہانے نہ بناؤ۔

س: ارے نہیں ایسی کوئی بات نہیں؟

ج: میں خود آ جاؤں کھا بھی لوں گا اور مل بھی لوں گا۔

فرح عامر ---- جہلم

س: ہوں دیکھیں ع غ جی آپ تو حد سے بڑھ گئے، آپ کو انگلی پکڑائی آپ ہاتھ پکڑنے لگے۔

ج: توبہ توبہ ہوش کے ناخن لو میں بھلا تمہارا ہاتھ کیوں پکڑنے لگا میرے لئے کوئی کمی ہے۔

س: دل میں بسنے والوں سے ماہانہ کرایہ وصول کرنا ہو تو کیا کرنا چاہیے؟

ج: اسے دل کے ساتھ اپنی آنکھوں میں بھی بسا لیں۔

س: آپ کو پتہ ہے کہ آپ کے الٹے پلٹے جوابات پڑھ کر اب حنا کے قارئین کیا سوچنے پر مجبور ہو گئے ہیں؟

ج: کیا غضب کے جواب دیتا ہے یہ بندہ۔

س: چلیں آج جلدی سے اپنی فیورٹ ڈش اور مشروب کا نام بتا دیں؟

ج: پی جی ایام کی تلخی کو ہنس کے ناصر۔

س: آپس کی بات ہے، آپ وہی عین غین ہیں ناں جو تین سال پہلے......؟

ج: ہاں ہاں وہی ہوں جس نے تمہیں قرض خواہوں سے بچایا تھا۔

س: میرا دل آج کل بے حد اداس ہے، اگر میرے سوالوں کے سیدھے منہ جواب نہ دیئے تو میں......؟ آگے آپ خود سمجھدار ہیں؟

ج: پہلے یہ بتاؤ دل اداس کیوں ہے اور وہ بھی آج کل۔

رضوان علی ---- رحیم یار خان

س: وقت طوفان کب اٹھاتا ہے؟

ج: جب تم کسی گرلز کالج کے باہر کھڑے ہو اور "گرل" کا بھائی آ جائے۔

س: کیا وقت کے ساتھ چلنا ضروری ہے؟

ج: بہت ضروری ہے ورنہ۔

س: سکون کی تلاش؟

ج: اپنے اندر تلاش کرو۔

س: کیا دنیا میں صرف غم ہی غم ہیں؟

ج: کون کہتا ہے۔

س: زندگی میں سکون کب ملتا ہے؟
ج: جب بیوی میکے ہو۔
س: آپ اتنی زیادہ ذہین کیوں ہیں؟
ج: یہی بات کل امان اللہ سے بھی کہہ رہے تھے۔

فائزہ قاسم ---- سکھر

س: اب کیا ہوگا؟
ج: وہی جو ہم چاہتے ہیں۔
س: جدائی کی رات بہت طویل اور کربناک کیوں ہوتی ہے؟
ج: اکیلے میں ڈر جو لگتا ہے۔
س: وفا کی راہ میں آج میں اکیلی ہوں؟
ج: نئیں سی لانی بے قدراں نال یاری۔
س: کیا گئے ہوئے لمحات واپس آسکتے ہیں؟
ج: گیا وقت پھر کب ہاتھ آتا ہے۔
س: کبھی کبھی دل چاہتا ہے کہ ہمارے آس پاس کوئی نہ ہو؟
ج: تاکہ گزری ہوئی باتوں پر کبھی خوش کبھی رنجیدہ ہوسکیں۔
س: کچھ لوگ روٹھ کر بھی لگتے ہیں کتنے پیارے؟
ج: دل آنے کے ڈھنگ ہیں۔

فریال امین ---- ٹوبہ ٹیک سنگھ

س: آپ کو پھول اچھے لگتے ہیں یا کلیاں؟
ج: کلیاں کیوں کہ انہیں ابھی کھلنا ہوتا ہے۔
س: آپ کو بھینس کے آگے بین بجانا کیسا لگتا ہے؟
ج: مجھے تو چین کی صرف بنسری بجانی آتی ہے۔
س: سلجھی ہوئی حسینوں اور الجھی ہوئی حسینوں میں کیا فرق ہے؟
ج: جو ایک سمجھدار انسان اور ایک ناسمجھ انسان میں ہے۔
س: انسان جیتے جی کب مرتا ہے؟
ج: جب اس کی عقل کام نہ کرے۔
س: عورت زندگی میں سب سے زیادہ کس بات کی تمنا کرتی ہے؟
ج: نئے ماڈل کی کار، وسیع و عریض بنگلہ اور دولت مند شوہر۔
س: اگر میں تمہاری بند آنکھوں پر دونوں ہاتھ رکھ کر پوچھوں کہ بوجھو تو؟
ج: بوجھ لیں گے۔

نعیم امین ---- کراچی

س: ہم تمہیں ڈھونڈ رہے ہیں کئی دنوں سے؟
ج: اندھے کو اندھیرے میں بڑی دور کی سوجھی۔
س: ایک ڈال پر طوطا بیٹھا، ایک ڈال پر مینا غ جی کیا کہنا؟
ج: دونوں کو صحیح جگہوں پر رہنا چاہیے۔
س: اگر خواب صرف خواب ہی رہیں تو؟
ج: خواب تو خواب ہی ہوتے ہیں۔
س: کنوارے شادی کرنا چاہتے ہیں اور شادی شدہ اپنی جان کو روتے ہیں؟
ج: شادی بور کے لڈو ہیں جس نے کھائے وہ بھی پچھتائے جس نے نہیں کھائے وہ بھی پچھتائے۔
س: عورت اپنی عمر اور مرد اپنی آمدنی کیوں چھپاتے ہیں؟
ج: یہی چیز تو فساد کی جڑ ہے۔
س: لوگ کہتے ہیں عشق خلل ہے دماغ کا؟
ج: تبھی تو عاشقوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔

نازیہ کمال ---- حیدر آباد

س: یہ زندگی تیرے بغیر کیسے کٹ گئی؟
ج: جیسے اب تک کٹی ہے۔

☆☆☆

بلقیس بھٹی

ثبوت

تیز رفتاری کے جرم میں نثار صاحب کا چالان ہوا اور انہیں مجسٹریٹ صاحب کے سامنے پیش کیا گیا، انہوں نے صحت جرم سے انکار کرتے ہوئے کہا۔

"جناب عالی! میں تو صرف بیس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے جا رہا تھا۔"

"کیا ثبوت ہے اس بات کا؟" مجسٹریٹ نے دریافت کیا؟

"جناب والا! ثبوت کے طور پر صرف اتنا جان لینا کافی ہے کہ میں اس وقت اپنے سسرال جا رہا تھا۔"

ام خدیجہ، شاہدرہ لاہور

غلط فہمی

ایک حسین و جمیل عورت اپنے ڈاکٹر کے پاس گئی، اس کی ایک آنکھ سوجی ہوئی تھی اور سر بھی بڑا سا گومڑا تھا، ڈاکٹر نے مرہم پٹی کے دوران چوٹوں کا سبب معلوم کیا تو خاتون نے جواب دیا۔

"یہ میرے شوہر کی عنایت ہے۔"

ڈاکٹر نے کہا۔

"مگر میں نے تو سنا تھا کہ آپ کے شوہر تو شہر سے باہر گئے ہوئے ہیں؟"

خاتون نے آہ بھر کر جواب دیا۔

"جی، میں بھی اسی غلط فہمی کا شکار تھی۔"

ثمینہ رفیق، کورنگی کراچی

مسٹر کافی

اک یار سے میں نے کہا دو لفظ ہی لکھ دو
چلتی ہے سفارش یہاں اور تم ہو صحافی
کہنے لگے کافی کی پیالی کو اٹھا کر
بس نام بتا دینا مرا نام ہے کافی

ثناء حیدر، سرگودھا

جوتے

اس بات پر ہم کو تو تعجب نہیں مطلق
کھائے ہیں جو بغداد میں مردود نے جوتے
تاریخ کے صفحات پہ دیتے ہی گواہی
کھائے ہیں ہر اک دور میں نمرود نے جوتے

رمشہ ظفر، بہاول پور

دیکھ بھال

بھنوا کے پہلے کھائیں کلیجی کی بوٹیاں
معشوق نے ڈکار لی پھر دیکھ بھال کے
اس میں قصور عاشق مرحوم کا بھی تھا
کاغذ پہ رکھ دیا تھا کلیجہ نکال کے

درثمن، میاں چنوں

اعتراف گناہ

تین خواتین گپ شپ کر رہی تھیں کہ سنجیدہ موضوعات بھی زیر بحث آ گئے، ایک خاتون بولیں۔

"آج کل زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں، موت بالکل اچانک بھی آ سکتی ہے، ہمیں کم از کم ایک دوسرے کے سامنے اپنی سب سے بڑی برائی یا گناہ کا اعتراف کر لینا چاہیے، ابتدا میں ہی کرتی

رابعہ ارشد، فیصل آباد

پھکی اور بٹ صاحب

بٹ صاحب شادی پہ گئے، کھانا زیادہ کھا لیا، حالت بری ہوگئی، باہر سڑک پر لیٹ گئے، یار دوستوں نے کہا۔

"آئیں صاحب آپ کو گھر چھوڑ آئیں۔"

بٹ صاحب کراہتے ہوئے۔

"مجھ سے چلا نہیں جاتا" یار اصرار کرنے لگا۔

"نہیں بٹ صاحب چلیے آپ کو پھکی کھلاتے ہیں، آپ کی طبیعت سنبھل جائے گی۔"

بٹ صاحب کراہتے ہوئے۔

"اگر پھکی کی گنجائش ہوتی تو دو بوٹیاں اور نہ کھا لیتا۔"

جویریہ ناصر، گلبرگ لاہور

تجربہ کار

تعلیم بالغاں کے دوران استاد نے سوال کیا۔

"پرسکون اور آرام دہ زندگی گزارنے کے لئے شوہر کے پاس کس چیز کا ہونا ضروری ہے۔"

"بہرا پن۔" ایک پچاس سالہ شخص نے تلخ لہجے میں جواب دیا۔

مسرت مصباح، لاڑکانہ

غم

سردار شراب پیتے ہوئے بیوی سے۔

"تم کون ہو؟"

بیوی بولی۔

"پاگل ہو گئے ہو کیا، اپنی بیوی کو نہیں پہچانتے۔"

سردار بولا۔

"نشہ ہر غم بھلا دیتا ہے باجی۔"

ام ایمن، گوجرانوالہ

ہر جگہ

مکینک کے انٹرویو ہو رہے تھے، ایک سردار جی جب آئے تو ان سے پوچھا گیا۔

"پہلے یہ بتائیں کہ بجلی کی موٹر کیسے چلتی ہے۔" سردار جی نے مسکرا کر کہا۔

"بہت آسان سوال ہے بجلی کی موٹر تو ہر جگہ ایسے ہی چلتی ہے گڑ...... گڑ...... گڑ۔"

عابدہ سعید، گجرات

خوبی

ایک بڑے مجمع میں ایک کار کی نیلامی ہو رہی تھی بیس لاکھ، پچیس لاکھ، تیس لاکھ، مجمع میں ایک شخص کھڑا بڑی حیرت سے کار کی حالت زار پر غور کر رہا تھا، مگر اسے کار میں کوئی بھی شے بہتر نظر نہ آئی، اس سے رہا نہ گیا تو قریب کھڑے بولی لگانے والے شخص کا ہاتھ دباتے ہوئے پوچھا۔

"ارے بھائی اس کھٹارا کار میں ایسی کون سی خوبی ہے جس کی بنا پر تم اس کے اتنے دام لگا رہے ہو؟"

ایک شخص نے پلٹ کر غور سے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔

"جناب اس کار کے اب تک آٹھ حادثے ہو چکے ہیں اور حیرت کی بات ہے کہ ہر حادثہ میں صرف ایک صرف خاتون خانہ کا ہی انتقال ہوا ہے۔"

☆☆☆